FARSI KEE DILKUSH DASTANEY
BY
DR.NOOR HASAN ANSARI

فارسی کی دِلکش داستانیں



از:

ڈاکٹر زہرا خانلری (کیا)

ترجمہ:

ڈاکٹر نور الحسن انصاری

پہلوی شہنشاہیت کے پچاس سالہ
جشن کی یاد میں

یہ کتاب

بنیاد فرہنگ ایران

کے تعاون سے شائع کی گئی

دہلی

پہلا اڈیشن : اگست ۱۹۷۵ء

دوسرا اڈیشن { بہمن ۲۵۳۵ شاہنشاہی
جنوری ۱۹۷۷ء

Printed by R.N. Sachdev at Allied Publishers Private Ltd,
Printing Division, 4 Najafgarh Road, New Delhi 110015
and published by him for Allied Publishers Private Ltd,
13/14 Asaf Ali Road, New Delhi 110002

بنیادفرهنگ ایران به فرمان مبارک علیاحضرت شهبانوی ایران و با توجه به سهم عظیم نویسندگان و شاعران هندوستان در گنجینه نفیس فرهنگ و ادب فارسی برای بسط روابط عمیق و دیرینه فرهنگی ایران و هند همکاری بامحققان و ایران‌شناسان برجسته هندرا درصدر برنامه‌های فرهنگی خود قرارداده‌است و می‌کوشد که با ایجاد همکاری علمی و تأمین منابع تحقیق وکمک به نشرآثاراین دانشمندان، خدمات فرهنگی آنان را ارج نهد و از نتایج فکر و قلم ایشان فرهنگدوستان هندی و ایرانی را بهره‌مند سازد .

در اجرای این برنامه معنوی، نشر کتابهائی زیر عنوان "گنجینه ادب‌فارسی " درنظرگرفته‌شده‌است که باهمکاری مؤسسه "آلیدپابلیشرز" به صورتی نفیس و قیمتی مناسب دردسترس دوستداران ادبیات فارسی گذاشته می‌شود و کتاب حاضر یکی ازآن مجموعه است .

امیدواریم بانشرآثار ارزنده نویسندگان وپژوهشگران هندوستانی وایرانی، وظیفه‌خود رادرتحکیم پیوندهای معنوی‌دوملت‌به شایسته‌ترین وجهی انجام دهیم و درین رهگذر از استقبال دانشمندان و ایران شناسان برجستهٔ هندوستان بی‌نصیب نمانیم

دبیرکل و مدیرعامل بنیاد فرهنگ ایران
دکتر پرویز خانلری

ہندستان کے شاعروں اور ادیبوں نے فارسی ادب اور ثقافت کے خزانے کو اپنی تخلیقات سے جس طرح مالا مال کیا ہے اس کے پیشِ نظر علیا حضرت ملکۂ ایران نے فرمان صادر فرمایا ہے کہ بنیادِ فرہنگِ ایران، ہندستان کے ممتاز محققوں اور فارسی دانش وروں کے ساتھ تعاون کو اپنے پروگرام میں سرفہرست قرار دے اور ان کی تحقیقات اور تخلیقات کو شائع کرنے اور ان کے لیے بنیادی مآخذ کی فراہمی میں مدد کرے تاکہ ہند و ایران کے دیرپا اور دور رس ثقافتی روابط میں مزید استواری اور استحکام پیدا ہو اور ہند ایرانی ثقافت کے شیدائی ان دانش وروں کی تخلیقات اور افکار سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

اس علمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنیاد فرہنگ ایران نے فیصلہ کیا کہ کہ ہندستان کے معروف ناشر الائیڈ پبلشرز کے تعاون سے "گنجینۂ ادب فارسی" کے زیرِ عنوان بلند پایہ، خوب صورت اور ارزاں کتابیں شائع کر کے فارسی ادب کے شیدائیوں تک پہنچائے۔ موجودہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم ممتاز ہندستانی اور ایرانی ادیبوں اور محققوں کی قابلِ قدر تخلیقات کو شائع کر کے دونوں ملکوں کے ثقافتی روابط کو مزید استوار بنانے کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ ہندستان کے فارسی دانش ور ہمارے اس اقدام کو بہ نظرِ تحسین دیکھیں گے۔

ڈاکٹر پرویز خانلری

ڈائرکٹر جنرل

بنیاد فرہنگ ایران۔ تہران

عبدالودود اظہر کے نام

جن کی بدولت میں سعیدی سیرجانی سے آشنا ہوا۔

سلامی چو بوی خوش آشنائی

بدان مردم دیدهٔ روشنائی

فہرست

پیشگفتار

دنیا کی ہر قوم کے پاس کچھ ایسی داستانیں ہیں جو اس کے ادب اور عوامی روایات کا بیش بہا سرمایہ ہوتی ہیں۔ جب ہم فارسی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اکثر رستم، سہراب، یوسف، زلیخا، شیریں، فرہاد، بیژن، منیژہ، بہرام گور، سکندر اور اس طرح کے دوسرے کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے، اور اگر ہم ان سے مربوط داستانوں اور روایتوں سے واقف نہ ہوں تو مزدوری عشرتگہ خسرو، نکونامی فرہاد، زلیخا کا رقیبوں سے خوش ہونا، زنان مصر کا محو ماہ کنعاں ہونا، یعقوب کی آنکھوں کا روزن دیوار زنداں ہونا، اور اس جیسی بہت ساری ترکیبوں اور تلمیحوں سے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ ان داستانوں کا سرچشمہ ایران ہے مگر کم و بیش یہ تمام داستانیں فارسی کے ذریعہ اردو ادب میں منتقل ہوئی ہیں اور اردو داں حضرات کے لئے بھی ان کا علم اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا فارسی کے

طالب علم کے لئے۔

ایران کی مشہور ادیب ڈاکٹر زہرا خانلری قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ان داستانوں کو جو سیکڑوں سال پہلے فارسی نظم و نثر میں لکھی گئی تھیں، دوبارہ اپنے خوبصورت اور دلکش انداز میں مرتب کردیا۔ ڈاکٹر زہرا خانلری ایران کی ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کی نثر اپنی دلکشی اور شیرینی، سلاست اور روانی، گہرائی اور گیرائی کے لئے ممتاز ہے۔ ان کی فارسی کتاب کا نام 'داستانهای دل انگیز ادبیات فارسی' ہے جسے آسانی کی خاطر میں نے 'فارسی کی دلکش داستانیں' کہا ہے۔

ان داستانوں کے ترجمہ کی تجویز میرے عزیز دوست جناب سعیدی سیرجانی نے کی تھی جو بنیاد فرہنگ ایران کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ سعیدی سیرجانی ایران کے مشہور شاعر اور صاحب طرز ادیب ہیں ان کی نظم 'یار گمشدہ' جدید فارسی شاعری کا بے مثال شاہکار ہے۔ ان کی نثر میں جو نشتریت ہے وہ یقیناً ان کی شاعری کا فیضان ہے۔ سعیدی سیرجانی کا عقیدہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کی لالہ کاری میں ہندوستان پاکستان، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، آذربائجان اور عراق وغیرہ کے عوام و خواص نے اتنا ہی خون جگر کھپایا ہے جتنا خراسان، اصفہان، شیراز، کرمان اور تہران کے لوگوں نے۔ اور اس لئے 'فارسی پر ان سب لوگوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک ایرانی کا۔ سعیدی سیرجانی اور ان کے استاد ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے فارسی کو بین المللی سطح پر لانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ فارسی زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ میں ڈاکٹر خانلری کا بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے ازراہ کرم اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے کی اجازت عطا کی۔

ترجمہ ایک مشکل اور نازک فن ہے، اور خصوصاً فارسی سے اردو میں، کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے ہوئے بھی الفاظ کے استعمال اور تراکیب میں خاصی مختلف ہیں۔ اس دشواری کا احساس نثر سے زیادہ نظم میں ہوتا ہے جہاں شعر کی روح کو باقی رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔

ترجمہ کے سلسلہ میں میں نے قدم قدم پر اپنے محترم دوست جناب پروفیسر خورشید الاسلام اور مغیث الدین فریدی سے مدد لی ہے۔ میں ان دونوں حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں۔

دہلی ۱۰/اگست ۷۵ء　　　　　　نورالحسن انصاری۔

مقدمہ

(ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری)

جن لوگوں کو فارسی ادب اور خصوصاً فارسی شاعری سے سروکار رہا ہے انھیں فارسی ادبیات کے مطالعہ کے دوران بارہا ایسی تلمیحات سے سابقہ پڑتا ہے جن کا تعلق تاریخی یا افسانوی داستانوں سے ہوتا ہے ۔

ایران کے رہنے والے پچھلے ہزار سال میں ان داستانوں اور افسانوں سے اس قدر آشنا ہو چکے ہیں کہ اگر کسی داستان کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کیا جائے تو ان کے ذہن میں فوراً اس داستان کے تمام کردار اور واقعات ابھر آتے ہیں ۔

ایک فارسی شاعر رات کا ذکر کرتے ہوئے ثریا کو منیژہ سے تشبیہ دیتا ہے جو اس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی ہے جس کے اندر اس کا عاشق بیژن قید ہے ۔

ثریا چون منیژہ برسر چاہ　　　　دو چشم من بر و چون چشم بیژن

ایک اور شاعر شاہی عتاب کا شکار ہے ، وہ کہتا ہے سلطان کے حضور میں میرا وہی حال ہے جو افراسیاب کی قید میں بیژن کا تھا ، کاش کوئی تہمتن (رستم) پیدا ہو اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلائے :

شاہ ترکان بپسندید و بہ چاہم انداخت　　　　دستگیر ار نشود لطف تہمتن ، چکنم

ایرانیوں کے ذہن میں سیاوش کی دردناک داستان ہمیشہ زندہ رہی ہے اور انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے ادب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شاہ ترکان سخن مدعیان می شنود　　　شرمی از مظلمۂ خون سیاوشش باد

اسی طرح لیلیٰ مجنوں کی عشقیہ داستان نے ہمیشہ دلوں کو گرمایا ہے اور شعرا کے لئے نت نئے مضامین اور موضوع فراہم کئے ہیں۔

اگر عداوت و جنگ است درمیان عرب　　　میان لیلی و مجنون محبت است و صفاست

شیریں خسرو کی داستان عشق کو ایرانیوں نے کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ اس کے نکات و رموز کو طرح طرح سے شعر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے،

بر ماجرای خسرو و شیرین قلم کشید　　　شوری کہ درمیان منست و میان دوست

ایران کی عشقیہ داستانوں میں فرہاد کو ایک مظلوم اور ستم دیدہ عاشق مانا گیا ہے۔ اس کی وفاداری اور فداکاری ایرانی عاشقوں کے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہی ہے۔

فرہاد وارم از لب شیرین گزیر نیست
ور کوہ محنتم بہ مثل بیستون شود

دل بہ امید صدائی کہ مگر از تو رسد　　　نالہ ہا کرد درین کوہ کہ فرہاد نکرد

اسی طرح ایرانی مسلمان قرآن کے ذریعہ یوسف وزلیخا کی داستان سے آشنا رہے ہیں اور فارسی شعرا نے طرح طرح سے اس کی جزئیات کی تشریح و تعبیر کی ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں یوسف کے کنویں میں گرنے کی تمثیل پیش کی گئی ہے۔

ببین کہ سیب زنخدان تو چہ می گوید　　　ہزار یوسف مصری فتادہ در چاہ است

یا بھائیوں کے ہاتھوں یوسف کا پیراہن پارہ پارہ کرنے کا واقعہ اس شعر میں
نظم ہوا ہے۔

پیراہنی کہ آید از وبوی یوسفم　　ترسم برادران عزیزش قبا کنند

یوسف چند کھوٹے سکوں کے عوض فروخت کئے گئے، ذیل کے شعر میں اس واقعہ
کی طرف تلمیح ہے:

دوست مفروش بہ دنیا کہ بسی سود نکرد　　آنکہ یوسف بہ زر ناسرہ بفروختہ بود

زلیخا کی یوسف پر فریفتگی:

من از آن حسن روز افزون کہ یوسف داشت دانستم
کہ حسن از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

مصر کی عورتوں کا زلیخا پر طنز وطعنہ:

گرش ببینی و دست از ترنج بشناسی　　روا بود کہ ملامت کنی زلیخا را

یوسف کا سلطنت تک پہونچنا:

الا ای یوسف مصری کہ کردت سلطنت مغرور
پدر را باز پرس آخر کجا شد مہر فرزندی

یعقوب کا پیراہن یوسف کی خوشبو سے خوش ہونا:

بوی پیراہن یوسف زصبا می شنوم　　شادی آورد گل و باد صبا شاد آمد

یوسف کے دیدار سے یعقوب کی شادکامی:

اینکہ پیرانہ سرم صحبت یوسف بنواخت　　اجر صبریست کہ در کلبۂ احزان کردم

غرضکہ فارسی شعر میں بار بار داستان یوسف زلیخا کی جزئیات نظم ہوئی ہیں۔

اسی طرح فارسی غزل میں شیخ صنعان اور ان کے عشق کے واقعہ کی طرف بار بار اشارے ملتے ہیں. مثلاً

گر مرید راہ عشقی فکر بدنامی مکن　　　شیخ صنعان خرقہ رہن خانۂ خمار داشت

یہ داستانیں عوام اور خواص میں اس قدر مقبول تھیں کہ رفتہ رفتہ فارسی ادب اور خصوصاً شاعری کا جزو لاینفک بن گئیں۔

لیکن ہمارے موجودہ نوجوانوں کو اس بات کا کم موقع ملتا ہے کہ ان داستانوں کو ان کی اصلی شکل میں مطالعہ کریں، اور ان منظوم یا منثور شاہکاروں کو پڑھیں جن میں یہ داستانیں بیان کی گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ فارسی شعر و ادب میں ان داستانوں سے متعلق جو تلمیحات آتی ہیں ہمارے نوجوان ان سے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہو پاتے اور اب اس بات کا خطرہ ہو چلا ہے کہ اگر کچھ عرصہ اور بےخبری کا یہی عالم رہا تو ایران کی جدید نسل کا رشتہ ادبیات فارسی کے قدیم سرمائے سے منقطع ہو جائے گا۔

اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان داستانوں کو اختصار کے ساتھ سیدھی سادی زبان میں پیش کر دیا جائے تو نوجوانوں کو مطالعہ کے لئے اچھا مواد مل جائے گا اور پرانے لوگوں کے لئے گاہے گاہے بازخواں کا کام کرے گا۔ ویسے یہ سبھی داستانیں اتنی دلکش، انوکھی اور لطائف و ظرائف پر مشتمل ہیں کہ اگر اس کتاب کا مقصد صرف دل و دماغ کو بہلانا ہو تو بھی اس سے خوبصورت اور بہتر مواد فراہم کرنا مشکل ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میری بیوی (ڈاکٹر زہرا ی خانلری) نے اس ادبی خدمت کو انجام دینے کی ذمہ داری قبول کی۔ انھوں نے چند مشہور داستانوں کا خلاصہ تیار کر کے بالاقساط ماہنامہ سخن میں شائع کیا، ان میں سے بعض داستانیں کتابی صورت میں بھی شائع کی گئی تھیں مگر

اب اس کتاب کے نسخے نایاب ہیں ، اس دوران میں ڈاکٹر زہرا نے کچھ اور داستانوں کا خلاصہ تیار کیا۔ ادھر علیا حضرت شہبانوی ایران نے یہ حکم صادر فرمایا کہ بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے نوجوانوں کے لئے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے ، علیا حضرت کے فرمان کے مطابق اس سلسلہ کی یہ پہلی کتاب اضافہ واصلاح کے بعد شائع کی جا رہی ہے ۔

ڈاکٹر زہرا نے داستانوں کی تلخیص کرتے وقت اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ سادہ اور سہل زبان کے ساتھ ساتھ اصل مصنف یا شاعر کے شیوۂ نگارش کو برقرار رکھا جائے ۔ اصل داستان میں جن تشبیہوں، تعبیروں اور استعاروں سے کام لیا گیا ہے، ڈاکٹر زہرا نے اکثر مقامات پر انھیں کو مختصراً پیش کرنے کی سعی کی ہے ، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قاری داستان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اصل مصنف یا شاعر کی طرز تحریر سے بھی کم وبیش آشنا ہو جائے ۔

ہمیں امید ہے کہ بنیاد فرہنگ ایران اس سلسلہ کی دوسری دلچسپ کتابیں بھی جلد ہی تیار کرا کے ملک کے نوجوانوں کی خدمت میں پیش کرے گا ۔

ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری

بکتاش و رابعه



بکتاش اور رابعہ

شیخ فریدالدین عطار کا شمار ایران کے عظیم صوفی شعرا میں ہوتا ہے ان کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ عطار نے شروع میں اپنا آبائی پیشہ عطاری اختیار کیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ اسے ترک کرکے عرفان اور روحانیت کی طرف مائل ہوگئے۔ عطار کی خوبصورت شاعری ان کے نازک اور عمیق افکار کی آئینہ دار ہے۔

عطار کی تصانیف متعدد ہیں اور تقریباً سبھی مشہور ہیں۔ ان کا دیوان قصائد اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی مشہور مثنویوں میں اسرارنامہ، الٰہی نامہ، منطق الطیر، خسرونامہ اور گل وہرمز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بکتاش اور رابعہ کی یہ داستان عطار کی مثنوی الٰہی نامہ سے ماخوذ ہے اس کہانی کی ہیروئن رابعہ بنت کعب قزداری کا شمار ایران کی اولین شاعرات میں ہوتا ہے۔ تذکروں میں رابعہ کے بعض خوبصورت فارسی اشعار درج ہیں۔

○

چنین قصہ کہ دارد یاد ہرگز؟ چنین کاری کرا افتاد ہرگز؟

ایسا دلچسپ قصہ کسے یاد ہوگا۔ کیونکہ ایسی افتاد کسی پر پڑی ہی نہ ہوگی۔

رابعہ فرمانروائے بلخ کعب کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور نزاکت کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والوں کے دل مچل اٹھتے تھے۔ اس کی کالی سیاہ آنکھیں اور لانبی لانبی پلکیں دل میں کھبی جاتی تھیں۔ اس کے بیر بہوٹی ہونٹ اور موتی جیسے دانت پر لوگ جان چھڑکتے تھے۔ دور دور تک کوئی اور حسینہ نہیں تھی جسے خدا نے ایسی خوبصورتی اور اتنا لطیف شاعرانہ ذوق عطا کیا ہو۔ رابعہ کی میٹھی باتیں اور شیریں اشعار سن کر خیال ہوتا کہ شاید اس نے اپنے کلام میں اپنے ہونٹوں کا شہد گھول دیا ہے۔

حاکم بلخ کو اپنی پیاری بیٹی کا اتنا خیال تھا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر اس کا من دھندلا جاتا تھا کہ اپنی پیاری گڑیا کے لئے اتنا ہی پیارا شوہر کہاں سے لاؤں۔ آخر جب فرمانروائے بلخ بستر مرگ سے جا لگا تو اس نے اپنے بیٹے حارث کو اپنے پاس بلایا اور رابعہ کو اس کے سپرد کرتے ہوئے بولا: کیسے کیسے بادشاہوں نے مجھ سے اس انمول موتی کو مانگا مگر میں نے کسی کو اس کے شایانِ شان نہیں سمجھا۔ اب اگر تیری نظر میں کوئی لڑکا رابعہ کے لئے مناسب ہو تو تیری مرضی۔ میری یہی آرزو ہے کہ رابعہ زندگی بھر خوشیوں

کے پالنے میں جھولتی رہے۔

حارث نے باپ کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ کچھ دنوں کے بعد باپ کا انتقال ہوگیا اور حارث تخت شاہی پر بیٹھا۔ اس نے مرحوم کی وصیت کے مطابق بہن کو جی جان سے عزیز رکھا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ زمانہ ایک نئی چال چلنے والا ہے

ایک دن حارث نے اپنی تخت نشینی کا جشن منایا۔ اس نے ایسے پر فضا باغ میں جشن کا اہتمام کیا کہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا زمین پر جنت اتر آئی ہے۔ ایک طرف سامان عیش وطرب آمادہ تھا، دوسری طرف فطرت نے اپنی خوبصورتی کے سارے خزانے لٹادئے تھے۔ سبزۂ مخملیں کی سرسراہٹ اور ادھ کھلی کلیوں کی تھرتھراہٹ نے فضا میں رس گھول دیا تھا۔ نہر میں چاندی کی لکیر جیسا پانی بہہ رہا تھا جسے دونوں طرف سے پھولوں نے اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا۔ شاہی دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ نہر کے پانی میں لہر تک نہیں اٹھ رہی تھی۔

ایک بلند ایوان پر شاہی تخت سجایا گیا تھا۔ نوجوان حارث تخت پر جلوہ افروز تھا۔ وہ اپنے زرق برق لباس اور مرصع تاج میں سورج کی طرح جگمگا رہا تھا۔ رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس نوکر چاکر چاروں طرف حلقہ باندھے کھڑے تھے اور شہنشاہ کے اشارۂ ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار تھے۔ ہر نوکر سجیلا اور جیالا تھا۔ ان کا نکلتا ہوا قد اور فخر سے بلند سر ان کی شخصیت کو اور دیدہ زیب بنا رہا تھا۔ انھیں ملازموں میں ایک دلفریب اور خوش اندام جوان تھا جو تاروں میں چاند کی طرح ممتاز تھا۔ اس خوبرو جوان کے چہرے پر جس کی نظر پڑتی بے اختیار مرحبا کہہ اٹھتا۔ جوان کا نام بکتاش اور وہ شاہی خزانے کا نگہبان تھا۔

جشن شاہی میں امرار اور وزرار سبھی حاضر تھے۔ ہر شخص بڑھ بڑھ کر بادشاہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کر رہا تھا۔ سبھی کی آنکھوں سے خوشی کا نشہ جھلک رہا تھا۔ رابعہ نے جب جشن کی گہما گہمی سنی تو محل کی چھت پر آئی تاکہ خود اپنی آنکھوں سے اس جشنِ طرب کا مشاہدہ کر سکے۔ وہ تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ اچانک اس کی نظر بکتاش پر پڑی جو شراب کا پیالہ لئے بادشاہ کے حضور میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ کبھی وہ مستی میں جام پہ جام چڑھاتا اور کبھی انتہائی چابکدستی سے رباب کے تاروں کو چھیڑتا۔ کبھی بلبل کی طرح نغمہ سرائی کرتا اور کبھی گل کی طرح ناز آفرینی کرتا۔

رابعہ نے بکتاش کی دلفریبیاں دیکھیں تو جی جان سے اس پر عاشق ہو گئی۔ اس کے دل میں عشق کی آگ ایسی بھڑکی کہ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ رابعہ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا سارا وجود عشق کی آگ میں دہک رہا ہے اور وہ ایک خطرناک طوفان کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح آنسو برسانے لگیں اور اس کا دل شمع کی طرح جلنے لگا۔

رابعہ ایک سال تک اسی کرب میں گھلتی رہی۔ آخر کار غمِ عشق نے اسے اتنا نڈھال کر دیا کہ وہ بستر سے جا لگی۔ بھائی نے بہن کی یہ دردناک حالت دیکھی تو شاہی طبیب کو طلب کیا تاکہ اس کا علاج کرائے۔ مگر مرض اس منزل میں تھا کہ

چنان دردی کجا درمان پذیرد　　　که جان درمان هم از جانان پذیرد

یہ درد تو وہ ہے جس کے لئے طبیب کی دوا نہیں محبوب کی توجہ درکار ہے۔

رابعہ کی ایک دایہ تھی بڑی ہشیار، تجربہ کار اور اس کے دکھ درد کی رازدار۔ اس

نے رابعہ کا یہ حال دیکھا تو ایسی چالاکی اور اونچ نیچ کی باتیں کیں کہ رابعہ کی جھجک جاتی رہی
آخر اس نے مہر سکوت توڑا اور کنیز سے اپنی داستان عشق کہہ ڈالی:

چنان عشقش مرا بی خویش آورد — کہ صد سالہ غمم در پیش آورد

مجھے اس غلام کے عشق نے ایسا بیخود کر دیا ہے گویا میں برسوں سے
اسی غم میں مبتلا ہوں۔

چنین بیمار و سرگردان از آنم — کہ می دانم کہ قدرش می ندانم

عشق نے وہ کیف بیخودی عطا کیا ہے گویا برسوں سے اس غم سے آشنائی ہے

سخن چون می توان زان سرو من گفت — چرا باید ز دیگر کس سخن گفت

میں اپنے سرو ناز کی باتیں کرتی ہوں مجھے داستان غیر سے کیا واسطہ؟

رابعہ نے کنیز سے کہا کہ ابھی جا اور دلبر تک میرا پیغام عشق پہونچا کر آ۔ لیکن یہ دھیان
رہے کہ بات بڑی نازک ہے۔ مبادا کسی اور کو اس کی ہوا تک لگے۔ یہ کہہ کر رابعہ اٹھی اور
اس نے بکتاش کو یہ خط لکھا:

الا ای غائب حاضر کجائی — بہ پیش من نہ ای، آخر کجائی

اے دوست کیسے کہوں تو کہاں ہے تو نظروں سے دور مگر دل سے نزدیک ہے

بیا و چشم و دل را میہمان کن — وگرنہ تیغ گیر و قصد جان کن

آ تجھے اپنے دل اور آنکھوں میں رکھ لوں۔ اس لئے کہ یہ جان ناتواں
اب تیری جدائی کی تاب نہیں لا سکتی۔

دلم بردی وگر بودی ہزارم — نبودی جز فشاندن بر تو کارم

تیری قسم، ایک جان کیا اگر میرے پاس ہزار جان ہوتی تو سب کی سب تیرے
قدموں میں نثار کر دیتی۔

زتو یک لحظه دل زان بر نگیرم کہ من ہرگز دل از جان بر نگیرم

تو اس طرح روح میں بس گیا ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی دل تیری یاد سے غافل نہیں ہوتا۔

اگر آئی بہ دستم باز رستم وگر نہ می روم ھر جاکہ ہستم

زہے قسمت اگر تیرا دیدار میسر ہو ورنہ جہاں بھی جاؤں درد و غم کا سایہ ساتھ ہے۔

بہ ہر انگشت می گیرم چراغی ترا می جویم از ہر دشت و باغی

میں اپنی ایک ایک انگلی پر جلتی ہوئی شمع لے کر تجھے ہر باغ و بیابان میں ڈھونڈھ رہی ہوں۔

اگر پیشم چو شمع آئی پدیدار وگر نہ چون چراغم مردہ انگار

اگر تیرا دیدار میسر نہیں ہوا تو یقین جان میں بھی ایک دن مفلس کے دئے کی طرح بجھ جاؤں گی۔

رابعہ نے خط لکھ کر اس پر اپنے چہرے کا نقش بنایا اور محبوب کے پاس بھیج دیا بکتاش نے خط پڑھا اور اس دلفریب نقش کو دیکھا تو رابعہ کے ذوق شعر پر حیران رہ گیا اسے یوں لگا جیسے وہ برسوں سے رابعہ کو جانتا ہے اور اس پر والہانہ جان چھڑکتا ہے بکتاش نے رابعہ کو اتنا ہی محبت بھرا خط لکھا اور عشق کا جواب عشق سے دیا۔

جب کنیز نے آکر رابعہ کو بکتاش کی دل باختگی کی داستان سنائی تو خوشی سے اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ اب رابعہ دن رات عاشقانہ غزلیں کہہ کر اپنے دلبر کے پاس بھیجا کرتی اور اس کی ہر غزل پر بکتاش کی آتش شوق تیز تر ہوتی رہی۔

اس طرح بہت دن بیت گئے۔ ایک روز بکتاش نے رابعہ کو کہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بے اختیار دوڑ کر اس کے دامن سے لپٹ گیا لیکن بجائے اس کے کہ رابعہ اس کی دلدہی اور دل نوازی کرتی وہ بکتاش کی اس حرکت پر بھڑک اٹھی، غصہ سے اس کی بھویں تن گئیں اور وہ ملامت آمیز انداز میں جھڑک کر بولی:

کہ ہان ای بی ادب این چہ دلیر لیست　　　　تو روباہی، ترا چہ جای شیر لیست

اے گستاخ غلام، تیری یہ جرأت کہ اپنی لومڑی کی سی ذات کو بھول کر شیر جیسی ادائیں دکھا رہا ہے۔

کہ باشی تو کہ گیری دامن من　　　　کہ ترسد سایہ از پیراہن من

تیری یہ مجال کیسے ہوئی کہ میرے دامن کو ہاتھ لگائے، تجھے معلوم نہیں کہ میرا سایہ بھی میرے لباس کو چھوتے ڈرتا ہے۔

بکتاش دم بخود رہ گیا۔ آخر ہمت کر کے بولا: جان من، یہ کیا ماجرا ہے کہ تو چھپ چھپ کر مجھے عاشقانہ اشعار لکھتی ہے اور میری آتش شوق کو بھڑکاتی ہے لیکن آج جب تیرا دیدار میسر ہوا تو مجھ سے منہہ موڑ کر بیگانوں کی طرح مجھے کھدیڑ رہی ہے رابعہ نے اسی اکڑ سے جواب دیا کہ تو اس راز سے واقف نہیں، تجھے نہیں معلوم کہ جو آگ میرے سینے میں دہک رہی ہے اور میرے وجود کو راکھ کا ڈھیر بنائے دے رہی ہے، میرے نزدیک کتنی گراں بہا ہے، نہ میرا عشق جسمانی ہے اور نہ میں ہوا و ہوس کی دیوانی ہوں، تیرے لئے یہی کیا کم ہے کہ میں تیری دلدادہ ہوں اور تو میرا ہمراز، خبردار، جو میرے دامن کو ہاتھ لگایا ورنہ ہمیشہ کے لئے میرے آستانہ سے محروم رہے گا۔

رابعہ بکتاش کی آتش شوق کو بھڑکا کر چل دی۔ وہ اسی طرح درد بھرے شعر کہتی رہی اور اپنی سلگتی ہوئی روح کو تسکین دیتی رہی۔

ایک دن رابعہ چمن میں گھوم رہی تھی اور یہ اشعار گنگنا رہی تھی:

الا ای باد شبگیری گذر کن   زمن آن ترک یغما را خبر کن

اے باد سحرگاہی، خدا را جاکر معشوق کو میرے حال زار کی خبر دے۔

بگو کز تشنگی خوابم ببردی   ببردی آبم و آبم ببردی

اس سے کہہ تیرے انتظار نے میری نیند اڑادی اور تیرے عشق نے میری آبرو ختم کر دی۔

اچانک رابعہ کو احساس ہوا کہ اس کا بھائی اس کے اشعار سن رہا ہے۔ اس نے فوراً 'ترک یغما' کو 'سرخ سقا' سے بدل دیا۔ یہ سقا ہر روز رابعہ کے محل میں پانی لاتا تھا۔ بھائی اس وقت تو کچھ نہیں بولا مگر دل میں بہن کی طرف سے کھٹک گیا۔

اس واقعہ کے ایک مہینہ بعد رابعہ کے بھائی حارث کے ملک پر دشمن نے بے پناہ فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ حارث نے اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ شہر سے باہر مورچہ لگایا۔ جنگ کے نقاروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ایسے گھمسان کا رن پڑا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، زمین پر خون کا دریا بہہ نکلا اور آسمان سے قیامت برسنے لگی۔

حارث کی فوج انتہائی بہادری کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہوئی۔ انھیں میں بکتاش بھی تھا جو دونوں ہاتھوں میں تلوار لے کر دشمن کا صفایا کر رہا تھا، اچانک بکتاش کے سر پر کسی کی تلوار آکر لگی، اس کا سر بری طرح زخمی ہوگیا۔ قریب تھا کہ دشمن کے سپاہی اسے اسیر کر لیں کہ اچانک ایک نقاب پوش مسلح شہ سوار دشمن کے سپاہیوں

پر جھپٹا۔ اس نے اتنے زور کا نعرہ مارا کہ لوگ لرز گئے۔ نقاب پوش نے آناً فاناً دشمن کے ڈھیر کر دئے۔ وہ سیدھا بکتاش کے پاس پہونچا اور اسے گھوڑے پر بیٹھا کر حارث کی فوج میں لے آیا اور محافظوں کے حوالے کر کے خود غائب ہو گیا۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھ پایا کہ سوار کون تھا، کہاں سے آیا اور کدھر غائب ہو گیا۔ یہ نقاب پوش رابعہ تھی۔ جس نے اپنی جان پر کھیل کر بکتاش کو موت کے چنگل سے بچایا تھا۔

رابعہ نے جیسے ہی میدان جنگ کو چھوڑا دشمن نے دوبارہ پوری طاقت سے دھاوا بولا۔ حارث کی فوج تھوڑی دیر کے لئے ڈگمگا گئی۔ عین اسی وقت شاہ بخارا کی فوج کمک کے لئے آن پہونچی۔ لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ دشمن کو شکست ہوئی اور حارث فتح کے جھنڈے لہراتا ہوا واپس ہوا۔ اب اسے نقاب پوش کی تلاش ہوئی مگر کوئی شخص اس کا اتا پتا نہیں بتا سکا۔ گویا فرشتہ تھا جو زمین سے اڑ کر آسمان پر چلا گیا۔

جب رات ہوئی اور چاند نے اپنی دودھیالی چاندنی بکھیری تو رابعہ جو بکتاش کے زخم سے پڑی کراہ رہی تھی، اٹھی اور قلم کاغذ لے کر یہ خط لکھنے لگی:

چہ افتادت کہ افتادی بہ خون در   چو من زین غم نبینی سرنگون تر

اے دوست، یہ کیسی افتاد پڑی کہ میرے بجائے تو خون میں نہا گیا، آ دیکھ تیرے زخموں سے میں کراہ رہی ہوں۔

ہمہ شب ہمچو شمع سوز در بر   چو شب بگذشت مرگ روز بر سر

میں ساری رات شمع کی طرح جلتی ہوں اور دن بھر موت کے کرب میں تڑپتی ہوں۔

چہ می خواہی ز من با این ہمہ سوز   کہ نہ شب بودہ ام بی سوز نہ روز

میرے سینے میں عشق کی آگ ایسی بھڑکی ہے کہ رات کی نیند اور دن کا
چین حرام ہو گیا ہے۔

چنان گشتم زسودای تو بی خویش　　که از پس می ندانم راه و از پیش

میں تیری محبت میں اپنے حواس کھو بیٹھی ہوں اور اپنے آغاز و انجام
دونوں سے بے پرواہ ہوں۔

دلی دارم ز درد خویش خسته　　به بیت الحزن در بر خویش بسته

میرا دل زخموں سے چور ہے اور اب میں غم کے نہاں خانہ میں سمٹ
کر رہ گئی ہوں۔

اگر امید وصل تو نبودی　　نه گردی ماندی از من نه دودی

میں صرف تجھ سے ملنے کی امید میں اب تک زندہ ہوں ورنہ میرا
نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔

بکتاش کو رابعہ کا خط ملا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے جلتے زخموں پر کسی نے
مرہم رکھ دیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے رابعہ کو یہ پیغام بھیجا:

که جانا، تا کیم تنها گذاری　　سر بیمار پرسیدن نداری

جان من، کب تک میں انتظار کی گھڑیاں گنتا رہوں۔ کیا تو اپنے بیمار
کو دیکھنے نہیں آئے گی؟

چو داری خوی مردم چون لبیبان　　دمی بنشین به بالین غریبان

کیا تو اپنی فراست سے ایسی صورت نہیں پیدا کر سکتی کہ ذرا دیر کے لئے
مجھ بیکس کی دلدہی کر جائے

اگر یک زخم دارم بر سر امروز ہزارم ہست بر جان ای دل افروز

میرے سر پر تو ایک ہی زخم لگا ہے۔ لیکن میری روح نے ہزاروں زخم کھائے ہیں۔

ز شوقت پیرہن بر من کفن شد بگفت این وز خود بی خویشتن شد

تیرے عشق نے میری جان لے لی۔ بکتاش یہ کہہ کر بے ہوش ہو گیا۔

کچھ دن کے بعد بکتاش کے زخم مندمل ہو گئے اور وہ صحت یاب ہو گیا
رابعہ ایک دن راستہ میں رودکی شاعر سے ملی۔ دونوں نے ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور ایک دوسرے کو اپنے اشعار سنائے۔ رودکی کو رابعہ کے ذوقِ شعر پر بڑی حیرت ہوئی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رابعہ کسی کے عشق میں گرفتار ہے تو رودکی سمجھ گیا کہ رابعہ کی پر سوز شاعری کا سبب کیا ہے۔ رودکی بخارا پہونچا تو شاہ بخارا کے دربار میں حاضر ہوا۔ اتفاقاً اسی دن حارث بھی شہنشاہ بخارا کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا تھا کیونکہ بخارا ہی کی فوج کی بدولت وہ میدان جنگ میں فتح مند ہوا تھا۔ اس تقریب پر دربار میں جشن کا اہتمام کیا گیا۔ امرا اور شعرا حاضر ہوئے۔ شاہ بخارا نے رودکی سے شعر سنانے کی فرمایش کی۔ رودکی کھڑا ہوا اور اس نے رابعہ کے چند شعر سنائے۔ شعرا تنے پر سوز تھے کہ درباریوں پر رقت طاری ہو گئی۔ شہنشاہ کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اس نے رودکی سے پوچھا: ان اشعار کا خالق کون ہے؟ رودکی شراب کے نشہ میں چور تھا، وہ بھول گیا کہ دربار میں حارث بھی موجود ہے۔ اس نے بے جھجک کہہ دیا کہ یہ اشعار رابعہ بنت کعب کے ہیں جو ایک غلام کے عشق میں ایسی دیوانی ہوئی

ہے کہ کھانا پینا چھوڑ بیٹھی ہے۔ دن رات شعر کہتی ہے اور چھپ چھپ کر معشوق کو خط لکھتی ہے۔ اس کے شعروں میں جو غیر معمولی سوز و گداز ہے اس کا راز یہی ہے۔

حارث نے یہ بات سنی تو اسے دھچکا سا لگا مگر اس نے کچھ ایسا ظاہر کیا کہ وہ نشہ میں دھت ہے اور رودکی کی باتیں نہیں سن رہا ہے۔ جب وہ اپنے شہر کو لوٹا تو غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے سوچا رابعہ نے خاندان کی عزت پر کلنک کا جو ٹیکہ لگایا ہے وہ صرف اس کے خون سے مٹ سکتا ہے۔ حارث کو فقط بہانے کی تلاش تھی۔

بکتاش کو رابعہ نے جو عاشقانہ خط لکھے تھے وہ اس نے ایک ڈبے میں محفوظ رکھے تھے۔ بکتاش کا ایک لالچی ساتھی تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ بکتاش نے ڈبے میں جواہرات چھپا رکھے ہیں۔ ایک دن اس نے چوری سے ڈبا کھولا تو اس میں جواہرات کے بجائے عاشقانہ خط ملے۔ اس لالچی شخص نے سارے خط لے جا کر حارث کو دیدئے۔ خط دیکھ کر حارث آگ بگولا ہو گیا۔ غصہ سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اس نے سوچا رابعہ کا خون کئے بغیر اس کے انتقام کی آگ نہیں بجھ سکتی

حارث نے پہلے بکتاش کو گرفتار کیا اور اسے ایک کنوئیں میں قید کر دیا پھر اس نے بہن کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس نے حکم دیا کہ ایک حمام گرم کریں۔ اور رابعہ کے دونوں ہاتھوں کی رگیں کاٹ کر اسے دہکتے حمام میں بند کر دیں۔ جلادوں نے شاہی حکم کے مطابق رابعہ کو حمام میں لے جا کر اس کے دروازے کو اینٹ سے چن دیا۔ رابعہ لاکھ چیخی چلائی مگر کسی نے نہیں سنا اس کا سارا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔ یہ عشق کی آگ تھی، اس کے سلگتے دل کی آگ تھی، اس کی دہکتی روح کی

آگ تھی۔ رابعہ سوز و گداز کی اس منزل میں تھی کہ سات سمندروں کا پانی بھی اس آگ کو بجھانے سے قاصر تھا۔

رابعہ کے جسم سے آہستہ آہستہ خون بہہ کر چاروں طرف جمع ہونے لگا لیکن عشق کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے والی یہ دوشیزہ اپنے ہی خون میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر دیوار پر درد بھرے شعر لکھتی رہی۔ جیسے جیسے دیوار پر خون کی سرخی بڑھتی گئی، رابعہ کا چہرہ پیلا پڑتا گیا۔ جب ساری دیوار خون کے نقش سے رنگا رنگ ہو گئی تو رابعہ کے جسم سے بھی خون کا آخری قطرہ بہہ نکلا۔ رابعہ دیوار کے ہر گوشہ پر عشق کے امٹ نقوش چھوڑ کر اپنے خون اور آنسوؤں کا کفن اوڑھ کر سو گئی۔

اگلے دن حمام کا دروازہ کھولا گیا تو رابعہ سراپا زعفران زار بنی تھی۔ میت کو غسل دے کر سپرد خاک کیا گیا۔ رابعہ نے خون میں تڑپ تڑپ کر دیوار پر یہ اشعار لکھے تھے:

نگارا بی تو رویم چشمہ سار است ہمہ رویم بہ خون دل نگار است

اے محبوب، تیرے غم میں میری آنکھوں سے میرے دل کا خون
بہا ہے جس نے میرے چہرہ کو لالہ زار بنا دیا ہے۔

ربودی جان و دروی خوش نشستی غلط کردم کہ بر آتش نشستی

مجھے فریفتہ کر کے تو مطمئن ہے کہ میری روح میں بس گیا مگر میں اسے
کیسے تسلیم کروں اس لئے کہ میری روح تو آتشکدہ بنی ہوئی ہے

چو در دل آمدی بیرون نیائی غلط کردم کہ تو در خون نیائی

تو میرے دل میں تو سما کر رہ گیا مگر یہ بھی کیسے کہوں اس لئے کہ میرا دل
تو خون ہو چکا اور تو خون میں کیسے رہے گا؟

چو از دو چشم من دو جوی دادی — بہ گرمابہ مرا سر شوی دادی

تیرے غم میں میری آنکھوں سے جو آنسو جاری ہیں ان میں مجھے وہ لطف
آرہا ہے جیسے تونے میرے نہانے کے لئے گرم پانی کا انتظام کیا ہے۔

منم چون ماہیی بر تابہ آخر — نمی آئی بدین گرمابہ آخر

کاش تو اس حمام میں آکر دیکھتا کہ میں اس آگ میں مچھلی کی طرح کیسے
تڑپ رہی ہوں۔

نصیب عشق این آمد ز درگاہ — کہ در دوزخ کنندش زندہ آنگاہ

عشق کی قسمت یہی ہے کہ عاشق جب تک زندہ رہتا ہے جہنم کے
شعلوں میں شگفتہ رہتا ہے۔

سہ رہ دارد جہان عشق اکنون — یکی آتش، یکی اشک و یکی خون

اس وقت عاشق کے سامنے تین ہی راستے ہیں، ایک آگ کا،
دوسرا آنسوؤں کا، تیسرا خون کا۔

بر آتش خواستم جانم کہ سوزد — چو جای تست، نتوانم کہ سوزد

میں نے چاہا اپنی روح کو آگ میں جلا دوں لیکن میری روح چونکہ
تیرا گھر بن چکی ہے میں تیرے گھر کو نہ جلا سکی۔

بہ اشکم پای جانان می بشویم — بخونم دست از جان می بشویم

اپنے آنسوؤں سے محبوب کے پاؤں دھونے کے بہانے میں اپنا خون

بہادوں اور اپنی جان سے ہاتھ دھولوں۔

بخوردی خون جان من تمامی کہ نوشت باد ای یار گرامی

تیرے غم نے میری جان تو لے لی لیکن اے یار عزیز میری دعا ہے
کہ تیری عمر دراز ہو۔

کنون در آتش و در اشک و در خون برفتم زین جہان جیفہ بیرون

میں اب آگ، آنسو اور خون کے راستوں سے گذر کر اس بے رحم
دنیا سے جا رہی ہوں۔

مرا بی تو سر آمد زندگانی منت رفتم تو جاویدان بمانی

تیرے بغیر میں تو زندہ نہ رہ سکی لیکن میری دعا ہے کہ میرے بغیر
تو ہمیشہ زندہ رہے۔

بکتاش کو رابعہ کی دردناک موت کی خبر ملی تو رات کے اندھیرے میں وہ قیدخانہ سے فرار ہو کر سیدھا شاہی محل پہونچا اور حارث کو موت کے گھاٹ اتار کر رابعہ کی قبر کی طرف چلا۔ قبر پر پہونچ کر اس نے وہی خنجر نکالا جو ابھی تک حارث کے خون سے گرم تھا، اور ایک لمحہ میں اسے اپنے دل میں پیوست کر لیا۔

نبودش صبر بی یار یگانہ بدو پیوست و کوتہ شد فسانہ

بکتاش اپنی محبوبہ کی جدائی کی تاب نہ لاسکا اور انجام کار اس سے جاملا۔

شیخ صنعان کی کہانی

شیخ صنعان کی یہ داستان عطار
کی مثنوی منطق الطیر سے لی گئی ہے
فارسی کی صوفیانہ شاعری میں شیخ
صنعان کی تلمیح اکثر ملتی ہے۔

شیخ صنعان



○

گر مرید راہ عشقی فکر بدنامی مکن　　　شیخ صنعان خرقہ رہن خانۂ خمار داشت
(حافظ)

اگر تیرا عشق سچا ہے تو بدنامی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔
دیکھو شیخ صنعان زہد و تقوی کے باوجود عشق میں شرابی ہو گئے۔

شیخ صنعان اپنے زمانے کے بڑے صاحب کمال صوفی اور روحانی پیشوا تھے۔ انھوں نے تقریبًا پچاس سال خانہ کعبہ میں عبادت کی تھی۔ شیخ تو شیخ مریدوں کا یہ عالم تھا کہ دن رات عبادت و ریاضت میں مستغرق رہتے تھے۔ شیخ دن رات نماز پڑھتے، مسلسل روزے رکھتے اور پیغمبر کی تمام سنتوں کو بجالاتے، انھوں نے پچاس حج کئے۔ وہ درحقیقت صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔

ہر کہ بیماری و سستی یافتی　　　از دم او تندرستی یافتی

شیخ کے دم میں وہ اثر تھا کہ بیمار تندرست ہو جاتے۔

پیشوا یانی کہ در پیش آمدند　　　پیش او از خویش بیخویش آمدند

ان کے حضور میں پہونچ کر بڑے بڑے عرفا پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

ایک بار شیخ صنعان نے متواتر کئی رات یہ خواب دیکھا کہ وہ کعبہ سے روم چلے گئے ہیں اور وہاں ایک بت کو سجدہ کر رہے ہیں۔ شیخ اس خواب سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ انھیں یقین ہو گیا کہ یہ خواب کسی ایسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے

جس سے جان بچانا آسان نہیں۔ شیخ نے سوچا بہتر ہے روم کی طرف چل دیں۔ شاید وہاں پہونچ کر یہ معما حل ہو جائے لیکن اگر غفلت سے کام لیا تو ممکن ہے ہمیشہ کے لئے روحانی آزار میں مبتلا رہیں۔

آخر کار شیخ نے سفر کا پکا ارادہ کر لیا اور مریدوں سے بولے: مجھے جلد از جلد روم پہونچنا چاہئے تاکہ اس خواب کی تعبیر معلوم ہو سکے۔ مریدوں نے کہا: ہم سب اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں گے۔ چنانچہ اللہ والوں کا یہ قافلہ مکہ سے روانہ ہوا اور چند روز کے بعد روم جا پہونچا۔

روم میں ایک دن شیخ اپنے مریدوں کے ساتھ یونہی ٹہل رہے تھے کہ انھیں ایک خوبصورت لڑکی دکھائی دی۔

ہر دو چشمش فتنۂ عشاق بود
ہر دو ابرویش بخوبی طاق بود

اس کی آنکھیں دیکھنے والوں کو دیوانہ بنا دیتی تھیں اور اس کے ابرو کی محراب دلوں کو سجدہ کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

روی او از زیر زلف تابدار
بود آتش پارہ ای بس آبدار

چمکدار زلفوں کے سایے میں اس کا چہرہ دہکتے ہوئے انگارے کی طرح روشن تھا۔

ہر کہ سوی چشم او تشنہ شدی
در دلش ہر مژہ چون دشنہ شدی

جس نے بھی اس کی آنکھوں کو دیکھنا چاہا اس کے دل پر پلکوں کی چھریاں چل گئیں۔

چاہ سیمین بر زنخدان داشت او
ہمچو عیسیٰ بر سخن جان داشت او

اس کے حلقۂ ذقن میں غضب کی دلاویزی تھی اور اس کی باتوں میں اعجاز مسیحائی تھا۔

لڑکی نے اپنے گورے چہرے سے نقاب ہٹائی تو شیخ تڑپ اٹھے اور عشق کے ہاتھوں ایسے بے بس ہوئے کہ اپنی ساری کائنات محبوب کے حضور میں قربان کر بیٹھے۔ انھوں نے دین وایمان کی دولت دے کر ذلت و رسوائی مول لے لی۔ شیخ پر عشق نے وہ جادو کیا کہ وہ اپنی جان سے بیزار نظر آنے لگے۔

مریدوں نے شیخ کا یہ حال دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ انھوں نے بڑی تدبیریں کیں کہ شیخ عشق کے چکر سے نکل آئیں مگر تقدیر میں کچھ اور لکھا تھا۔ مریدوں کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور شیخ کا درد بدستور لاعلاج رہا۔

رات کو ایک لمحہ کے لئے بھی شیخ کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ بے چینی سے ساری رات کروٹیں بدلتے رہے اور آہیں بھرتے رہے۔

گفت یارب امشبم را روز نیست　　　　شمع گردون را همانا سوز نیست

شیخ بولے خدایا کیا اس رات کی سحر نہیں ہوگی۔ ایسا لگتا ہے آسمان کی شمع بجھ گئی ہے۔

در ریاضت بوده ام شبها بسی　　　　خود نشان ندهد چنین شبها کسی

میں نے ریاضت میں کیسی کیسی پہاڑ سی راتیں گذاری ہیں لیکن ایسی رات کبھی نہیں دیکھی۔

همچو شمع از تف و سوزم می کشند　　　　شب همی سوزند و روزم می کشند

میں رات بھر شمع کی طرح گھلتا رہتا ہوں اور دن بھر موت کے کرب
میں مبتلا رہتا ہوں۔

رات کیا تھی قیامت تھی۔ شیخ کو ایسا لگا کہ سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا ہے اور اب کبھی طلوع نہیں ہوگا۔ ان کی کس مپرسی کا عجیب عالم تھا۔ صبر کا دامن چھوٹ چکا تھا۔ عقل پرواز کر چکی تھی۔ بدن میں اتنی سکت نہیں تھی کہ محبوب کے گھر تک جا سکیں اور کوئی ایسا غمگسار نہیں تھا جو ان کو سہارا دے سکے

رفت عقل و رفت صبر و رفت یار   این چہ درد است، این چہ عشق است، این چہ کار؟

عشق کا یہ کیا کاروبار ہے جس میں محبوب کے ساتھ صبر اور عقل
سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

مریدوں نے شیخ کی یہ حالت دیکھی تو انھیں تسلی دینے لگے۔ ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیتا تھا۔ لیکن شیخ بڑی مہارت سے ہر شخص کا مشورہ رد کرتے جاتے تھے۔

همنشینی گفت اے شیخ کبار   خیز و این وسواس را غسلی بر آر

ایک مرید نے کہا اے شیخ اٹھئے اور یہ وسوسہ دل سے دھو ڈالئے۔

شیخ گفتا امشب از خون جگر   کرده ام صد بار غسل ای بیخبر

شیخ نے جواب دیا میں آج رات خون جگر سے بار بار نہایا ہوں۔

آن دگر گفتا کہ تسبیحت کجاست   کی شود کار تو بی تسبیح راست

دوسرا مرید بولا: حضور آپ کی تسبیح کہاں ہے؟ بغیر تسبیح کے
آپ کا کام کیسے بنے گا؟

گفت آن رامن بیفکندم ز دست　　　تا توانم بر میان زنار بست

شیخ نے جواب دیا میں نے تسبیح رکھ دی تاکہ میں زنار باندھ سکوں۔

آن دگر گفت اپشیمانیت نیست　　　یک نفس درد مسلمانیت نیست

ایک اور مرید نے کہا کیا آپ کو اس کی ندامت نہیں کہ آپ کے اندر درد اسلام کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہی۔

گفت کس نبود پشیمان بیش ازین　　　کہ چرا عاشق نگشتم پیش ازین

شیخ بولے اس سے زیادہ پشیمانی کی اور کیا بات ہوگی کہ میں اب تک عاشق نہیں ہوا۔

آن دگر گفتش کہ دیوت راہ زد　　　تیر خذلان بر دلت ناگاہ زد

ایک دوسرا مرید بولا یقیناً شیطان نے آپ کو بہکایا ہے کہ آپ اچانک رسوائی کا نشانہ بنے۔

گفت دیوی کو رہ ما می زند　　　گو بزن الحق کہ زیبا می زند

شیخ نے کہا اگر اس کا نام شیطان کا بہکانا ہے تو خدا کرے وہ یونہی مجھے بہکاتا رہے۔

آن دگر گفتا کہ با یاران بساز　　　تا شویم امشب بسوی کعبہ باز

ایک اور مرید نے کہا اپنے مریدوں کی بات مانئے اور آئیے آج رات کو کعبہ لوٹ چلیں۔

گفت اگر کعبہ نباشد دیر ہست　　　ہوشیار کعبہ شد در دیر مست

شیخ بولے جسے کعبہ والے ہوشمند کہتے تھے وہ دیر میں آکر مست ہوگیا۔

تو اب کعبہ نہ سہی دیر ہی سہی۔

جب مریدوں نے دیکھا کہ شیخ کوئی بات نہیں مانتے تو مجبوراً انکی خدمت کرنے لگے اور بے چینی کے ساتھ یہ انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

اگلے روز شیخ صنعان نے محبوب کی گلی میں ڈیرا جمایا اور وہاں کے کتوں کو گلے لگایا مگر درد دل کا یہ عالم تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ گھل کر کانٹا ہو گئے پر معشوق کا آستانہ نہیں چھوڑا۔ ان کے لئے اس آستانہ کی مٹی سرمہ سے کم نہیں تھی۔

شدہ شدہ لڑکی کو خبر ملی کہ شیخ صنعان ایک عرصہ سے اس کے عشق میں گرفتار ہیں اور اس کی گلی میں بوریا بستر جمائے ہوئے ہیں۔ اس نے طنزاً شیخ سے پوچھا: آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ اور ہم کفار کے محلہ میں قیام کریں؟

شیخ نے کہا: جان من، یہ ناز و عشوہ کا موقع نہیں۔ تو جس طرح چاہے میرے عشق کو آزما کر دیکھ لے۔ یا مجھ پر رحم کھا یا اجازت دے تیرے قدموں میں جان نثار کر دوں۔

روی بر خاک درت جان می دہم   جان بہ ترخ روزارزان می دہم

چاہتا ہوں تیرے در پر جان دے دوں مگر جان دینے سے محبت کا حق ادا نہیں ہوتا۔

چند نالم بر درت، در باز کن   یکدمم باخویشتن دمساز کن

کب تک تیرے آستانے پر سر پھوڑوں؟ دروازہ کھول اور گھڑی بھر کے لئے مجھے اپنا لے۔

گرچہ ہمچون سایہ ام از اضطراب   در جہم از روزنت چون آفتاب

اگر چہ میں سایہ کی طرح بے قرار ہوں لیکن سورج کی کرن بن کر تجھ تک پہونچنا چاہتا ہوں۔

لڑکی تنک کر بولی: بڑے میاں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو اور پیار کی باتیں کر رہے ہو؟ شرم کرو شرم، ان آہوں کے ساتھ تم میرا ساتھ دے پاؤ گے؟ کہاں تمھارا بڑھاپا اور کہاں میرا جوان عشق؟

شیخ پر لڑکی کے طعنے تشنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور اس کے عشق کا دم بھرتے رہے۔ آخر ایک دن لڑکی بولی: شیخ صاحب! اگر تمھارا عشق صادق ہے تو پہلے اسلام ترک کرو اور نصرانی مذہب اختیار کرو تاکہ ہم میں کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

شیخ نے کہا: میں ہر حکم کے لئے حاضر ہوں۔ نصرانی حسینہ نے کہا تو یہ چار کام کرو: بت کو سجدہ کرو، قرآن کو جلا دو، شراب پیو اور دین اسلام کو بھول جاؤ۔

شیخ بولے: میں پہلے شراب پیوں گا۔ چنانچہ لڑکی شیخ صنعان کو کلیسا میں لے گئی اور ان کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ دیتے ہوئے بولی: لو، پیو۔

شیخ صنعان محفل کا رنگ اور محبوب کا انداز کرم دیکھ کر مست ہو چلے تھے۔ انھوں نے دست نازک سے جام لیا اور غٹا غٹ پی گئے۔ ایک طرف عشق کا نشہ، دوسری طرف شراب کی مستی، شیخ کو دین دنیا کا ہوش نہیں رہا۔ قرآن حدیث کی باتیں ان کے دل سے محو ہو گئیں۔ یکایک شیخ نے بڑھ کر معشوق کی گردن

میں ہاتھ ڈال دیئے۔

لڑکی شیخ کو دور جھٹک کر کھڑی ہو گئی اور بولی: اگر تمھارا عشق سچا ہے تو پہلے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرو۔ اس کے بغیر تم اس نازک گردن میں اپنے ہاتھ حمائل نہیں کر سکتے۔

شیخ صنعان عشق اور شراب کے نشہ میں سب کچھ بھول چکے تھے۔ انھوں نے محبوب کی اس خواہش کے سامنے بھی سر تسلیم خم کر دیا اور بولے: میں حاضر ہوں بت کو سجدہ کروں اور قرآن کو نذر آتش۔ لڑکی نے کہا، تب آپ میرے سرتاج ہیں اور میں آپ کی کنیز۔

نصرانیوں نے جب یہ دیکھا کہ شیخ صنعان جیسے عارف باللہ نے اسلام چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کر لیا ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، وہ شیخ کو کلیسا لے گئے اور باقاعدہ انھیں اپنے مذہب میں داخل کیا۔ شیخ نے اپنا خرقۂ تصوف جلا ڈالا اور خانۂ کعبہ سے ناتہ توڑ لیا۔ نصرانی حسینہ کے عشق میں انھوں نے بت کو سجدہ بھی کیا۔ سب کچھ کر چکے تو محبوب سے بولے:

خمر خوردم، بت پرستیدم ز عشق   کس ندیدہ است آنچہ من دیدم ز عشق

میں نے تیرے عشق میں شراب بھی پی اور بت کو سجدہ بھی کیا۔ عشق میں مجھ پر جو بیتی ہے وہ کسی پر کب بیتی ہوگی۔

شیخ نے کہا: میں تقریباً پچاس سال راہ راست پر چلتا رہا اور دریائے معرفت میں غوطے کھاتا رہا۔ مگر تیرے عشق میں اسلام چھوڑ کر کافر بن بیٹھا اور خرقہ اتار کر زنار پہن لی۔ اب بتا تیری جدائی میں کب تک تڑپتا رہوں؟

لڑکی بولی: فقیر بابا، ٹھیک کہتے ہو مگر میرا مہر تو بہت زیادہ ہے۔ اور تمھاری جھولی خالی ہے۔ اگر میرا وصل چاہتے ہو تو ڈھیر سا سونا چاندی لاؤ ورنہ اپنی راہ لو اور یونہی عشق میں آہیں بھرتے رہو۔

شیخ نے کہا: تو ہر گھڑی ایک نیا بہانہ تراشتی ہے اور پچھلا وعدہ بھول جاتی ہے۔ ذرا یہ تو سوچ میں نے تیرے عشق میں کیا کیا دکھ جھیلا اور کیسی کیسی قربانی دی، اب میں یکہ و تنہا رہ گیا ہوں۔ میرے سارے دوست دشمنی پر اتر آئے ہیں۔

تو چنین، ایشان چنین، من چون کنم چون نہ دل باشد نہ جان، من چون کنم

تیری بے رخی کا یہ عالم ہے اور دوستوں کی سرد مہری کا وہ حال،
بتا میں کیا کروں، اب نہ دل ساتھ دیتا ہے اور نہ دماغ۔

شیخ کی بات سن کر لڑکی کا دل پسیجا۔ اس نے کہا: اچھا، تمھارے پاس دولت نہیں تو سال بھر تک میرے سور چراؤ اس کے بعد ہم دونوں شادی کرلیں گے۔

شیخ صنعان نے حسینہ کی اس شرط کو بھی منظور کرلیا اور اگلے روز سے سور چرانا شروع کردیا۔ ساتھیوں کو پتہ چلا تو وہ شیخ کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب کعبہ کی راہ لیں کیونکہ شیخ کے ساتھ قیام بیفائدہ ہے۔ آخر ایک مرید شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: یا تو آپ ہمارے ساتھ خانۂ کعبہ چلئے یا اجازت دیجئے ہم لوگ بھی آپ کے رنگ میں رنگ کر نصرانی مذہب اختیار کرلیں، ہم کب تک اس گومگو میں رہیں، بہتر ہے کعبہ کی راہ لیں۔

شیخ نے کہا: جب تک میری جان میں جان ہے اس نصرانی حسینہ کا عشق میرا دین ایمان ہے۔ لیکن چونکہ تم لوگ میرا درد نہیں سمجھتے اس لئے میرا ساتھ نہیں دے سکتے

میری طرف سے مریدوں سے کہہ دو کہ وہ خانہ کعبہ لوٹ جائیں اور اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دیں شیخ صنعان ایک نصرانی حسینہ کی زلف گرہ گیر میں گرفتار ہو کر دین ایمان تج بیٹھے ہیں ۔

یہ کہہ کر شیخ نے مریدوں کو خداحافظ کہا اور سوروں کے گلہ میں جا ملے ۔ ان کے مرید بھی درد بھرے دل کے ساتھ کعبہ کو لوٹ گئے ۔

کعبہ میں شیخ صنعان کا ایک ساتھی تھا ۔ جب شیخ وہاں سے چلے تھے تو وہ ساتھی موجود نہیں تھا ۔ وہ سفر سے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ شیخ صنعان خانہ کعبہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں ۔ اس نے شیخ کے بارے میں پوچھا تو مریدوں نے ان کی داستان عشق سنائی اور یہ کہا کہ شیخ نہ صرف گرفتار عشق ہیں بلکہ معشوق کے ایما پر انھوں نے شراب پی ، بت کو سجدہ کیا ، اسلام ترک کیا اور آج کل اس کے سور چرا رہے ہیں ۔

شیخ کے ساتھی کو یہ باتیں سن کر بڑا دکھ ہوا ۔ اس نے مریدوں کو سرزنش کی اور کہا کہ تم نے کیا خوب شیخ کا ساتھ نباہا ۔ انھیں ایسے خطرے میں تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ وفاداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم سب کے سب شیخ کی طرح زنار پہن لیتے اور نصرانی مذہب اختیار کر لیتے ۔

مریدوں نے کہا : ہم اس کے لئے بھی تیار تھے ۔ مگر شیخ نے اس کی اجازت نہیں دی انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ہماری رفاقت سے وہ دوبارہ راہ راست پر نہیں آ سکتے ۔

وہ ساتھی بولا : آؤ ، خدا کی طرف رجوع کریں اور اس کی بارگاہ میں شیخ کے لئے دعا کریں ۔

مریدوں نے دوبارہ روم کا قصد کیا اور وہاں پہونچ کر ایک خفیہ جگہ معتکف ہو گئے

چالیس دن اور چالیس رات وہ سب کے سب خدا کے حضور میں گڑگڑاتے رہے اور شیخ کی ہدایت کی دعا مانگتے رہے۔ اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی آنکھ نہیں لگی اور نہ ایک گھونٹ پانی ان کے حلق سے نیچے اترا۔ آخر خدا نے مریدوں کی گڑگڑاہٹ سنی اور ان کی دعا قبول کی۔

اسی دوران شیخ کے دوست کو کشف ہوا کہ شیخ ضلالت وگمراہی کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں اور ان کے دل سے کفر کا غبار دھل گیا ہے۔ دوست خوشی سے بیہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو اس نے مریدوں سے کشف کی بات کہی مرید روتے دھوتے شیخ کے پاس پہونچے۔ وہاں پہونچ کر دیکھا کہ شیخ نے زنار اتار پھینکی ہے، نصرانی لباس چاک کر دیا ہے اور کفر چھوڑ کر دوبارہ اسلام کی طرف آگئے ہیں۔ جہل وگمراہی کے بادل چھٹ گئے ہیں اور انھیں قرآن وحدیث کی باتیں پھر یاد آگئی ہیں۔

شیخ کو اپنی قلب ماہیت کا احساس ہوا تو وہ سجدۂ شکر میں گر پڑے۔ مریدوں نے انھیں تسلی دی اور کہا: خدا کا شکر ہے کہ آپ کی زندگی پر کفر کی جو تاریکی چھائی تھی وہ دور ہو گئی۔ اور آپ دوبارہ راہ راست پر آگئے۔ خدا کے حضور میں توبہ و استغفار کیجئے۔ خدا غفور و رحیم ہے۔

شیخ نے اپنا پرانا خرقہ پہنا اور مریدوں کے ساتھ کعبہ کی راہ لی، ادھر وہ نصرانی لڑکی سو کر اٹھی تو اس کا دل آفتاب کی طرح روشن تھا اور ایک الہامی آواز اس کے کان میں گونج رہی تھی کہ جلدی سے جا اور جا کر شیخ کا دامن پکڑ لے۔ تو نے پہلے شیخ کو اپنی راہ پر لگایا تھا، اب جا کر شیخ کی راہ اختیار کر اور ان کی رفیق حیات بن جا۔

لڑکی اس الہامی آواز کو سن کر تڑپ اٹھی۔ اسے کسی پہلو قرار نہیں تھا، آسمانی

آواز نے اس کی کایا پلٹ کر دی تھی۔

عالمی کانجا نشان راہ نیست　　گنگ باید شد، زبان آگاہ نیست

وہ ایک ایسی منزل میں تھی جہاں سب راستے پہونچ کر ختم ہو جاتے ہیں
وہ ایک ایسے عالم میں تھی جہاں الفاظ جذبات کا ساتھ نہیں دیتے۔

اب وہ مغرور نصرانی لڑکی سراپا عجز و نیاز تھی۔ جوانی کے الھڑ پن کی جگہ غم و اندوہ نے لے لی، اس کی دیوانگی کا یہ حال ہوا کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے دوڑ پڑی، اس کی فریاد میں ایک درد تھا، بس وہ یہی چاہتی تھی کہ جیسے بھی ہو جلد سے جلد شیخ تک پہونچ جائے۔

ہر زمان می گفت با عجز و نیاز　　کای کریم راہ دان کارساز
عورتی درماندہ و بیچارہ ام　　از دیار و خانمان آوارہ ام

وہ گھڑی گھڑی خدا کے حضور میں عجز و نیاز کے ساتھ یہ دعا کرتی تھی کہ اے بگڑی کو بنانے والے، میں ایک بے درد، بے گھر اور درماندہ عورت ہوں۔

مرد راہ چون توئی را رہ زدم　　تو مزن بر من کہ بی آگہ زدم

میں نے نادانستہ تیرے ایک برگزیدہ بندے کو گمراہ کیا۔ خدایا تو مجھے معذور سمجھ۔

ہر چہ کردم بر من مسکین مگیر　　دین پذیرفتم، مرا بی دین مگیر

میں نے جو کچھ کیا مجھے عاجز سمجھ کر تو میری توبہ قبول کر لے۔

شدہ شدہ شیخ تک خبر پہونچی کہ لڑکی نصرانیت سے تائب اور اسلام پر مائل ہو گئی ہے۔ شیخ مریدوں کے ساتھ اس کے پاس گئے دیکھا وہ غم سے نڈھال ہے۔ اس

نے دیوانوں کی طرح اپنا لباس چاک کر ڈالا ہے اور اسے سر پیر کا ہوش نہیں ہے۔
لڑکی شیخ کو دیکھتے ہی بیہوش ہوگئی۔ شیخ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ لڑکی کو ہوش آیا تو وہ شیخ کے قدموں میں گر گئی اور ان سے درخواست کی کہ اسے مشرف بہ اسلام کرلیں
شیخ صنعان نے اس لڑکی کو مسلمان کیا۔ مریدوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکی اسلام لا چکی تو شیخ سے بولی: اب میں اپنے محبوب سے زیادہ دیر جدا نہیں رہ سکتی۔ میں اس مصیبت بھری دنیا سے جا رہی ہوں۔ میری خطا معاف کرنا۔
یہ کہہ کر وہ موت کی آغوش میں سو گئی،

گشت پنہان آفتابش زیر میغ   جان شیرین زو جدا شد ای دریغ

افسوس، اس کی زندگی کا آفتاب گہنا گیا اور اس نے اپنی جان شیریں جان آفریں کے حوالے کر دی۔

قطرہ ای بود او درین بحر مجاز   سوی دریای حقیقت رفت باز

وہ جب تک مجاز کے سمندر میں تھی، قطرہ تھی، دریائے حقیقت میں مل کر پھر دریا بن گئی۔

داستان سیاوش

حکیم ابوالقاسم فردوسی ایران کا سب سے عظیم رزمیہ شاعر ہے۔ فردوسی طوس کے ایک متمول دہقان گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ ۳۵ سال تک شاہنامہ سرائی میں مصروف رہا اور بالآخر ۴۰۰ ہجری میں اسے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔

شاہنامہ ایران کا سب سے بڑا ادبی شاہکار ہے اور عالمی رزمیہ شاعری میں اہم مقام رکھتا ہے۔ شاہنامہ میں ایران کی قدیم تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ تاریخ ایرانی نسل کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور ساسانی سلطنت کے زوال پر ختم ہوتی ہے

شاہنامہ میں جو واقعات درج ہیں ان میں بعض صرف افسانوی ہیں لیکن بعض واقعات میں تاریخی صداقت ہے۔ افسانوی داستانوں میں بیژن اور منیژہ کی داستان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ تاریخی داستانوں میں سکندر، بہرام گور اور پیدائش شطرنج کی داستانیں اہمیت کی حامل ہیں۔



داستان سیاوش

۱

شاہ ترکان سخن مدعیان می شنود	شرمی از مظلمۂ خون سیاوشش باد

(حافظ)

ترکوں کے بادشاہ افراسیاب نے دشمنوں کے کہنے میں آکر سیاوش کا

خون ناحق اپنی گردن پر لے لیا اور ذرا نہ شرمایا۔

بھور ہو رہی تھی، مرغ کی بانگ فضا میں گونج رہی تھی۔ گیو، گودرز، طوس اور ایران کے چند اور نامی پہلوان شکار کو چلے۔ ان کے ہاتھوں پر شکاری باز اور زنجیر میں پھرتیلے چیتے تھے۔ انھوں نے خوب شکار کھیلا۔ شکار کھیلتے کھیلتے وہ اپنی سرحد پار کرکے توران کے جنگل میں جا پہونچے۔ طوس اور گیو گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگل میں دور تک چلے گئے۔ اچانک ان کی نظر ایک حسینہ پر پڑی۔ لڑکی کو دیکھ کر دونوں پہلوان مبہوت ہو گئے۔ پہلوانوں نے لڑکی سے پوچھا، تو کون ہے، اور کہاں سے آئی ہے؟

لڑکی آہ بھر کر بولی: کل رات میرا باپ نشہ میں دھت گھر پہونچا اور مجھ پر بری طرح گرجنے لگا۔ یہی نہیں وہ زہر میں بجھی ہوئی تلوار لے کر مجھ پر جھپٹا کہ میرا سر تن سے جدا کر دے۔ مجھے اس وقت کچھ نہیں سوجھا، بھاگ کر اس جنگل میں آ گئی۔ میں جس گھوڑے پر سوار تھی وہ بھی تھک ہار کر ساتھ چھوڑ گیا۔ میرے پاس جو زر و جواہر تھے، ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، اب میں جان بچا کر یہاں چھپی بیٹھی ہوں۔

پہلوانوں نے لڑکی سے اس کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ بولی:

میں گرسیوز کی بیٹی اور افراسیاب کی بھتیجی ہوں۔

یہ بات سن کر طوس اور گیو آپس میں جھگڑنے لگے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعویدار تھا کہ لڑکی کو پہلے میں نے دیکھا ہے اس لئے وہ میری ملکیت ہے۔ جھگڑا اتنا بڑھا کہ دونوں نے فیصلہ کیا لڑکی ہی کو جان سے مار دیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

اتنے میں دوسرے پہلوان آپہونچے۔ ان میں سے ایک بیچ بچاؤ کرتے ہوئے بولا: اسے شاہ ایران کے پاس لے چلو، وہ جو حکم دے تم دونوں مان لو۔

طوس اور گیو اس ماہرو کو ایران کے بادشاہ کاؤس کے پاس لے گئے۔ کاؤس لڑکی کو دیکھتے ہی اس پر ریجھ گیا، اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو بادشاہ نے اسے اپنی ملکہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ کاؤس نے اپنے سپہ سالاروں کو دس عمدہ گھوڑے اور دوسرے گراں بہا تحفے دے کر راضی کر لیا کہ وہ لڑکی سے دست بردار ہو جائیں۔

اس طرح وہ حسینہ شاہی حرم میں داخل ہوئی۔ نو مہینے کے بعد اس کے بطن سے ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ کاؤس کو لڑکے کی ولادت کی خبر ملی تو بیحد خوش ہوا، اس کو بچے سے والہانہ لگاؤ تھا۔ نوزاد کا نام سیاوش رکھا گیا۔

بادشاہ نے منجموں کو بلایا تاکہ سیاوش کا زائچہ تیار کریں۔ منجم سیاوش کا طالع دیکھ کر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ لڑکے کا مستقبل تاریک تھا اور اس کی زندگی پر بدقسمتی کے بادل منڈلا رہے تھے۔

سیاوش کچھ بڑا ہوا تو بادشاہ نے اسے رستم کے سپرد کیا کہ اسے زابلستان لے

جائے اور قواعد جنگ کی تعلیم دے۔ رستم نے بڑی لگن سے سیاوش کی تربیت کی، اسے شہ سواری، تیر اندازی اور محفل کے آداب سکھائے۔ رستم کی تربیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ سیاوش بزم ورزم کے آداب میں تمام ایرانی سرداروں سے بازی لے گیا۔

ایک روز سیاوش نے رستم سے کہا: اب میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھے شاہی آداب سکھانے میں جو زحمت اٹھائی ہے اور مجھے طرح طرح کے علوم و فنون سکھائے ہیں، میں چاہتا ہوں بادشاہ کو یہ سب جاکر بتاؤں۔

رستم نے سیاوش کی خواہش منظور کی اور حکم دیا کہ سفر کی تیاری کی جائے۔ نوکروں نے حکم کی تعمیل کی۔ شہزادہ سیاوش اور سپہ سالار رستم اپنے مخصوص لباس میں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور پوری فوج کے ہمراہ کاؤس کے دربار کو روانہ ہوئے

کاؤس کو بیٹے کے آنے کی خبر ملی تو اس نے اپنے ممتاز سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ شہزادے کے استقبال کے لئے جائیں اور اس کے اوپر سے زر و جواہر نثار کرتے ہوئے دربار تک لائیں۔ نوجوان شہزادہ باپ کے حضور میں پہونچا۔ کاؤس بیٹے کا نکلتا ہوا قد دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے اور کیسا سمجھ دار۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ بیٹے کو گلے سے لگایا اور اپنے پہلو میں تخت پر بٹھایا۔

کاؤس نے حکم دیا کہ اس موقع پر ساری بادشاہت میں شاندار جشن منایا جائے شراب کے پیمانے لنڈھائے جائیں اور نغمہ و موسیقی کی محفلیں سجائی جائیں۔

یہ جشن ایک ہفتہ تک چلتا رہا۔ کاؤس نے خزانوں کے منھ کھول دئے۔ بادشاہ نے اپنے چہیتے بیٹے کو زر و جواہر، حریر و پرنیاں، اسپ و یراق اور تیر و ترکش سے مالا مال کر دیا۔ اس کے علاوہ ریشم پر کہستان کی حکومت کا پروانہ لکھوا کر اسے عطا کیا۔

سیاوش کے آجانے سے کاؤس کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ، ایک دن وہ اپنے نوجوان بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ادھر سے سودابہ آنکلی جو شاہ ھاماوران کی بیٹی اور کاؤس کی ملکہ تھی ، اس نے سیاوش پر للچائی نظریں ڈالیں۔ سودابہ کے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے انگڑائی لی ۔ اس نے خفیہ طور پر سیاوش کو یہ پیغام بھجوایا کہ رات کو چھپ کر میری خواب گاہ میں آجا ۔ سیاوش نے کہلوا دیا کہ میں ان بہلاووں میں آنے والا نہیں ہوں ۔

سودابہ نے یہ جواب سنا تو بادشاہ کے پاس گئی اور بولی کہ سیاوش کی بہنیں اس سے ملنے کی مشتاق ہیں ۔ اگر جہاں پناہ اسے حرم سرا میں بھیج دیں تو بہنوں کی یہ آرزو پوری ہو جائے گی ۔ کاؤس کو سودابہ کی بات پسند آئی ۔ اس نے سیاوش سے کہا : حرم سرا میں جاکر بہنوں سے مل آؤ ۔

پس پردۂ من ترا خواہر است   چو سودابہ خود مہربان مادر است

کاؤس نے کہا کہ شاہی حرم سرا میں تیری بہنیں بھی رہتی ہیں ۔ ان کے علاوہ ملکہ سودابہ ہے جو تیری اپنی ماں کی طرح شفیق و مہربان ہے ۔

پس پردہ پوشیدگان را ببین   زمانی بمان تا کنند آفرین

جاؤ جاکر شاہی خواتین کے پاس تھوڑا وقت گذارو تاکہ انھیں کوئی گلہ نہ رہے

سیاوش نے دل میں سوچا بادشاہ اس طرح میرا امتحان لینا چاہتا ہے ، اس نے عرض کیا : جہاں پناہ مجھے حرم سرا میں بھیجنے کے بجائے تجربہ کار بزرگوں اور جنگ آزمودہ سپہ سالاروں کے پاس بھیجیں تو بہتر ہے ۔

چہ آموزم اندر شبستان شاہ   بہ دانش زنان کی نمایند راہ

میں شاہی حرم سرا میں کیا نئی بات سیکھوں گا۔ عورتیں بھلا کب عقل کی راہ دکھاتی ہیں۔

بادشاہ سیاوش کے جواب سے خوش ہوا مگر اس نے پھر کہا کہ حرم میں جاکر بہنوں اور بچوں سے مل آؤ۔

آخر کار سیاوش حرم سرا میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے ہیربد حاجب کو حکم دیا کہ شہزادے کو حرم تک لے جائے۔ شہزادے نے حرم کے اندر قدم رکھا تو تمام خواتین اس کے استقبال کو لپکیں۔ سیاوش نے دیکھا پورے محل میں مشک و زعفران کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ مدھر موسیقی فضا میں گونج رہی ہے۔ ایوان میں ایک سنہرا تخت ہے جس پر دیبا و حریر کے فرش بچھے ہیں۔ تخت پر ملکہ سودابہ پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہے اور اس کے چاروں طرف حسین لڑکیوں کا جھرمٹ ہے،

سیاوش کو دیکھتے ہی سودابہ تخت سے اتر کر نیچے آئی اسے گلے لگایا اور اس کے رخسار اور آنکھوں کو بوسہ دیا۔ وہ برابر سیاوش کو دیکھے جا رہی تھی جیسے اسے کبھی سیری نہیں ہوگی ملکہ بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اسے ایسا خوبصورت بیٹا عنایت کیا ہے۔

سیاوش سمجھ رہا تھا کہ سودابہ کا لاڈ پیار کھوکھلا ہے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی بہنوں کے پاس گیا۔ بھائی کو دیکھ کر سبھی بہنیں خوش ہوئیں اسے ایک سنہری کرسی پر بٹھایا سیاوش کافی دیر تک بہنوں کے پاس رہا۔ اس کے بعد باپ کے پاس لوٹ آیا اور بولا: خدا نے آپ کو نیکی کے سارے مواقع عطا کئے ہیں، پھر آپ کی طرف سے تغافل کیوں ہے؟ کاؤس بیٹے کی بات سن کر خوش ہوا۔ رات کو وہ شبستان میں پہونچا تو سودابہ سے

پوچھا: سیاوش ذہانت اور ادب آداب میں کیسا ہے ؟

سودابہ نے کہا: سیاوش کا واقعی جواب نہیں۔ اس نے بادشاہ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر سیاوش راضی ہو تو میں اپنی ایک بیٹی سے اس کی شادی کر دوں تاکہ میرا نواسہ واقعی نجیب الطرفین ہو۔

کاؤس کو سودابہ کی تجویز پسند آئی مگر جب اس نے سیاوش کو یہ بات بتائی تو وہ بولا: میں بادشاہ کے حکم کا غلام اور حضور کے فرمان کا تابع ہوں، لیکن سودابہ سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتا، اور نہ اس کے شبستان میں جانا چاہتا ہوں،

سیاوش کی بات سن کر بادشاہ ہنس پڑا۔ وہ سودابہ کی گھاتوں کو نہیں سمجھتا تھا اس نے بیٹے کو اطمینان دلایا کہ سودابہ نے خلوص میں یہ باتیں کی ہیں۔ اس پر شک کرنا مناسب نہیں، سیاوش بظاہر مطمئن ہو گیا مگر اس کے دل میں خلش باقی رہی۔

صبح ہوئی تو سودابہ نے اپنی لڑکیوں کو بلایا۔ خود سرخ یاقوت کا تاج پہن کر تخت پر جلوہ افروز ہوئی اور ہیر بد حاجب کو بھیجا کہ سیاوش کو بلا لائے۔ سیاوش پہونچا تو سودابہ نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ شہزادے کو تخت پر بیٹھایا اور خود دست بستہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے لڑکیوں کو اشارہ کیا کہ ایک ایک کر کے سیاوش کے سامنے سے گذریں اور سیاوش سے درخواست کرتے ہوئے بولی کہ جو لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت ہو اسے اپنے لئے انتخاب کر لے۔

سیاوش نے لڑکیوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ لڑکیاں چلی گئیں۔ سودابہ تنہا رہ گئی۔ اب وہ مٹک کر سیاوش سے بولی:

ازین خوبرویان بہ چشم خرد نگہ کن کہ با تو کہ اندر خورد

ان حسینوں کو غور سے دیکھ کر بتا کون تیری ہمسری کے لائق ہے۔

سیاوش کا دل حب وطن سے سرشار تھا۔ وہ سودابہ کی چالوں میں نہیں آیا اسے یاد آیا کہ سودابہ کے باپ ہاماوران نے کس طرح دھوکا دے کر اس کے باپ کاؤس کو قید کیا تھا۔ اب اگر سودابہ کی بیٹی بھی اسی کی طرح حرفوں کی بنی ہے تو شاہی خاندان کا خدا حافظ۔

سودابہ نے دیکھا سیاوش خاموش ہے اور کسی بات کا جواب نہیں دے رہا ہے آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائی اور طرح طرح کی اداؤں سے سیاوش کا دل لبھانے لگی۔ وہ بولی: تو نے جن لڑکیوں کو دیکھا وہ حسین ضرور ہیں مگر میں ان حسینوں کی سرتاج ہوں، میرا ان کا کیا مقابلہ؟

کسی کو چو من دید بر تخت عاج زیاقوت و پیروزہ بر سرش تاج
نباشد شگفت ار بہ مہ ننگرد کسی را بخوبی بہ کس نشمرد

جس نے مجھ کو یاقوت و فیروزہ کا تاج پہنے تخت عاج پر بیٹھے دیکھا ہے، اگر وہ چاند اور دنیا کے تمام حسینوں پر خاک ڈال دے تو تعجب نہیں کرنا چاہئے۔

سودابہ بولی: تو میری کسی بھی لڑکی سے شادی کر لے لیکن یہ وعدہ کر کہ مجھے تیری خلوت میں ہمیشہ بار ہو گا۔

من اینک بنزد تو استادہ ام تن و جان شیرین ترا دادہ ام

میں اپنا جسم اور اپنی روح تیرے سپرد کر کے تیرے قریب آئی ہوں۔

ز من ھر چہ خواہی ہمہ کام تو برآرم، نپیچم سر از دام تو

میں تیری ہر خواہش کے سامنے سراپا تسلیم و اطاعت ہوں۔

یہ کہہ کر سودابہ نے سیاوش کو اپنے سینے سے بھینچ لیا اور ہوسناک انداز میں اس کے رخسار اور ہونٹوں کو چومنے لگی۔ سیاوش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور اس نے دل میں کہا: یہ عورت لاکھ ورغلائے میں شیطانی وسوسوں میں آکر باپ کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔

اس شرافت نفس کے باوجود سیاوش نے سوچا کہ اگر اس بے شرم عورت سے سختی سے پیش آؤں تو ممکن ہے جادو ٹونا کر کے بادشاہ کو اپنا ہمنوا بنالے۔ مصلحت یہی ہے چکنی چپڑی باتوں سے اسے بہلائے رہوں۔ چنانچہ سیاوش بولا: میں تیری بیٹی کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گا لیکن یہ دھیان رہے کہ تیرے عشق کا راز کسی پر فاش نہ ہو۔ تو شاہی خواتین کی سرتاج اور ملکۂ ایران ہے بلکہ اوروں کی نظر میں میری ماں ہے۔

سیاوش یہ کہہ کر رخصت ہوا۔ رات کو کاؤس سودابہ کے محل میں پہونچا تو ملکہ نے یہ خوشخبری سنائی کہ سیاوش نے تمام حسین لڑکیوں میں صرف میری بیٹی کو پسند کیا ہے۔ کاؤس یہ سن کر خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا خزانے کے منہ کھول دئے جائیں اور زر و جواہر تاج و طوق اور دیبا و حریر کا ڈھیر لگا دیا جائے۔ یہ زرق برق دیکھ کر سودابہ کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے سیاوش کو بلوا بھیجا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے بولی: بادشاہ نے تجھے اتنا خزانہ بخشا ہے کہ اسے دو سو ہاتھیوں پر لادا جائے گا۔ لیکن میں تجھے اس سے زیادہ خزانہ دوں گی اور ساتھ میں اپنی حسین بیٹی بھی، اب بتا تیرے لئے کیا عذر ہے۔ کیا اب بھی تو میری محبت کو نظر انداز کرے گا؟

یہ کہہ کر سودابہ سیاوش کے قدموں میں گر پڑی اور اس سے منت و زاری کرنے لگی کہ

تا من ترا دیدہ ام ، مردہ ام خروشان و جوشان و آزردہ ام

میں نے جب سے تیرا جلوہ دیکھا ہے تجھ پر مرمٹی ہوں اور اپنے جذبات کے
جوش اور ہیجان سے پریشان ہوں۔

همی روز روشن نبینم ز درد   بر آنم که خورشید شد لاجورد

درد کے مارے دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے
سورج اپنی روشنی کھو بیٹھا ہے۔

یکی شاد کن در نهانی مرا   ببخشای روز جوانی مرا

ایک لمحہ کے لئے میرے دل کی حسرت نکال کر مجھے میری کھوئی ہوئی جوانی
واپس دیدے

سودابہ نے اس عجز و التماس کے ساتھ ساتھ سیاوش کو دھمکی بھی دی کہ اگر میری
بات نہیں مانی تو تیری زندگی اجیرن کر دوں گی۔

سودابہ کی جسارت دیکھ کر سیاوش شرم سے گڑ گیا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو
سنبھالا اور سودابہ کو اپنے سے دور ہٹاتے ہوئے بولا: یہ ممکن نہیں کہ میں دل کی ہوس پر
دین کو قربان کر دوں اور باپ کے حق میں خیانت کر کے عقل اور ہمت دونوں کو بالائے
طاق رکھ دوں۔ آخر تو ملکۂ ایران ہے، یہ کام تیرے لئے زیبا نہیں۔

یہ کہہ کر سیاوش غصہ میں تخت سے اٹھا اور دروازے کی طرف چلا مگر سودابہ اسے
پکڑ کر جھول گئی اور کہنے لگی: میں تجھ سے اپنے دل کا راز کہہ چکی ہوں، اب تو مجھے رسوا
کرنا چاہتا ہے؟

یہ کہہ کر سودابہ نے اپنے کپڑے پھاڑ لئے اور چیخنے چلانے لگی۔ اس کی چیخ پکار
کاؤس کے کانوں تک پہونچی تو وہ فوراً سودابہ کی خوابگاہ میں آیا۔ وہاں جاکر دیکھا،

ملکہ کا حال خراب ہے ، بال الجھے اور کپڑے پھٹے ہوئے ہیں ۔ سودابہ نے کاؤس کو دیکھ کر اپنا چہرہ اور بال اور نوچ لئے اور بولی : دیکھ تیرا بیٹا مجھ پر بری نظر لگائے ہے ۔ پہلے اس نے مجھ پر دست درازی کی اور میرے جسم کو بھنبھوڑا ۔ اس کے بعد اس نے میرا تاج اتار کر پھینک دیا اور میرے کپڑے چاک کر دئے ۔

بادشاہ یہ باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا ۔ اس نے سیاوش کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا : اصل ماجرا کیا ہے ؟

جو کچھ ہوا تھا سیاوش نے صحیح صحیح بیان کر دیا اور بولا : میں نے سودابہ کو نہیں بلکہ سودابہ نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن سودابہ صاف مکر گئی اور کہنے لگی : میں نے اس سے کہا میں بہت سارے زر و جواہر دے کر اپنی لڑکی تجھ سے بیاہنا چاہتی ہوں مگر وہ راضی نہیں ہوا اور بولا مجھے نہ مال و دولت درکار ہے اور نہ تیری لڑکی ، مجھے صرف تو چاہیئے تو ۔ اس کے بعد وہ کہنے لگی : جہاں پناہ میں آپ سے حاملہ ہوں لیکن آج سیاوش نے میرے ساتھ وہ زیادتی کی کہ مجھے لگا میرا بچہ جاتا رہے گا ۔

کاؤس سوچنے لگا گناہگار کا پتہ کیسے چلایا جائے ۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی ، اس نے پہلے سیاوش کے تمام جسم کا بوسہ لیتے ہوئے اسے سونگھا ۔ اس نے دیکھا سیاوش نے اپنے جسم پر کوئی عطر یا خوشبو نہیں لگائی ہے ۔ اب وہ سودابہ کے نزدیک گیا ۔ ملکہ کا سارا بدن مشک و گلاب سے گمک رہا تھا ۔ یہ دیکھ کر کاؤس کو بڑا دکھ ہوا ۔ گناہ ملکہ نے کیا ہے ۔ اس کے جی میں آیا سودابہ کو ابھی موت کے گھاٹ اتار دے مگر بعض مصلحتوں نے اس کا ہاتھ روکا ۔ اگر سودابہ کو قتل کیا گیا تو اس کا باپ ہاماوران ایران پر حملہ کر دے گا ۔ پھر کاؤس نے سوچا کہ جب وہ بیمار تھا تو سودابہ نے اس کی بڑی

خدمت کی تھی، پھر وہ سودابہ سے واقعی محبت کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر اسے ختم کر دیا گیا تو اس کے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا؟

کاؤس نے یہ باتیں سوچ کر سودابہ کے قتل سے چشم پوشی کی لیکن اب اس کی نظر میں ملکہ کی عزت نہیں رہی۔

سودابہ نے جب دیکھا کہ کاؤس کا دل اس سے پھر گیا ہے تو اس کے من میں کینہ بھر آیا۔ اس نے ایک نئی چال چلی۔ محل میں ایک حرافہ عورت تھی جو اتفاق سے حاملہ بھی تھی سودابہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے کچھ خفیہ باتیں کیں، پھر اسے روپیہ پیسہ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دوا دارو سے اپنا حمل گرا دے۔ تب سودابہ بادشاہ پر یہ ظاہر کرے گی کہ سیاوش کی حرکت سے اس کا بچہ جاتا رہا ہے۔

عورت نے سودابہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اتفاق سے اس کے شکم سے جڑواں بچے ساقط ہوئے۔ سودابہ نے ایک سنہرا طشت منگوایا۔ بچوں کو اس میں رکھا اور خود کپڑے پھاڑ کر چیخنے چلانے لگی۔ کاؤس اس کی فریاد سن کر فوراً شبستان میں پہونچا تو دیکھا سارے محل میں کہرام بپا ہے، سودابہ لیٹی ہوئی ہے اور ایک طشت میں دو مردہ بچے پڑے ہیں۔

بادشاہ کو دیکھ کر سودابہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بولی: سیاوش نے میرا یہ حال کیا۔ آپ کو اب بھی یقین نہیں آتا؟

کاؤس سوچ میں پڑ گیا۔ آخر یہ معما کیسے حل ہو؟ اس نے چپکے سے منجموں کو بلوایا اور ان کو سودابہ کے بچوں کی بات بتائی۔ نجومیوں نے ایک ہفتہ کے بعد بادشاہ کو خبر دی کہ وہ دونوں بچے کسی اور کی اولاد سے ہیں، آپ اور ملکہ ان کے ماں باپ نہیں ہیں۔

یہ سن کر کاؤس کو اور فکر ہوئی، اصل ماجرا کیا ہے، کیسے معلوم ہو۔ آخر اس نے

موبدوں کو بلایا اور ان سے سودابہ اور سیاوش کے بارے میں مشورہ کیا۔موبدوں نے کہا دونوں کی اگنی پریکشا (آگ کا امتحان) کی جائے تاکہ معلوم ہوسکے کون گنہگار ہے اور کون بے گناہ ۔ بے گناہ کو آگ کبھی نہیں جلاتی ۔

بادشاہ نے سودابہ اور سیاوش کو اپنے پاس بلایا اور ان سے اگنی پریکشا کی بات کی۔سودابہ پہلے ہی دل میں ڈری ہوئی تھی اس نے فوراً اپنے بچوں کی بات نکالی اور خود کو بے گناہ ثابت کرنے لگی اس نے کہا اگر آگ کا امتحان مقصود ہے تو پہلے سیاوش کو آگ میں گذاریئے۔بادشاہ سلامت نے خود اپنی آنکھ سے میرے دو مردہ بچے دیکھے ہیں، اس سے زیادہ سیاوش کے جرم کا اور کیا ثبوت ہوگا۔

سیاووش را رفت باید نخست　　　　که این بد بکرد و تباہی بجست

پہلے سیاوش کو آگ سے گذرنا چاہیئے کیونکہ گناہ اس نے کیا ہے اور مصیبت کا سبب وہ ہے۔

ادھر سیاوش اگنی پریکشا کے لئے فوراً تیار ہوگیا اور بادشاہ سے بولا :

اگر کوہ آتش بود ، بسپرم　　　　ازین ننگ خوار ایست گر بگذرم

میرے سامنے آگ کا پہاڑ ہو تو طے کرنے کے لئے تیار ہوں مگر اس ذلت ورسوائی کو جھیلنے کے لئے حاضر نہیں۔

کاؤس نے حکم دیا اونٹوں کے سو قافلے لکڑیاں جمع کریں۔لکڑیوں کے دو ٹیلے بنائے گئے۔سارا شہر اگنی پریکشا دیکھنے کے لئے امنڈ پڑا۔ہر شخص سودابہ پر لعنت بھیج رہا تھا۔سچ ہے :

بہ گیتی بجز پارسا زن مجوی　　　　زن بدکنش خواری آرد بہ روی

دنیا میں پاکدامن بیوی کی تلاش کرو۔ بدکار عورت سے سوائے ذلت و
رسوائی کے اور کچھ نہیں ملے گا۔

لکڑیوں کا ڈھیر بن گیا تو بادشاہ نے حکم دیا ان پر تیل انڈیل کر آگ لگا دی جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ روشنی کا یہ عالم تھا کہ رات دن کی طرح منور تھی۔ سبھی تماشائی سیاوش کی بدقسمتی پر آنسو بہا رہے تھے

اتنے میں سیاوش اپنے مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر بادشاہ کی طرف چلا۔ اس کے سر پر سنہری خود اور جسم پر سفید لباس تھا۔ ہونٹوں پر امید و عزم کی مسکراہٹ تھی۔ باپ کے قریب پہونچ کر شہزادہ گھوڑے سے اترا اور کورنش بجالایا۔ اس نے دیکھا بادشاہ کچھ نادم سا ہے۔ سیاوش بولا: خدارا غم نہ کیجئے، زمانے کی گردش کا یہی دستور ہے

سری پر ز شرم و تباہی مراست   اگر بے گناہم ، رہائی مراست

شرمندگی اور مصیبت تو میرے سر پر ہے ، ہاں اگر میں بے گناہ ہوں تو
مجھے اس عذاب سے نجات مل جائے گی۔

یہ کہہ کر سیاوش نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آگ کی طرف روانہ ہوا۔ دل ہی دل میں اس نے خدا سے دعا کی۔ ادھر سودابہ محل کی چھت سے لپکتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ سیاوش آگ میں جل کر بھسم ہو جائے

سبھی تماشائی سیاوش کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں غصہ تھا مگر آنکھیں اشکبار تھیں۔ اتنے میں سیاوش گھوڑا سمیت آگ میں کود پڑا اور لپکتے ہوئے شعلوں سے یوں گذرنے لگا گویا آگ نہیں گلزار ہے۔ آگ کے شعلے آسمان تک پہونچ رہے تھے۔ انھوں نے سیاوش اور اس کے گھوڑے کو اپنی آغوش میں چھپالیا

لوگ اس امید و بیم میں تھے کہ دیکھیں سیاوش آگ سے کب باہر آتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد سیاوش مسکراتے ہوئے آگ سے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر لوگ خوشی سے چلانے لگے۔ اس کے لباس یا گھوڑے پر آنچ نہیں آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ آگ سے نہیں بلکہ گلزار سے ہو کر آیا ہے۔

سیاوش کو صحیح سالم دیکھ کر لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور خدا کا شکر ادا کرنے لگے کہ اس نے ایک بے گناہ کو عذاب سے بچا لیا۔ لیکن ادھر سودابہ غصہ میں اپنے بال نوچ رہی تھی اور ٹسوے بہا رہی تھی۔ سیاوش بادشاہ کے سامنے آیا بادشاہ نے دیکھا اس کے جسم اور لباس پر آگ، دھواں یا گرد و خاک کا کوئی نشان نہیں ہے۔ کاؤس بھی گھوڑے سے اترا، بیٹے کو سینے سے لگایا اور اس کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں تین دن تک جشن مناتا رہا۔

اب بادشاہ نے اپنے امرا سے سودابہ کے بارے میں مشورہ کیا۔ سب نے کہا وہ موت کی مستحق ہے۔ بادشاہ نے دل پر جبر کر کے حکم دیا کہ ملکہ کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے بادشاہ کا حکم سن کر سیاوش سوچنے لگا کہ اگر ایک روز بادشاہ کو اپنے حکم پر ندامت ہوئی تو وہ کہے گا کہ میری وجہ سے اس کی ملکہ کی جان گئی۔ چنانچہ اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ سودابہ کو معاف کر دے، ممکن ہے آئندہ وہ اچھی باتوں پر کان دھرے اور غلط راستے کو ترک کر دے۔

آخر بادشاہ نے سودابہ کو معاف کر دیا اور اسے حرم میں بھیج دیا، کچھ ہی دن گذرے تھے کہ پھر کاؤس کے دل میں سودابہ کے عشق نے انگڑائی لی۔ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی ملکہ سے دور رہنے کو تیار نہیں تھا۔ ادھر سودابہ نے جادو ٹونا کر کے پھر بادشاہ کو

سیاوش سے بدظن کر دیا لیکن کاؤس نے اپنی بدظنی کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد ترکوں کے بادشاہ افراسیاب نے ایران پر حملہ کیا۔ کاؤس نے بیدلی سے لڑائی کی تیاری شروع کی۔ موبدوں نے اسے مشورہ دیا کہ اس حال میں بادشاہ کا میدان جنگ میں صف آرا ہونا مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے یہ کام کسی تجربہ کار سپہ سالار کے حوالے کرے۔ سیاوش نے سوچا یہ اچھا موقعہ ہے، میں خوشامد درآمد سے بادشاہ کو اس بات پر راضی کر لوں کہ مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت دیدے اس بہانے میں سودابہ اور باپ کی باتوں سے بھی محفوظ رہوں گا اور افراسیاب کے لشکر کو شکست دے کر دنیا میں نام بھی پیدا کروں گا۔

سیاوش نے باپ سے درخواست کی کہ اسے میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی جائے۔ باپ نے خوشی سے منظوری دے دی اور رستم کو بلا کر سیاوش کو اس کے سپرد کیا۔ رستم نے شاہی فرمان کے آگے سر جھکایا۔ بادشاہ نے خزانہ سے زر و جواہر اور اسلحہ خانہ سے شمشیر و سناں اور گرز و سپر نکلوا کر سپاہیوں کے حوالے کئے اور فوج کی کمان سیاوش کے سپرد کی۔ فوج روانہ ہوئی تو کاؤس خود ایک دن کی راہ تک فوج کے ساتھ گیا۔ رخصت کا وقت آیا تو باپ بیٹے بغل گیر ہوئے۔ دونوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

گواہی ہمی داد دل در شدن　　　　که دیدار ازین پس نخواہد بدن

جدائی کے وقت دونوں کا دل گواہی دے رہا تھا کہ شاید اس کے بعد ایک دوسرے کا دیدار نہ ہو۔

اس طرح باپ بیٹے ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ سیاوش اور رستم فوج

کے آگے تھے، کچھ ہی دنوں میں فوج بلخ پہونچ گئی۔

ادھر افراسیاب کو خبر پہونچی کہ رستم اور سیاوش ایک زبردست فوج لے کر آرہے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی گرسیوز کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ دروازۂ بلخ کے پاس دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ تین دن تک لڑائی ہوتی رہی، چوتھے دن سیاوش کی فوج فاتحانہ انداز میں بلخ شہر میں داخل ہوئی۔ شہزادے نے افراسیاب کو ایک خط لکھا:

به بلخ آمدم شاد و پیروز بخت　　به فر جهاندار با تاج و تخت

میں شاہانہ جلال کے ساتھ فتح کے جھنڈے لہراتا ہوا بلخ میں داخل ہوگیا ہوں

کنون تا به جیحون سپاه من است　　جهان زیر فر کلاه من است

اب یہاں سے جیحون تک میری فوج پھیلی ہوئی ہے بلکہ ساری دنیا میرے زیرِ نگیں ہے۔

افراسیاب کو سیاوش کی فتح کی خبر ملی تو وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔ اس نے حکم دیا فوری کمک ارسال کی جائے۔ رات کو وہ لیٹا تو اس کا دماغ پریشان تھا۔ ابھی رات کا کچھ ہی حصہ گذرا تھا کہ اس نے سوتے سوتے ایک چیخ ماری اور بستر سے زمین پر آرہا۔ اس کی چیخ سے سب لوگ جاگ پڑے۔ گرسیوز بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا افراسیاب بری طرح کانپ رہا ہے۔ جب وہ ذرا ہوش میں آیا تو بھائی نے پوچھا کیا بات ہے۔

افراسیاب بولا: میری پریشانی کا سبب ایک ہولناک خواب ہے، میں نے دیکھا ایک اتھاہ جنگل ہے جس میں سانپ ہی سانپ بھرے ہیں۔ زمین سے آسمان

تک گرد و غبار اٹھا ہوا ہے ۔ میرا خیمہ اسی بیابان میں لگا ہے ۔ تورانی پہلوان چاروں طرف سے اس کی حفاظت کر رہے ہیں ۔ اچانک زور کی آندھی چلی ، میرا جھنڈا نیچے آرہا اور میرا خیمہ اکھڑ گیا ۔ اتنے میں ایرانی فوج میرے اوپر ٹوٹ پڑی ۔ سپاہیوں نے مجھے تخت سے نیچے گھسیٹ لیا اور میرے ہاتھ باندھ کر کاؤس بادشاہ کے پاس لے گئے وہاں ایک سجیلا جوان کھڑا تھا ۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا اور کمر سے میرے دو ٹکڑے کر ڈالے ۔ میں درد سے چیخ پڑا اور چیخ سے میری آنکھ کھل گئی ۔

افراسیاب نے نجومیوں کو بلایا کہ اس خواب کی تعبیر بیان کریں ۔ انھوں نے پہلے جان کی امان چاہی اور پھر عرض کیا : اس ایرانی فوج کی کمان ایک بہادر شہزادہ اور ایک جہاں دیدہ سپہ سالار کر رہے ہیں ۔ نجومیوں نے افراسیاب کو آگاہ کیا کہ مبادا شہزادے کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرے ، اس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔

یہ بات سن کر افراسیاب اور بھی بد دل ہوا ۔ اس نے لڑائی کا خیال ترک کر کے صلح کی بات شروع کی ۔ اس نے سوچا مصیبت سے بچنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ جس علاقہ پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا ہے اسے ان کے حوالے کر دیا جائے ۔ چنانچہ افراسیاب نے اپنے بھائی گرسیوز کو حکم دیا کہ دریائے جیحون کی طرف روانہ ہو ۔ گرسیوز کی جلو میں ہزاروں غلام ، کنیز اور عربی گھوڑے تھے ۔ سو اونٹوں پر صرف قالین اور قیمتی فرش بار تھے اس کے علاوہ مرصع تاج تھے اور سنہری نیاموں میں رکھی ہوئی ہندی تلواریں تھیں ۔

دریائے جیحون پر پہونچ کر گرسیوز نے سیاوش کے پاس قاصد بھیجا ۔ اس کے بعد کشتی میں بیٹھ کر دریا کو عبور کیا اور شہر بلخ میں داخل ہوا ۔ سیاوش نے گرم جوشی

سے اس کا استقبال کیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا۔ گرسیوز نے پہلے گراں بہا تحائف پیش کئے اور پھر رستم و سیاوش سے درخواست کی کہ افراسیاب صلح کا خواہاں ہے۔

رستم نے ایک ہفتہ کی مہلت چاہی اور تنہائی میں سیاوش سے صلاح مشورہ کیا۔ آخر طے پایا کہ افراسیاب اپنے حسن نیت کے ثبوت میں کچھ قریبی عزیزوں کو بطور یرغمال سیاوش کے پاس بھیجے۔ علاوہ ازیں تورانیوں نے جن ایرانی علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے انھیں خالی کر کے واپس توران چلے جائیں۔

افراسیاب نے دونوں شرطیں مان لیں۔ اس نے اپنے سو عزیز بطور یرغمال بھیج دئے اور مقبوضہ شہروں کو ایرانی فوج کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد سیاوش نے رستم کو ایک خط دے کر کاؤس کے پاس بھیجا۔ شاہ ایران خط پڑھ کر خوش ہونے کے بجائے اور بھڑک اٹھا۔ اس نے رستم کو لعن طعن شروع کر دی۔ رستم نے لاکھ دلیل دی اور طرح طرح سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی مگر کاؤس نہیں مانا۔ آخر اس نے رستم سے کہا: یہ سب تیرا قصور ہے۔

که این در سر او تو افکنده ای چنین بیخ کین از دلش کنده ای

تو نے (اپنی کاہلی کے سبب) سیاوش کو جنگ سے ہٹا کر صلح کی طرف مائل کیا ہے۔

تن آسائی خویش جستی درین نه افروزش تاج و تخت و نگین

اپنی تن آسانی کی خاطر تو نے تاج و تخت کے وقار کی پروا نہیں کی۔

ترا دل بہ آن خواستہ شاد شد همه جنگ در پیش تو باد شد

تو افراسیاب کے بھیجے ہوئے تحائف کو دیکھ کر جنگ کے تقاضوں کو بھول گیا۔

اس کے بعد کاؤس نے رستم کو برطرف کر کے اس کی جگہ طوس کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ رستم کو کاؤس کی اس حرکت پر بڑا رنج ہوا۔ وہ غصہ میں دربار سے نکلا اور اپنے ملک سیستان کو چل دیا۔ ادھر کاؤس نے سیاوش کو بھی ایک غصہ بھرا خط لکھا اسے بڑی ڈانٹ پھٹکار بتائی اور اس پر یہ الزام لگایا کہ حسینوں کے جھرمٹ میں گھر کر شہزادہ جنگ بھول بیٹھا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ افراسیاب کے عزیزوں کو فوراً ایرانی دربار میں روانہ کیا جائے، صلح کے عہد و پیمان توڑ دئے جائیں۔ اور سیاوش خود دربار میں حاضر ہو۔

سیاوش کو یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ اس کے باپ نے رستم کو برطرف کر کے طوس کو فوج کا نیا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ باپ کے حکم کی تعمیل کر کے افراسیاب کے سو عزیزوں کو ایرانی دربار میں بھیج دے تو کاؤس سب کو پھانسی دے دے گا اور اگر معاہدۂ صلح توڑ کر افراسیاب سے برسرِ پیکار ہو تو سب کی نظر میں قابل ملامت ٹھہرے گا اور خدا کو بھی یہ فعل پسند نہیں آئے گا۔ اس کے علاوہ اگر وہ فوج کی کمان طوس کو سونپ کر خود دربار واپس چلا جائے تو باپ اور سودابہ کی بدی سے محفوظ نہیں رہے گا۔

یہ باتیں سوچ کر سیاوش کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے باپ کا خط فوج کے سپہ سالاروں کو دکھایا اور بولا: میں ہی بدقسمت ہوں، کسی کو کیا دوش دوں۔ یہ جو ہر آن مجھ پر ایک نئی مصیبت ٹوٹ رہی ہے اس کا ذمہ دار خود میرا مقدر ہے۔

بدان مهربانی دل شهریار بسان درختی پر از برگ و بار
چو سودابه او را فریبنده گشت تو گوئی که زهر گزاینده گشت.

میرے حق میں بادشاہ کتنا مہربان تھا اور میں اس کی نوازشوں کی
چھاؤں میں کتنا مطمئن تھا لیکن جب سے سودابہ نے اسے ورغلایا ہے
اس کا کرم میرے لئے زہر قاتل بن گیا ہے۔

شبستان او گشت زندان من　　　　به پژمرد از آن بخت خندان من

اب شاہی شبستان میرے لئے زندان ہو گیا ہے اور میری قسمت کا لہلہاتا
پھول ہمیشہ کے لئے مرجھا چکا ہے۔

سیاوش نہ تو معاہدہ شکنی اور جنگ آزمائی کے لئے تیار تھا اور نہ باپ
کے پاس لوٹنے کے لئے۔ اس کے سامنے صرف ایک راستہ تھا اور وہ یہ کہ کہیں
روپوش ہو جائے۔ اس نے سوچا کہیں ایسی جگہ جاکر روپوش ہو جاؤں کہ کاؤس
کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

سیاوش نے حکم دیا کہ افراسیاب کے پاس سے جو تحائف اور رشتہ دار
آئے ہیں انھیں واپس کر دیا جائے اور اسے نئی صورت حال کی اطلاع دیدی جائے
ایرانی سرداروں نے بہتیرا سمجھایا کہ سیاوش کے لئے تخت و تاج سے چشم پوشی
مناسب نہیں ہے مگر اس نے ان کی ایک نہ سنی۔ اور تو اور اس نے افراسیاب سے
وفاداری کا اعلان کر دیا اور اسے خط میں لکھا کہ اس جنگ سے میرے حصہ میں زہر
و تلخی کے سوا کچھ نہ آیا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایرانی تخت سے دستبردار
ہو کر تیری پناہ میں آجاؤں۔ سیاوش نے یہ بھی درخواست کی کہ وہ تورانی علاقہ
سے ہوتا ہوا کسی گوشۂ عافیت میں جا چھپے گا۔ اور وہاں سکون سے زندگی کے دن
گذارے گا۔

افراسیاب کو یہ سن کر افسوس ہوا کہ سیاوش کا ستارہ گردش میں آ گیا ہے اس نے پیران سے مشورہ کیا کہ اس بارے میں کیا کیا جائے۔ پیران نے کہا: سیاوش ایک مہذب، شائستہ اور عقل مند شہزادہ ہے۔ وہ عادات و اطوار کا سچا اور قول کا پکا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ جہاں پناہ اسے عزت آبرو کے ساتھ مدعو کر کے اپنے یہاں مہمان رکھیں۔ کاؤس کچھ عرصہ کے بعد چل بسے گا اور سیاوش ایران کے تخت و تاج کا مالک ہو گا۔ اس وقت ایران اور توران دونوں ملک آپ کے تصرف میں آ جائیں گے۔

پیران کی تجویز افراسیاب کو پسند آئی۔ اس نے سیاوش کو جواب میں لکھا کہ مجھے تیرے باپ کے سلوک پر افسوس ہے۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے:

تو فرزند من باش و من چون پدر — پدر پیش فرزند بستہ کمر

آج سے تو میرا بیٹا ہے اور میں تیرا باپ لیکن میں باپ ہوتے ہوئے بھی تیری خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

سپاہ و زر و گنج و شہر آن تست — بہ رفتن بہانہ نبایدت جست

یہ ساری فوج، خزانہ اور ملک تیرے اختیار میں ہے، اب یہاں سے واپس جانے کے لئے تیرے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔

سیاوش خط پا کر بظاہر خوش ہوا مگر وہ دل میں اداس تھا نا سے اس بات کا افسوس تھا کہ افراسیاب اگرچہ دوستی کا دم بھر رہا ہے لیکن وہ دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ آخر اس نے باپ کو اطلاع دی کہ میں آپ کی قلمرو سے خارج ہو رہا ہوں۔ اس کے بعد خود دریائے جیحون عبور کر کے افراسیاب کی مملکت میں داخل ہو گیا۔

پیران نے بڑی شان وشوکت کے ساتھ سیاوش کا استقبال کیا۔ اس کے ہمراہ ایک فوج تھی جس میں جنگی ہاتھی اور عربی گھوڑے تھے۔ آگے آگے توران کا ریشمی پرچم لہرا رہا تھا، اور چند سپاہی اپنے کاندھوں پر فیروزہ کا تخت اٹھائے ہوئے تھے۔ پیران نے بڑھ کر سیاوش کے پورے جسم کو بوسہ دیا۔ سیاوش ظاہری طور پر خوش تھا کہ دشمن اس کی ناز برداری کر رہا ہے۔ لیکن ایران کی محبت اور وطن سے دوری کا اسے بہت غم تھا۔

پیران نے دیکھا کہ سیاوش افسردہ ہے تو اس نے اسے اپنی اور افراسیاب کی محبت کا یقین دلایا اور بولا:

مکن ھیچگونہ بہ رفتن شتاب   مگر دان دل از مہر افراسیاب

افراسیاب کی محبت پر بھروسہ کر اور یہاں سے جانے کا خیال ترک کر دے

کز ایدر کنی تو بہ شادی نشست   فدای تو بادا ہمہ ہر چہ ہست

یہاں کی ہر چیز تجھ پر قربان ہے، اب آج سے تو خوشی کی زندگی گذار۔

پیران کی تسلّی آمیز باتیں سن کر سیاوش کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ اس کی پریشانی جاتی رہی۔ اس کے بعد پیران اور سیاوش دستر خوان پر بیٹھے اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے گھل مل گئے جیسے باپ بیٹے ہوں۔ کھانا کھا کر یہ لوگ افراسیاب کے دربار کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں کہیں توقف نہیں کیا۔ ادھر سے افراسیاب پیدل ان کے استقبال کے لئے چلا۔ سیاوش افراسیاب کو دیکھتے ہی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کی آنکھ اور پیشانی کو بوسہ دیا۔

اس ملن سے افراسیاب کی پریشانی ختم ہوگئی۔ اس نے سیاوش پر مہربانیوں کا دروازہ کھول دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا شہزادے کے لئے ایک خوبصورت محل سجایا جائے۔ اس میں سنہرا تخت لگایا جائے اور زربفت کے فرش بچھائے جائیں۔ سیاوش تخت زریں پر جلوہ افروز ہوا۔ افراسیاب نے اس کے اعزاز میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا اور بہت سارے گراں بہا تحائف مہمان کی خدمت میں پیش کئے۔

جشن ایک ہفتہ تک چلتا رہا۔ ایک دن افراسیاب سیاوش کے ساتھ چوگان کھیلنے گیا۔ شام تک دونوں کھیل میں سرگرم رہے۔ رات کو خوش خوش محل لوٹے۔ افراسیاب کو یہ دیکھ کر اور خوشی ہوئی کہ سیاوش واقعی لائق اور بہادر نوجوان ہے۔ اس نے سیاوش کو مزید تحفے دئے اور اسے جی جان سے عزیز رکھنے لگا۔ کچھ دن کے بعد افراسیاب کے تعلق خاطر کا یہ عالم تھا کہ غم ہو یا خوشی اسے سیاوش کے علاوہ کسی اور کی صحبت پسند ہی نہیں آتی تھی۔

اس طرح ایک سال گذر گیا۔ ایک دن پیران اور سیاوش بیٹھے بات کر رہے تھے۔ پیران نے کہا: افراسیاب کا یہ عالم ہے کہ اب تیرے علاوہ اس کی نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں۔

چنان دان کہ خرم بہارش توئی   نگارش توئی، غمگسارش توئی

گویا تیری ذات ہی اس کی بہار ہے، تو ہی اس کے عیش وطرب کا رفیق اور تو ہی اس کے غم و درد کا شریک ہے۔

لیکن یہ بات تجھے نہیں بھولنا چاہیئے کہ تو کاؤس کا بیٹا اور ایرانی تخت وتاج کا وارث ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کی موت کے بعد تو تخت وتاج سے محروم رہ جائے۔

برادر نداری، نہ خواہر نہ زن　　　　چو شاخ گلی بر کنار چمن

تیرا نہ کوئی بھائی ہے نہ بہن اور بیوی، تو اس شاخ گل کی طرح ہے جو چمن سے الگ تھلگ ہو۔

یکی زن نگہ کن سزاوار خویش　　　　از ایران بنہ درد و تیمار خویش

بہتر ہے اپنے لئے ایک اچھی سی بیوی کا انتخاب کر لے جو تیرے درد وطن کا مداوا کر سکے۔

پیران نے کہا افراسیاب اور گرسیوز دونوں کے تین تین خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ میری چار لڑکیاں بھی تیرے لئے حاضر ہیں۔ بڑی لڑکی جریرہ ستاروں میں چاند ہے۔ بہر حال تو جسے چاہے پسند کر لے۔

سیاوش نے کہا: ان سب لڑکیوں میں مجھے جریرہ پسند ہے۔ میرا رشتہ اسی سے مناسب ہے۔

پیران خوش خوش گھر گیا اور جریرہ کی بات پکی کی۔ رات کو اس نے بیٹی کو بہار کی طرح آراستہ کر کے سیاوش کی خدمت میں بھیج دیا۔

افراسیاب کے دربار میں سیاوش کا دبدبہ اور مرتبہ دن بدن بڑھتا رہا۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد ایک روز پیران سیاوش سے بولا: کبھی تو نے یہ بات بھی سوچی کہ افراسیاب کا دبدبہ اور شان و شوکت تیری بدولت ہے۔

شب و روز روشن روانش توئی　　　　دل و جان و ہوش و توانش توئی

افراسیاب دن رات تجھے دیکھ کر جیتا ہے، وہ دل و جان سے تجھ پر فدا ہے اور تیری بدولت اس کے ہوش و حواس قائم ہیں۔

چو با او تو پیوستۂ خون شوی　　　ازین پایہ ہر دم تو افزون شوی

لیکن اگر تیرا اس کا خون کا رشتہ قائم ہو جائے تو تیرا مرتبہ برابر بڑھتا رہے گا۔

پیران نے کہا: صحیح ہے کہ میری بیٹی تیرے گھر میں ہے۔ لیکن مجھے تیری فکر لگی رہتی ہے۔ تجھے شاہ توران کے دربار میں جو اعزاز و اکرام حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ شہنشاہ کے دامن میں جو موتی ہیں ان میں سے ایک اپنے لئے چن لے اس سے تیرے جاہ و مرتبہ میں اور ترقی ہو گی۔ افراسیاب کی لڑکیوں میں سب سے خوبصورت فرنگیس ہے۔ اگر تو کہے تو میں بادشاہ سے رازدارانہ طور پر گفتگو کروں۔

سیاوش اپنی شرافت نفس اور بلندی طبع کی بنا پر اس اقدام کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ جریرہ کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا اس نے کہا:

ولیکن مرا با جریرہ نفس　　　برآید، نخواہم جز او هیچکس

لیکن میری زندگی تو جریرہ کے دم سے ہے، میں اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں چاہتا

نہ دربند گاہم، نہ دربند جاہ　　　نہ خورشید خواہم، نہ روشن کلاہ

نہ میں جاہ و مرتبہ کے درپے ہوں نہ اعزاز و اکرام کے، نہ مجھے چاند سورج درکار ہے نہ تخت و تاج۔

بسازیم باہم بہ نیک و بہ بد　　　نخواہم جز او گر بہ من یاد رسد

میں اور جریرہ بھلے برے کے ساتھی ہیں، میں اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں چاہتا چاہے مجھے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن سیاوش کو پیران نے جریرہ کی طرف سے اطمینان دلایا۔ آخرکار سیاوش

پیران کے بیحد اصرار پر راضی ہوگیا اور بولا : اب جبکہ ایران ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا ، میں اپنے باپ ، رستم اور ایرانی پہلوانوں سے سدا کے لئے بچھڑ گیا اور بقیہ زندگی یہیں توران میں گذارنی ہے تو افراسیاب کی لڑکی سے شادی بھی مجھے منظور ہے

پیران افراسیاب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سیاوش کے لئے فرنگیس کا ہاتھ مانگا - افراسیاب نے پہلے بہانہ کیا کہ نجومیوں نے مجھ سے کہا ہے میرا کوئی نواسہ کیقباد اور تور کی نسل سے نہیں ہونا چاہیئے لیکن پیران بولا : نجومیوں کی بات بے بنیاد ہے ، آخر اس نے افراسیاب کو شیشہ میں اتار لیا اور تورانی شہنشاہ اپنی بیٹی فرنگیس کو سیاوش سے بیاہنے پر راضی ہوگیا -

پیران ہنسی خوشی سیاوش کے پاس پہونچا ، اور اس سے کہا نئی شادی کے لئے تیار ہوجاؤ لیکن سیاوش بدستور اس شادی کے لئے جھجک رہا تھا - اس کا ضمیر جریرہ کے ساتھ بیوفائی پر آمادہ نہیں تھا - اس کے دل میں ایک احساس گناہ سا تھا - اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہورہا تھا - اس نے سوچا جریرہ جیسی جان و دل سے عزیز بیوی کو چھوڑ کر کیسے کسی اور کو اپنالوں ؟

ادھر پیران گھر لوٹا - اس نے اپنی بیوی گلشہر کو خزانے کی کنجی دی کہ فرنگیس کی خدمت میں تحفہ بھیجنے کے لئے خزانے سے قیمتی اشیا نکالے - گلشہر نے زبرجد کے طشت ، فیروزے کے پیالے ، مرصع تاج اور گوشوارے اور نہایت قیمتی جوتے نکالے ان کے علاوہ اس نے سو طبق میں الگ الگ مشک و زعفران سجائے - ساٹھ اونٹوں پر بیش قیمت فرش ، زربفت اور طلائی تخت لادے گئے اور تین سو کنیزوں کے ہمراہ جو سنہری عماری میں بیٹھی تھیں ، فرنگیس کی خدمت میں بھیجا -

آخر کار ایرانی رسم و رواج کے مطابق سیاوش اور فرنگیس کی شادی ہوئی گویا چاند سورج ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر دئے گئے ۔ سارے ملک میں ایک ہفتہ تک دھوم دھام سے جشن ہوتا رہا اور لوگ الواع واقسام کی شراب اور کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ۔

اس طرح ایک سال گذر گیا ۔ مصیبت یا ظلم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ۔ ادھر افراسیاب نے چین تک کا ایک وسیع علاقہ سیاوش کے سپرد کر دیا ۔ سیاوش فرنگیس اور پیران کے ہمراہ نئے علاقے کے لئے روانہ ہوا ۔ چلتے چلتے یہ قافلہ ایک ایسی جگہ پر پہونچا جہاں ایک طرف سمندر اور دوسری طرف پہاڑ تھا ۔ سیاوش کو وہ جگہ پسند آئی ، اس نے حکم دیا کہ وہاں اس کے لئے ایک شاندار محل تعمیر کیا جائے ۔ چنانچہ شاہی معماروں نے بڑی محنت اور لگن سے وہاں قلعہ گنگ تعمیر کیا جو شان و شوکت اور چمن بندی میں لاجواب تھا ۔

سیاوش ایک دن پیران کو لے کر قلعہ دیکھنے گیا ۔ اس نے دیکھا شاہی محل ہر لحاظ سے آراستہ پیراستہ ہے ۔ سیاوش نے نجومیوں کو بلا کر پوچھا : یہ محل مجھے راس آئے گا یا ایک دن اس کی تعمیر پر پچھتانا پڑے گا ؟

منجموں نے کہا یہ محل آپ کے لئے مبارک فال نہیں ہے ۔ سیاوش جو پہلے ہی اداس تھا اپنی بد قسمتی کی بات سن کر اور بھی بجھ گیا ۔ آخر اس نے پیران کو نجومیوں کی بات بتائی اور کہا : ایسا لگتا ہے اس محل سے کوئی اور ہی بہرہ ور ہوگا ، میں یونہی محروم رہوں گا ۔

پیران نے اسے تسلی دی ۔ کچھ دن کے بعد وہ دار الخلافہ کو لوٹا تو افراسیاب سے

سیاوش کے محل کی بہت تعریف کی۔ افراسیاب کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سیاوش نے اتنا شاندار محل بنوایا ہے۔ افراسیاب نے گرسیوز سے کہا کہ جاکر دیکھو سیاوش نے کتنا شاندار قصر تعمیر کرایا ہے، جاکر اس کے فیروزہ اور عاج کے تخت کو دیکھو، جہاں کچھ دن پہلے جھاڑ جھنکاڑ تھے وہاں اب چمن لہلہا رہا ہے۔ افراسیاب نے گرسیوز کو یہ بھی تاکید کی کہ وہ سیاوش کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آئے، بزرگوں کے سامنے اس کا احترام کرے اور اس کی مدح وستائش میں کوتاہی نہ کرے۔

گرسیوز افراسیاب کا پیغام اور تحفے لے کر روانہ ہوا۔ سیاوش کو اس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ پیدل اس کے استقبال کے لئے گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ سیاوش گرسیوز کو شاہی محل میں لایا اور اس کے اعزاز میں جشن کا اہتمام کیا۔ اس کے بعد گرسیوز وہاں سے اٹھ کر فرنگیس کے محل میں گیا۔ دیکھا فرنگیس بڑی شان کے ساتھ تخت عاج پر جلوہ افروز ہے، گرسیوز بظاہر خوش ہوا مگر حسد کے مارے اس کا خون کھول اٹھا:

به دل گفت سالی برین بگذرد   سیاوش کسی را بکس نشمرد

گرسیوز نے دل میں کہا اگر اسی طرح ایک سال اور گزر گیا تو سیاوش کسی کو خاطر میں نہیں لائے گا۔

همش پادشاهیست، هم تخت وگاه   همش گنج وهم بوم وبر، هم سپاه

آج بھی وہ تقریباً بادشاہ ہے، اس کے پاس تخت وتاج ہے، خزانہ ہے، فوج ہے اور اتنا بڑا علاقہ ہے۔

گرسیوز سیاوش کی شان وشوکت دیکھ کر پیچ وتاب کھاتا رہا۔ افسردگی

سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا لیکن دن بھر وہ بظاہر خوش رہا۔ دوسرے دن سیاوش نے اسے چوگان کھیلنے کی دعوت دی۔ دونوں نے کھیل شروع کیا۔ گرسیوز جو گیند بھی مارتا سیاوش اسے پھرتی سے لوٹا دیتا۔ ایرانی اور ترک چوگاں باز چاروں اور گھوڑے دوڑاتے رہے اور کھیل میں مصروف رہے لیکن ایرانی شہسوار ترکوں سے سبقت لے گئے۔ سیاوش کو اپنے ہموطنوں کی برتری دیکھ کر خوشی ہوئی۔

سیاوش اور گرسیوز کھیل سے فارغ ہوئے تو ایک سنہرے تخت پر بیٹھ کر اپنے کھلاڑیوں کا مقابلہ دیکھنے لگے۔ لیکن گرسیوز اپنی ناکامی پر نادم تھا۔ آخر اس نے سیاوش کو زور آزمائی کے لئے چیلنج کیا۔ اس نے کہا آؤ فوج کے سامنے ہم کشتی لڑیں۔ اگر میں تجھے زمین سے اٹھا کر دے ماروں تو میں تجھ سے طاقتور ہوں لیکن اگر تو مجھے پچھاڑ دے تو پھر میں کبھی میدان جنگ کا رخ نہیں کروں گا۔

سیاوش نے شرافت نفس کی بنا پر گرسیوز کا چیلنج قبول نہیں کیا۔ اس نے یہ ظاہر کیا میں آپ کا چھوٹا ہوں اور آپ کے ساتھ زور آزمائی مجھے زیب نہیں دیتی لیکن درحقیقت وہ گرسیوز سے لڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ گرسیوز افراسیاب کا بھائی تھا اور اس وقت سیاوش کا مہمان۔ چنانچہ سیاوش بولا: آپ کسی اور پہلوان کو مجھ سے مقابلہ کے لئے کہیئے۔ گرسیوز نے دو مشہور پہلوان گروی زرہ اور دمور مقابلہ کے لئے انتخاب کئے۔ دونوں جنگ اور زور آزمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

سیاوش گروی اور دمور کے ساتھ میدان میں اترا۔ پہلے وہ گروی کی طرف لپکا اور اس کی پیٹی پکڑ کر اسے زمین پر دے مارا۔ اب وہ دمور کی طرف بڑھا اور

اسے گردن سے پکڑ کر زمین سے یوں اٹھالیا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی چڑیا ہو، اور لاکر گرسیوز کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ اس کے بعد سیاوش گھوڑے سے اترا، بڑھ کر گرسیوز سے ہاتھ ملایا اور سب ہنسی خوشی محل واپس ہو گئے۔

گرسیوز ایک ہفتہ قیام کر کے اپنے شہر واپس ہوا۔ وہ بظاہر سیاوش کی جنگی مہارت کو سراہتا رہا مگر دراصل وہ اپنی شکست پر شرمندہ تھا اور اس کا دل سیاوش کے خلاف کینہ سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ افراسیاب کے دربار میں پہونچا تو موقع نکال کر بادشاہ سے سیاوش کی برائی کرنے لگا۔ اس نے کہا: وقتاً فوقتاً شہنشاہ کاؤس کا ایلچی سیاوش کے پاس آتا رہتا ہے، اسی طرح چین اور روم سے بھی اس کے تعلقات ہیں، اور سب پر مزید یہ کہ سیاوش شاہ ایران کی یاد میں شراب پیتے ہے اور جام اٹھاتے وقت شاہ توران کا نام تک نہیں لیتا۔

گرسیوز کی باتیں سن کر افراسیاب کو رنج ہوا۔ اس نے کہا میں تین دن تک اس پر غور کروں گا۔ افراسیاب نے ہر چند سوچا مگر اسے سیاوش میں کوئی برائی نہیں نظر آئی آخر اس نے گرسیوز سے کہا:

چو او تخت پرمایہ بدرود کرد — خرد تار و مہر مرا پود کرد

سیاوش نے ایران کے تخت کو تیاگ کر ہوشمندی اور مجھ سے وفاداری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

ز فرمان من یکزمان سر نتافت — ز من او بجز نیکوئی بر نیافت

آج تک اس نے میرے فرمان سے سرتابی نہیں کی اور میں نے ہمیشہ اس کے ساتھ بھلائی ہی کی ہے۔

افراسیاب نے کہا: میرے پاس سیاوش کے خلاف کوئی بہانہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی میں اس کے ساتھ غلط سلوک کروں تو لوگ میرے پیچھے مجھے برا بھلا کہیں گے اور دنیا کے حکمرانوں میں میں انگشت نما ہو جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے سیاوش کو واپس ایران بھیج دیں۔

گرسیوز نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا: سیاوش ہماری حکومت کے تمام راز سے واقف ہے، اگر وہ ایران چلا گیا تو ہمارے لئے مصیبت ہی مصیبت ہے۔ آپ نے شیر پال رکھا ہے اور شیر پالنے والے کو ہمیشہ خطرہ ہی خطرہ رہتا ہے

خلاصہ یہ کہ گرسیوز نے سیاوش اور فرنگیس کی اتنی برائی کی اور ان کی ناشکری اور نخوت کا اتنا رونا رویا کہ افراسیاب کا دل ان کی طرف سے پھر گیا۔ اس نے گرسیوز کو حکم دیا کہ وہ جاکر سیاوش اور فرنگیس کو دربار میں لائے۔ گرسیوز اسی کینہ کے عالم میں سیاوش کے پاس پہونچا اور اسے افراسیاب کا پیغام دیا کہ بادشاہ سلامت تمھارے دیدار کے آرزومند ہیں۔ کچھ دن کے لئے فرنگیس کے ساتھ آجاؤ اور یہیں دربار اور شکار میں اپنا وقت گذارو۔

سیاوش کو افراسیاب کا پیغام ملا تو خوشی کے ساتھ اس نے شہنشاہ کی دعوت قبول کی۔ لیکن گرسیوز نے سوچا کہ اگر سیاوش اتنا خرم وشاداں افراسیاب کے دربار میں پہونچا تو میرا جھوٹ کھل جائے گا۔ چنانچہ وہ کچھ سوچ کر جھوٹ موٹ آنسو بہانے لگا۔

سیاوش نے پوچھا: رونے کی کیا بات ہے؟

گرسیوز بولا: افراسیاب بظاہر تجھ پر مہربان ہے مگر اس کی بدی کا کوئی بھروسہ

نہیں، وہ اس سے قبل اپنے بے گناہ بھائی اور کتنے ہی سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ اب اس کے دل کا شیطان تجھ سے بدی پر آمادہ ہے۔ میں ایک دوست کے ناتے تجھ سے کہتا ہوں کہ سنبھل کر قدم اٹھائیو۔

سیاوش نے کہا: میں بادشاہ کو منالوں گا۔ اس کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ لیکن گرسیوز کہنے لگا: افراسیاب نے اپنے عزیزوں اور سرداروں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اسے فراموش نہ کر اور اس کے فریب میں مت آ۔ میری رائے یہ ہے کہ دربار میں جانے کے بجائے افراسیاب کو ایک خط لکھ کر بات صاف کر لے اگر میں نے دیکھا اس کا من صاف ہے تو قاصد بھیج کر تجھے اطلاع دوں گا اور اگر معاملہ برعکس ہے تو بھی تجھے صورت حال کی خبر کروں گا۔

سیاوش گرسیوز کی باتوں میں آگیا اور اس نے افراسیاب کو خط لکھا کہ آپ کی دعوت سے بیحد خوشی ہوئی لیکن ان دنوں فرنگیس بیمار ہے اور میں اس کی تیمارداری کی بنا پر سفر سے معذور ہوں۔ جیسے ہی اس کی طبیعت بہتر ہوگی فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

گرسیوز خط لے کر روانہ ہوا۔ وہ دن رات سفر کر کے تین روز میں افراسیاب کے پاس پہونچ گیا۔ اس کی تیز رفتاری پر افراسیاب کو بھی حیرت ہوئی۔ وہاں پہونچ کر گرسیوز نے اپنے جھوٹ کا پٹارا کھولا۔ اس نے کہا: نہ تو سیاوش میرے استقبال کے لئے آیا اور نہ میرے ساتھ کوئی مہربانی کی۔ اس نے مجھے تخت کے نیچے دوزانو بٹھایا۔ آپ کا خط میں نے دیا تو بے پڑھے رکھ دیا، میں نے زبانی پیغام دینا چاہا تو روک دیا۔ اس کے پاس ایران سے برابر خط آتے ہیں، یوں سمجھئے اس کے شہر کا دروازہ تورانیوں کے

لئے بند ہو چکا ہے۔ اگر جہاں پناہ سیاوش کے معاملے میں اور تامل سے کام لیں گے تو افسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، آپ دیر کریں گے تو سیاوش خود جنگ کر کے توران و ایران پر قبضہ کر لے گا۔

گرسیوز کے جانے کے بعد سیاوش نے بڑے دکھ کے ساتھ فرنگیس کو ساری بات بتائی۔ فرنگیس نے سر پیٹ لیا اور رونے دھونے لگی، اس نے کہا: اب کیا ہو گا میرا باپ تجھ سے کینہ رکھتا ہے، اُدھر تو ایران جانے کے لئے تیار نہیں اور چین سے تجھے عار آتا ہے۔ تجھے دنیا میں اب کہاں پناہ ملے گی، خدا تجھے اپنی پناہ میں رکھے۔

لیکن سیاوش اسے تسلی دیتے ہوئے بولا:

بہ دادار کن پشت و اندہ مدار   گذر نیست از حکم پروردگار

غم نہ کر، خدا پر بھروسہ کر، اس کے حکم کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔

اس بات کو تین دن گذر گئے۔ چوتھے دن آدھی رات کو سیاوش سوتے سوتے چیخ پڑا۔ اس کی آنکھ کھل گئی، اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا، فرنگیس نے فوراً شمع روشن کی اور پوچھا کیا بات ہے؟ سیاوش بولا: میں نے ابھی ابھی خواب دیکھا ہے کہ ایک بہت بڑا دریا بہہ رہا ہے۔ اس کے دوسری طرف آگ جلانے کے لئے لکڑیوں کا پہاڑ بنایا گیا ہے، ندی کے کنارے زرہ پوش فوجی اور سپہ سالار مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں، آگے آگے افراسیاب ہاتھی پر سوار ہے، افراسیاب نے مجھے دیکھا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اس نے فوراً آگ میں پھونک ماری، گرسیوز نے آگ کو ہوا دی اور اس طرح مجھے اس آگ میں جلا دیا گیا۔

فرنگیس نے سیاوش کو تسلی دی کہ خواب تو خواب ہے، لیکن ابھی دو تہائی رات

گذری تھی کہ خبر آئی افراسیاب ایک بھاری فوج کے ساتھ دھاوا بولتا آرہا ہے، اسی دن گرسیوز نے قاصد بھیج کر خبر دی کہ میں نے لاکھ کوشش کی، مگر افراسیاب کا دل تیری طرف سے صاف نہیں ہوا۔ تیری حمایت میں مجھے بدنامی کے سوا کچھ نہ ملا، اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟

فرنگیس نے سیاوش کو سمجھایا کہ ایک لمحہ کی دیر بھی مناسب نہیں ہے ابھی گھوڑے پر سوار ہو اور جہاں سینگ سمائے چلا جا۔ لیکن سیاوش کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کا خواب سچا ہے اور اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے جنگ کی تیاری شروع کی اور فرنگیس کو خدا حافظ کہتے ہوئے بولا: تجھے پانچ مہینے کا حمل ہے، جب میرا بیٹا پیدا ہو تو اس کا نام کیخسرو رکھنا۔ وہ ایران کا مشہور بادشاہ ہوگا۔ جہاں تک میرا سوال ہے افراسیاب کے لوگ

ببرند بر بیگنہ این سرم　　　بہ خون جگر بر نہند افسرم

مجھ بیگناہ کا سر اڑا دیں گے اور میرا تاج خاک و خون میں ملا دیں گے۔

نہ تابوت یابم نہ گور و کفن　　　نہ بر من بگرید کسی ز انجمن

نہ مجھے تابوت نصیب ہوگا نہ گور و کفن، اور نہ کوئی مجھ پر دو آنسو بہائے گا۔

بمانم بسان غریبان بہ خاک　　　سرم گشتہ از تن بہ شمشیر چاک

جب تلوار سے میرا سر قلم ہو جائے گا تو میری لاش اس پردیس میں خاک پر پڑی سڑتی رہے گی۔

سیاوش نے کہا: جہاں تک تیرا تعلق ہے افراسیاب کے سپاہی تجھے برہنہ کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ پھر پیران تجھ کو بیاہ کرلے جائے گا۔ اسی کے محل میں تو میرے بچے کو جنم دے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب خسرو بڑا ہوگا تو ایران سے گیو نام کا

ایک پہلوان آئے گا اور چپکے سے تجھے اور بچے کو یہاں سے لے جائے گا۔ وہاں جاکر میرا بیٹا ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوگا اور زمین و آسمان پر حکومت کرے گا۔ تب کیخسرو میرا انتقام لینے اٹھے گا اور ساری دنیا کو زیر و زبر کر دے گا۔

اس کے بعد سیاوش نے فرنگیس کو خدا حافظ کہا۔ فرنگیس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑے۔ اس نے پریشانی میں اپنا چہرہ اور بال نوچنا شروع کیا۔ ادھر سیاوش اپنے مخصوص گھوڑے شبرنگ پر سوار ہوا، اس کے کان میں کوئی بات کہی اور اسے ایڑ لگا کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوگیا اس کے ساتھ تھوڑی بہت ایرانی فوج تھی تھوڑی دور جانے کے بعد تورانی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی، ایرانی سپاہی جان پر کھیلے ہوئے تھے، مگر سیاوش نے انھیں روکا اور افراسیاب کو مخاطب کرکے بولا: آپ کیوں جنگ پر کمر بستہ اور میرا خون بہانے پر آمادہ ہیں؟

لیکن اس سے پہلے کہ افراسیاب جواب دے، گرسیوز چیخا: اگر تو بے قصور ہے تو کیوں مسلح ہو کر بادشاہ کے حضور میں آیا ہے۔

سیاوش سمجھ گیا کہ سارا فساد اسی کا ہے، اس نے گرسیوز سے کہا یہ سب تیرا فساد ہے، تو نے مجھ سے کہا تھا کہ بادشاہ مجھ سے ناراض ہیں۔ پھر وہ افراسیاب سے بولا: مجھ بیگناہ کا خون اکارت نہیں جائے گا، آپ گرسیوز کی باتوں میں آکر توران کے لئے مصیبت نہ مول لیں۔

مگر گرسیوز نے اتنا موقع نہیں دیا کہ افراسیاب سیاوش کی باتیں سنے، اس نے بادشاہ کو اکسایا کہ جنگ میں پہل کرکے سیاوش کو جلد سے جلد اسیر کر لیں۔

ادھر سیاوش کا یہ حال تھا کہ اس نے نہ خود ہتھیار سنبھالا اور نہ فوجیوں کو حملہ کی

اجازت دی۔کیونکہ وہ افراسیاب سے صلح کا معاہدہ کر چکا تھا۔البتہ دوسری طرف سے افراسیاب نے اپنی فوج کو بزن کا حکم دیا۔تورانی فوج ایرانیوں پر ٹوٹ پڑی۔دیکھتے دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے اور سارا میدان خون سے لالہ زار ہو گیا۔سیاوش کو یکے بعد دیگرے کئی تیر لگے، آخرکار وہ بے بس ہو کر گر پڑا۔گروی نے بڑھ کر اس کے ہاتھ پیچھے سے باندھ دئے اور اس کی گردن پر جوا رکھ کر اسے گھسیٹتا ہوا افراسیاب کے سامنے لایا۔
افراسیاب نے حکم دیا: فوراً اس کا سر تن سے جدا کر دو اور اس تپتی ریت پر اس کی لاش پڑی سڑنے دو۔

سپاہیوں نے افراسیاب کا فرمان بجالانے میں تامل کیا۔انھوں نے کہا: سیاوش نے آپ کے ساتھ کوئی بدی نہیں کی ہے، پھر آپ اس کا خون کیوں بہا رہے ہیں؟ یقین مانئے اس کے قتل پر تخت و تاج خون کے آنسو بہائیں گے۔

پیران کے بھائی پیلسم نے بھی افراسیاب کو سمجھایا کہ سیاوش کا قتل بری بات ہے۔جلدبازی شیطان کا شیوہ ہے، یہ یاد رکھئے کہ شاہ ایران، رستم اور ایرانی پہلوان اس خون ریزی کا انتقام لے کر رہیں گے۔میرا مشورہ یہ ہے کہ بادشاہ سلامت ابھی سیاوش کو قید میں رکھیں اور کسی مناسب موقع پر اس کے قتل کا حکم صادر فرمائیں۔

افراسیاب پیلسم کی باتیں سن کر ذرا نرم ہوا لیکن گرسیوز نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ اس کو بھڑکانا شروع کر دیا اور کہنے لگا: سیاوش زخم خوردہ سانپ کی مانند ہے، اس کو زندہ رکھنا اور بھی خطرناک ہوگا، اگر آپ نے اسے زندہ چھوڑا تو پھر میں آپ کی خدمت کرنے سے معذور ہوں، میں کسی گوشہ میں جا چھپوں گا یا موت کے دامن میں پناہ لوں گا۔

گروی اور دمور نے بھی گرسیوز کی ہاں میں ہاں ملائی اور بادشاہ کو سیاوش کے قتل پر اکسایا۔ افراسیاب سوچنے لگا کیا کرے، سیاوش کو قتل کرے تو برا اور رہا کرے تو اور بھی برا۔

فرنگیس کو جب معلوم ہوا کہ صورت حال یہ ہے تو وہ روتی پیٹتی بادشاہ کے پاس آئی اور گڑگڑا گڑگڑا کر سیاوش کی رہائی کی درخواست کی۔ فرنگیس نے کہا اگر آپ نے سیاوش کو قتل کیا تو ایرانی بہادر آپ سے ضرور انتقام لیں گے اور ساری دنیا آپ پر نفرین کرے گی، علاوہ ازیں موت کے بعد آپ دوزخ کی آگ میں جلیں گے۔

اس کے بعد فرنگیس سیاوش کو مخاطب کر کے بولی: جو تیرے ساتھ برا سلوک کرے خدا اس کو غارت کرے اور مٹی میں ملائے: کاش میری آنکھیں پھوٹ جاتیں اور میں تجھے اس طرح خاک و خون میں گھٹتا ہوا نہ دیکھتی، میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اپنے باپ کی بدولت میری گود سونی ہو جائے گی۔

افراسیاب پر خون سوار تھا۔ اس نے فرنگیس کی گریہ و زاری سن کر حکم دیا کہ پہلے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیری جائے اور پھر سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے دور لے جا کر ایک اندھیری کوٹھری میں بند کر دیں تاکہ اس کی فریاد کسی کے کانوں تک نہ پہونچ پائے۔

افراسیاب کا حکم ہوتے ہی گرسیوز نے گروی کو اشارہ کیا۔ گروی نے بڑھ کر سیاوش کی داڑھی پکڑی اور انتہائی بے رحمی سے اسے زمین پر گھسیٹنا شروع کیا۔ سیاوش درد سے تڑپ اٹھا۔ اس نے دعا کی کہ میری نسل میں کوئی بہادر پیدا ہو جو اس بے عزتی کا بدلہ لے کر رہے۔ اس کے بعد سیاوش نے بیلسم کی طرف رخ کیا اور اس کے ذریعہ پیران کو یہ پیغام کہلوایا:

میری طرف سے پیران کو سلام کہنا اور کہنا تو نے کہا تھا کہ اگر کبھی سیاوش پر مصیبت آئی تو میں اپنے ایک لاکھ پیدل اور سوار لے کر مدد کو پہونچوں گا۔ آج مجھے گرسیوز نے اتنا ذلیل کیا ہے کہ بس، لیکن مجھے کوئی ایسا ہمدرد نہیں نظر آتا جو میری حالت زار پر دو آنسو بہائے۔

گروی سیاوش کو بال سے گھسیٹتے ہوئے اسی جگہ پر لے گیا جہاں کبھی اس نے گرسیوز کے ساتھ تیر اندازی کی تھی، اور وہاں ایک سنہرے طشت میں بکری کی طرح اس کا سر کاٹ دیا۔ سیاوش کی گردن سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے، طشت خون سے بھر گیا تو قاتلوں نے وہیں زمین پر انڈیل دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے ایک پودا اگا جسے خون سیاوش کہتے ہیں:

چو از سرو بن دور گشت آفتاب	سر شہریار اندر آمد بہ خواب
چہ خوابی کہ چندین زمان برگذشت	نجنبید ہرگز نہ بیدار گشت

جب سرو کے لمبے لمبے پیڑوں کے پیچھے آفتاب غروب ہوا تو سیاوش سر رکھ کر سو گیا مگر خدایا یہ کیسی نیند تھی کہ آج تک نہ اس نے کروٹ لی اور نہ اس کی آنکھ کھلی۔

سیاوش کے قتل کی خبر سن کر مرد عورت چیخ اٹھے فرنگیس نے اپنے بال نوچ ڈالے اور گلاب سے چہرہ کو خونا خون کر لیا۔ اس کی چیخ پکار افراسیاب کے کانوں تک پہونچی تو اس نے حکم دیا کہ فرنگیس کو قید سے نکال کر اس کے بال مونڈ دئے جائیں، اس کا لباس چاک کر دیا جائے اور اسے اتنا مارا جائے کہ اس کے پیٹ کا بچہ جاتا رہے۔ افراسیاب نے کہا: میں نہیں چاہتا سیاوش کی نسل کا نام ونشان بھی باقی رہے۔

ادھر پیران کو سیاوش کے قتل کی خبر ملی تو وہ تخت سے گر کر بیہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، بال نوچ لئے اور سر پر خاک ڈال لی۔ سیاوش کے سوگ میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور زبان پر فریاد تھی۔

لوگوں نے پیران سے کہا: فوراً جا کر افراسیاب کو فرنگیس کے قتل سے روکو۔ ورنہ دہری مصیبت ہو گی۔ پیران فوراً افراسیاب کے پاس پہونچا اور اسے سرزنش کرتے ہوئے بولا: تو نے سیاوش کو بے گناہ مار کر اپنی عزت مٹی میں ملا دی، جس ملعون نے تجھے یہ راہ دکھائی خدا اس کا بیڑا غرق کرے۔ تو اپنے فعل پر قیامت کے دن پچھتائے گا اور پھر دوزخ کی آگ کا ایندھن بنے گا۔

کنون ز و گذشتی به فرزند خویش　　رسیدی به آزار پیوند خویش

اب تو سیاوش کے بعد اپنی لڑکی کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

چو دیوانه از جای برخاستی　　چنین روز بد را بیاراستی

تو یقیناً دیوانہ ہو گیا ہے ورنہ کاہے کو یہ قتل و خون کا منظر سامنے آتا۔

پیران نے افراسیاب سے کہا: فرنگیس کو میرے حوالے کر دو۔ جب فرنگیس کے بچہ ہو جائے گا تو میں اسے تمھارے پاس واپس بھیج دوں گا، پھر اس وقت جو سزا چاہے دے لینا۔

افراسیاب نے پیران کی بات مان لی اور اس نے فرنگیس کو اس کے سپرد کر دیا پیران فرنگیس کو ساتھ لے کر شہر ختن چلا گیا۔

بہرام گور اور لنبک سقّا

فارسی شاعروں اور ادیبوں نے بہرام گور کی ماجرا جوئی، جوانمردی اور عشقبازی پر خوب خامہ فرسائی کی ہے۔
نظامی گنجوی کی مثنوی ہفت پیکر کا ہیرو بہرام گور ہی ہے۔ یہ داستان شاہنامۂ فردوسی میں بھی نظم ہوئی ہے مگر نظامی کا یہ خیال ہے کہ اس نے بہرام گور کی داستان نظم کرکے پچھلی تمام روایتوں پر خطِ نسخ پھیر دیا ہے۔ پھر بھی شاہنامہ کی داستان اپنی مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔
ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔



بهرام گور و لنبک آبکش

بدانگه که شد پادشاہیش راست
فزون گشت شادی و اندہ بکاست

جب بہرام گور کی حکومت مسلم ہو گئی تو دنیا میں خوشیاں بڑھ گئیں
اور غم گھٹ گئے۔

ایک دن بہرام گور اپنے پہلوانوں اور بہادروں کے ساتھ شکار کھیلنے جارہا تھا ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکے اس کے سامنے آیا اور بولا: جہاں پناہ! ہمارے شہر میں دو آدمی رہتے ہیں، ایک امیر ہے دوسرا غریب۔ امیر کا نام براہام ہے، وہ دراصل کنجوس یہودی ہے، غریب کو لنبک سقا کہتے ہیں مگر وہ واقعی آزاد مزاج اور شیریں زبان ہے

بہرام گور نے دونوں کے بارے میں مزید تفصیل پوچھی تو بڈھا بولا: لنبک سقا آدھے دن پانی بیچتا ہے اور اس آمدنی سے آنے والے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور کل کے لئے ایک کوڑی بھی بچا کر نہیں رکھتا مگر براہام یہودی اتنی دولت و ثروت کے باوجود سارے شہر میں اپنی خست کے لئے مشہور ہے۔

بہرام گور نے حکم دیا کہ شہر میں منادی کرادی جائے کہ کسی شخص کو لنبک سقا سے پانی خریدنے کی اجازت نہیں ہے۔ رات ہوئی تو بہرام گور گھوڑے پر سوار سقا کے گھر پہونچا، دروازے پر دستک دی اور بولا: میں ایرانی فوج سے بچھڑ گیا ہوں، اب تیرے در پر پناہ لی ہے، اجازت ہو تو یہیں رات بسر کرلوں۔ تجھے اپنی جوانمردی کی قسم، مجھے

اجازت دیدے۔

سقا بہرام گور کی رسیلی آواز اور انداز گفتگو سے خوش ہوا اور کہنے لگا: اے سوار اندر آجا، تیرے ساتھ دس آدمی اور ہوں تو وہ بھی سر آنکھوں پر۔

بہرام گور نیچے اترا۔ اس نے اپنا گھوڑا سقا کے حوالے کیا۔ سقا نے پہلے شطرنج کی بساط لاکر بہرام گور کے آگے بچھادی تاکہ وہ کچھ دیر اس میں مصروف رہے اور خود کھانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ کھانا تیار کرکے اس نے بہرام گور کو دستر خوان پر بلایا مہمان نے کھانا کھالیا تو سقا نے شراب سے اس کی تواضع کی۔ بہرام گور اس غریب سقا کی مہمان نوازی اور خندہ پیشانی پر متحیر تھا۔

کھانا کھاکر بہرام گور سوگیا۔ صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو لنبک سقا نے کہا: آج بھی میرے یہاں مہمان رہئے اور اگر آپ کا کوئی رفیق ہو تو اسے بھی یہیں بلا لیجئے۔ یہ کہہ کر سقا نے اپنی مشک اٹھائی اور پانی بیچنے چل دیا۔ وہ بہتیرا ادھر ادھر گھوما مگر کسی نے اس کا پانی نہیں خریدا۔ آخر کار اس نے بازار جاکر اپنا کرتا بیچا اور کرتے کی جگہ مشک کے نیچے رکھنے کا کپڑا جسم پر لپیٹ لیا۔ اس پیسے سے لنبک نے گوشت وغیرہ خریدا اور خوشی خوشی گھر لوٹا، میزبان اور مہمان نے کھانا کھایا اور اس طرح دوسرا دن بھی گذر گیا۔

تیسرے دن لنبک سقا نے پھر بہرام سے درخواست کی کہ آج اور ٹھہر جائیے بہرام مان گیا۔ سقا باہر نکلا اور ایک بوڑھے شخص کے پاس اس نے اپنی مشک گروی رکھ کر کچھ پیسے قرض لئے، اس کا گوشت خریدا اور گھر لوٹا۔ گھر پہونچ کر اس نے بہرام گور سے کہا آج کھانا بنانے میں میری مدد کرو۔ بہرام نے گوشت چولھے پر چڑھایا، کھانا تیار ہوا تو دونوں نے سیر ہو کر کھایا اور پھر شاہ ایران کی یاد میں شراب کا پیالہ نوش کیا۔

چوتھے دن لنبک سقانے کہا: اگرچہ میری کٹیا میں تم کو کوئی آرام نہیں ہے لیکن اگر شاہ ایران کا خوف نہ ہو تو دو ہفتے اور میرے یہاں مہمان رہ جاؤ۔

بہرام گور بولا: میں تین دن تیرا مہمان رہ چکا ہوں، اب اجازت دے۔ البتہ میں تیری مہمان نوازی کا ذکر کسی ایسی محفل میں ضرور کروں گا کہ تجھے خوشی بھی ہو گی اور فائدہ بھی۔

یہ کہہ کر بہرام گور خوش خوش شکار گاہ کو لوٹا۔ دن بھر وہ شکار کھیلتا رہا۔ شام ہوئی تو چپکے سے وہ براہام یہودی کے یہاں پہونچا۔ کنڈی کھٹکھٹائی اور کہا: میں شاہی فوج سے بھٹک گیا ہوں، راستہ سے واقف نہیں۔ اس اندھیری رات میں فوج تک پہونچنا مشکل ہے، اجازت ہو تو یہیں کسی گوشہ میں رات بسر کر لوں، تجھے کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔

نوکر نے بہرام گور کی بات اپنے مالک سے جاکر کہی۔ براہام نے جواب دیا۔ اس گھر میں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے لیکن بہرام گور نے پھر اصرار کیا اور کہا: صرف رات بھر ٹھہرنے دے، میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتا۔

براہام یہودی چڑکر بولا: بابا، اس گھر میں صرف ایک بھوکا ننگا یہودی رہتا ہے تیرے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں، جا لوٹ جا۔

بہرام گور نے کہا: گھر کے اندر نہیں آنے دیتا، نہ آنے دے، دروازے ہی پر سونے دے۔

براہام نے کہا: تو دروازے پر سونا چاہتا ہے، لیکن اگر تیری کوئی چیز چوری ہو گئی تو پھر مجھے تنگ کرے گا۔ اچھا اندر آجا لیکن خبردار جو مجھ سے کچھ مانگا۔ یہ بھی

یاد رکھیو کہ اگر تو مر گیا تو تیرے کفن دفن کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے

بہرام گور دروازے کے پاس پڑا رہا ۔ ادھر براہام یہودی کو طرح طرح کے خدشے ہونے لگے ۔ اس نے اپنے دل میں کہا : یہ بے شرم یہاں سے ٹلتا ہی نہیں ، اب اس کے گھوڑے کی رکھوالی کون کرے ، پھر بہرام گور سے بولا : دیکھ اگر تیرے گھوڑے نے لید کی یا فرش کی کوئی اینٹ توڑ دی تو یہ تیری ذمہ داری ہے کہ لید میدان میں پھینک آئے اور کچی اینٹ کے بدلے پکّی اینٹ لاکر لگائے ۔

بہرام گور نے ہر شرط مان لی ۔ اس نے گھوڑے کو ایک طرف باندھا ، نیام سے تلوار نکالی ، نمد کا بستر بنایا اور زین کا تکیہ ، اور اس طرح پاؤں پھیلا کر سو رہا ۔

براہام یہودی نے پہلے گھر کا دروازہ بند کیا ۔ اس کے بعد دستر خوان بچھا کر کھانے بیٹھا اور بہرام گور کی طرف رخ کر کے بولا : میری بات غور سے سن ، دنیا میں جس کے پاس ہوتا ہے میری طرح کھاتا ہے اور جس کے پاس نہیں ہوتا تیری طرح ٹک ٹک دیکھتا ہے

بہرام گور نے کہا : میں نے یہ بات پہلے بھی سنی تھی مگر آج آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں ۔

کھانا کھا کر براہام نے شراب نوش کی اور پھر بہرام گور سے کہنے لگا :

کہ ہر کس کہ دارد دلش روشن است   درم پیش او چون یکی جوشن است

جس کے پاس دولت ہے اس کے دل میں گرمی ہوتی ہے ، دولت زرہ بکتر کی طرح آدمی کی حفاظت کرتی ہے ۔

کسی کو ندارد بود خشک لب   چنان چون توئی گرسنہ نیم شب

لیکن جس کے پاس پیسہ نہیں اس کا چہرہ اداس رہتا ہے اور تیری طرح

رات بھر بھوکا پڑا رہتا ہے۔

بہرام گور نے کہا: تیری دلچسپ باتیں مجھے یاد رہیں گی۔

صبح ہوئی تو بہرام گور اٹھا اور گھوڑے پر زین کس کے چلنے لگا۔ براہام یہودی سامنے آیا اور بولا: اے سوار، تو اپنے قول کا پکا نہیں ہے۔ تجھے یاد ہے کہ تو نے وعدہ کیا تھا گھوڑے کی لید صاف کر کے جنگل میں پھینک آئے گا۔ مجھے تیرے جیسا مہمان بالکل پسند نہیں۔

بہرام گور نے کہا: جا کسی کو بلا کر لا، وہ یہ گندگی صاف کر دے، میں اسے پیسے دیدوں گا۔

یہودی بولا: میرے پاس کوئی آدمی نہیں جو گندگی صاف کر کے جنگل میں پھینک آئے

بہرام گور نے یہ سنا تو اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے اپنی ریشمی پگڑی اتاری جس میں مشک و عنبر کی خوشبو بسی ہوئی تھی، اور اس سے گندگی صاف کر کے دور پھینک آیا۔ براہام جلدی جلدی گیا اور وہ پگڑی اٹھا لایا۔ بہرام گور اس یہودی کی خست دیکھ کر دنگ رہ گیا اور براہام سے کہنے لگا: اگر شاہ ایران کو تیرے استغنا کی بات معلوم ہو تو تجھے دربار میں بلند ترین مرتبہ عطا کرے اور تجھے اتنی دولت دے کہ تو ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔

بہرام گور یہ کہہ کر اپنے محل واپس ہوا۔ وہ ساری رات اس مسئلہ پر غور کرتا رہا لیکن کسی کو اس راز کی خبر نہیں دی۔ صبح ہوئی تو اس نے لنبک سقا اور براہام یہودی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ ایک ایماندار شخص یہودی کے گھر جائے اور اس کے یہاں جو کچھ مال و دولت ہو سب یہاں لے آئے۔

شاہی فرستادہ براہام کے گھر پہونچا تو سارے گھر کو روپیہ پیسہ، سونے چاندی اور فرش فروش سے بھرا ہوا پایا۔ مال اتنا زیادہ تھا کہ وہ سب کا حساب نہیں لگا سکا آخر اس نے ایک ہزار اونٹوں پر سارا سامان لدوایا اور بادشاہ کے حضور میں لایا۔ پھر بہرام گور سے بولا: اتنی دولت تو آپ کے خزانے میں بھی نہیں ہے۔ اب بھی جو کچھ وہاں رہ گیا ہے اسے دو سو گدھوں پر بار کیا جا سکتا ہے۔

بہرام گور اتنی دولت و ثروت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سو اونٹوں پر لدا ہوا سامان لنبک سقا کو انعام دیا۔ اس کے بعد یہودی کو مخاطب کر کے بولا: رات تیرے گھر جو سوار مہمان تھا اس نے مجھے تیری باتیں بتائیں۔

که هر کس که دارد فزونی خورد کسی کو ندارد همی پژمرد

کہ جس کے پاس ہوتا ہے سیر ہو کر کھاتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا یونہی ترستا رہتا ہے۔

کنون دست یازان ز خوردن بکش ببین زین سپس خوردن آبکش

اب تو کھانے سے اپنا ہاتھ کھینچ لے اور آج سے سقا کے کھانے کو تکتا رہ۔

اس کے بعد بہرام گور نے یہودی کو رات کی ایک ایک بات یاد دلائی اور اس کے ہاتھ پر چار درہم رکھتے ہوئے بولا: جا اس سے اپنا گذارہ کر۔

بے چارہ یہودی وہاں سے روتا پیٹتا ہوا چل دیا۔

○



یک داماد و سه عروس

ایک دولھا اور تین دلھن

فردوسی نے شاہنامہ میں بہرام گور کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کہیں وہ اس کی بہادری اور جوانمردی کی تعریف کرتا ہے اور کہیں اس کی عیش کوشی اور عشقبازی کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ذیل کی کہانی ایک دولھا اور تین دلھن میں بہرام گور کی عشقیہ زندگی کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔

یکے پای کوب و دگر چنگ ساز

سہ دیگر خوش آواز و اندہ گداز

بہرام گور کی مجلس میں ایک حسینہ رقص کر رہی تھی ، دوسری چنگ کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی اور تیسری اپنی دل نواز آواز سے کانوں میں رس گھول رہی تھی

ایک دن بہرام گور شکار کے ارادے سے نکلا ۔ اس کے ساتھ پورا لاؤ لشکر تھا ۔ بادشاہ کے آگے دس اونٹ اور سات ہاتھی تھے ۔ اونٹوں پر سونے کے کجاوے، چاندی کی رکاب اور ریشم کی جھول پڑی تھی ۔ ہاتھیوں پر فیروزہ کے تخت سجے تھے ۔ پیچھے پیچھے سو اونٹوں پر گانے بجانے والوں کا قافلہ تھا جن میں تیس غلام سنہرا پٹکا باندھے ہوئے تھے میر شکار اور اس کے عملہ کے ساتھ ایک سو ساٹھ باز و شاہین اور ایک سو ساٹھ چیتے تھے ۔ ہر چیتے کے گلے میں مرصع طوق اور سنہری زنجیر تھی ۔ باز و عقاب کے ساتھ ہی ایک کالا پرندہ بھی تھا جو بادشاہ کو بہت عزیز تھا ۔ اس کی آنکھیں سرخ پنجہ سیاہ اور چونچ زرد تھی ۔ اس پرندہ کا نام طغرل تھا اور اسے شاہ چین نے دوسرے تحائف کے ہمراہ بہرام گور کو بھیجا تھا ۔

بہرام جنگل میں پہونچا لیکن شکار کے بجائے وہ سمندر کی طرف چل پڑا ۔ شگون اچھا ہوتا تو سات سال میں وہ ایک بار سمندر کے کنارے ضرور جاتا تھا ۔ بہرام گور نے

دیکھا ساحل پر پرندوں کا ہجوم ہے۔ اس نے ڈھول تاشے کے ساتھ طغرل کو چڑیوں پر چھوڑا۔ طغرل پھرتی کے ساتھ ایک بگلے پر جھپٹا اور اچانک بادشاہ کی نظروں سے غائب ہو گیا۔

بہرام گور کو طغرل کے غائب ہونے کا بڑا افسوس ہوا۔ اتفاق سے پرندہ کے پاؤں میں گھونگھرو بندھے تھے۔ بہرام اس آواز پر پیچھا کرتا رہا یہاں تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑے باغ میں پہونچا۔ باغ میں ہر طرف دیبا و حریر کے فرش بچھے تھے، فراواں نعمت تھی اور غلام و کنیز ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ باغ کے وسط میں ایک حوض تھا اور حوض کے کنارے ایک بڈھا تین لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا:

به رخ چون بہار و به بالا بلند　　به ابرو کمان و به گیسو کمند

ان کے چہرے بہار کی طرح تروتازہ اور ان کے قد سرو کی طرح بلند تھے ان کے ابرو کمان کی طرح تنے ہوئے اور ان کے گیسو کمند کی طرح لمبے تھے۔

بہرام گور کی نظر ان لڑکیوں پر پڑی تو وہ طغرل کو بھول گیا۔ بادشاہ کو دیکھتے ہی وہ بڈھا جس کا نام برزین تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر زمین کو بوسہ دیتے ہوئے بولا: اگر بادشاہ سلامت خوشی کے چند لمحے اس باغ میں گذاریں تو ہمارا سر آسمان سے جا لگے گا۔

بہرام گور نے کہا: اس وقت ہم اپنے محبوب پرندہ طغرل کے کھو جانے پر رنجیدہ ہیں، طغرل پرندوں میں شمیر تھا۔

برزین نے عرض کیا: میں نے ابھی ایک سیاہ پرندہ کو جس کی چونچ سنہری تھی، اخروٹ کے درخت پر بیٹھے دیکھا ہے۔

بہرام گور نے ایک غلام کو ادھر دوڑایا۔ غلام تھوڑی دیر میں طغرل کو پکڑ لایا بہرام گور بہت خوش ہوا۔ برزین نے اس سے درخواست کی: اطمینان سے تشریف رکھئے اور شراب کا ایک پیالہ نوش کر لیجئے۔

بہرام گور حوض کے کنارے بیٹھ گیا۔ برزین نے اسے بلورین جام میں شراب پیش کی اور اس کے بعد لڑکیوں سے بولا: یہاں آؤ، دیکھو ہم آج کتنے خوش نصیب ہیں کہ اس باغ میں بہرام بادشاہ آیا ہے۔

لڑکیاں خوبصورت ٹوپی پہنے ہوئے سامنے آئیں۔ ایک رقص کر رہی تھی، دوسری چنگ بجا رہی تھی اور تیسری گانا گا رہی تھی۔

بہرام گور نے پوچھا: یہ لڑکیاں کون ہیں؟ برزین نے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں اور اپنے فن میں یکتا، ایک رقاصہ ہے، دوسری چنگ نواز اور تیسری گلوکار۔ پھر وہ تیسری سے بولا: بہرام بادشاہ کی تعریف میں کوئی گانا گاؤ۔ چنگ چھیڑا گیا اور لڑکی نے یہ گانا شروع کیا:

نمانی مگر بر فلک ماہ را　　　نشائی مگر خسروی گاہ را

تیرا جمال آسمان کے چاند سے بڑھ کر ہے، تیری شان وشوکت شاہی دربار سے کہیں زیادہ ہے۔

بہ گلنار ماند ہمی چہر تو　　　بہ شادی بخندد دل از مہر تو

تیرا خوبصورت چہرہ انار کے پھول کی طرح ہے، تیری محبت دل کے لئے

سرمایۂ مسرت ہے۔

سپاہی کہ بیند کمند ترا ہمی بازوی زورمند ترا
بدرّد دل ومغز جنگ آوران وگرچند باشد سپاہی گران

فوج کتنی ہی بڑی ہو لیکن تیری کمند سے بچ نہیں سکتی۔ پہلوان کیسا ہی طاقتور ہو تیرے ہاتھ کا وار اس کے سر اور سینہ کو ایک ساتھ چیر کر رکھ دیتا ہے

بہرام گور نے ساز وآواز کا یہ حسن دیکھا تو جی جان سے فدا ہو گیا۔ پھر برزین سے بولا: بادشاہوں میں مجھ سے بہتر داماد نہیں ملے گا۔ تو اگر اپنی تینوں بیٹیوں کو میرے عقد میں دیدے تو میں تجھے آسمان پر پہونچا دوں گا۔

برزین نے بسروچشم بہرام گور کی تجویز قبول کی اور جہیز کے لئے بہت سارا سیم وزر اور فرش ولباس نذر کرنا چاہا مگر بہرام گور نے قبول نہیں کیا اور کہا: یہ سارا مال تیرے پاس ہی رہے، تو اس سے عیش ونوش کی محفلیں سجاتا رہ۔

برزین نے باقاعدہ تینوں لڑکیاں بہرام گور کی خدمت میں پیش کیں اور کہا: آج سے یہ تینوں تیرے پاؤں کی دھول ہیں۔ پھر اس نے کہا: میں ان کا تعارف کرا دوں، بڑی لڑکی کا نام ماہ آفریدہ ہے، منجھلی کا فرانک اور چھوٹی کا شنبلید۔

بہرام گور نے حکم دیا سواری کے لئے چار سنہری عماریاں آمادہ کی جائیں۔ عماریاں تیار ہوئیں تو بہرام اپنی تینوں دلھن کے ساتھ بیٹھ کر روانہ ہوا۔ چالیس غلام ان کے جلو میں چل رہے تھے اور باادب باملاحظہ کی صدا لگا رہے تھے۔ آخر بہرام اپنے محل میں اترا۔ دلھنیں ایک زرنگار محل میں اتاری گئیں۔ بہرام خوشی سے مست حجلۂ عروسی میں داخل ہوا اور ایک ہفتہ تک عیش وعشرت اور ناؤ ونوش میں مصروف رہا ۞

بیژن اور منیژہ

بیژن اور منیژہ کی داستان شاہنامہ کی سب سے خوبصورت کہانی ہے۔ بیژن ایرانی پہلوان گیو کا بیٹا اور منیژہ شاہ توران افراسیاب کی بیٹی تھی۔ دونوں کا تعلق دو دشمن ملکوں سے تھا اس لئے ان کے عشق میں بڑی بڑی رکاوٹیں آئیں آخرکار رستم نے انھیں نجات دلائی اور منزل مقصود تک پہونچایا۔ فردوسی نے یہ باتیں بڑی خوبصورتی اور وضاحت سے بیان کی ہیں۔

داستان بیژن و منیژہ اس امر کا ثبوت ہے کہ فردوسی جہاں میدان جنگ کی منظرکشی میں استاد ہے وہیں رومانی واقعات کی تصویرکشی میں بھی اسے یدطولیٰ حاصل ہے۔



بیژن و منیژه

ثریا چون منیژہ برسر چاہ
دو چشم من بد و چون چشم بیژن

میں آسمان پر جھلملاتی ثریا کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا جیسے بیچارہ
بیژن کنویں کی منڈیر پر بیٹھی منیژہ کو تکا کرتا تھا۔

کیخسرو ایک روز خوش خوش تخت شاہی پر جلوہ افروز تھا۔ دراصل وہ اکوان دیو کی شکست اور اپنے باپ سیاوش کی انتقام جوئی کے بعد جشن منا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب سے لبریز یاقوت کا پیالہ تھا۔ مطرب چنگ کے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ امرا اور پہلوان چاروں طرف بیٹھے تھے اور عیش و طرب کی محفل برپا تھی۔ سب کے ہاتھوں میں جام تھا، جن میں شراب نہیں گویا عقیق سیال تھا، گلدانوں میں پھول کھل رہے تھے۔

میر دربار کمربستہ بادشاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور اس کے فرمان کا منتظر تھا کہ اتنے میں حاجب نے آکر اطلاع دی کہ کچھ ارمنی جو ایران توران سرحد پر رہتے ہیں، وہاں سے چل کر دادخواہی کے لئے آئے ہیں، اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میر دربار نے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ بادشاہ نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی۔ ارمنیوں کا گروہ دربار میں آیا اور گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگا:

جہاں پناہ، ہمارا شہر ایک طرف توران کی سرحد سے ملتا ہے اور دوسری طرف ایران سے۔ شہر کے اس طرف ایک ہرا بھرا جنگل ہے جس میں بے شمار میوہ دار درخت ہیں، ہمارا سہارا یہی جنگل ہے۔ لیکن ادھر ہم پر مصیبت ٹوٹی، سارے

جنگل میں جنگلی سور آگئے ہیں ، انھوں نے دانت مار مار کر درختوں کو توڑ ڈالا ہے، گھانس روند دی ہے اور تمام جانوروں کو وحشت زدہ کر دیا ہے ۔ اب ہم فریاد کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔

کیخسرو کو ان کی حالت پر رحم آیا ۔ اس نے حکم دیا دستر خوان بچھایا جائے اور اس میں ہیرے جواہرات بکھیر دئے جائیں۔ اس کے بعد وہ پہلوانوں کی طرف رخ کر کے بولا : کون ہے جو اس مصیبت کو دور کرے اور واپس آکر یہ تمام انعام لے لے ۔

سبھی پہلوان چپ رہے ۔ مگر بیژن آگے بڑھا اور اس نے خود کو اس خدمت کے لئے پیش کیا ۔ بیژن کا باپ گیو بھی وہاں موجود تھا ، وہ بیٹے کی بیجا جرأت پر سرزنش کرتے ہوئے بولا :

به فرزند گفت این جوانی چراست　　　به نیروی خویش این گمانی چراست

تجھے اپنی جوانی پر اتنا ناز ہے اور اپنی طاقت کا اتنا گھمنڈ ہے ؟

جوان ار چه دانا بود با گهر　　　ابی آزمائش نگیرد هنر

جوان کیسا ہی عقل مند اور اعلیٰ خاندان سے ہو لیکن آزمائش و امتحان کے بغیر کوئی فن نہیں سیکھ سکتا ۔

به راهی که هرگز نرفتی مپوی　　　برشاه خیره مبر آب روی

جس راہ پر کبھی نہیں چلے ، اس پر چلنے کی کوشش نہ کرو ، اور اس طرح بادشاہ کے سامنے اپنی آبرو ریزی نہ کرو ۔

بیژن کو باپ کی بات سے تکلیف ہوئی مگر وہ اپنے ارادہ پر ڈٹا رہا ۔ کیخسرو بیژن کی جوانمردی سے خوش ہوا اور اس نے گرگین کو حکم دیا کہ اس مہم میں بیژن کی رہنمائی کرے

بیژن نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ اس نے اپنے ساتھ سدھائے ہوئے باز اور چیتے لئے۔ آخر وہ گرگین کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں دونوں شکار کھیلتے ہوئے جارہے تھے، جنگل میں پہونچ کر پہلے انھوں نے زبردست آگ جلائی اور اس پر ایک مادہ گورخر بھون کر نوش کیا۔ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو گرگین نے کہا مجھے سونے کے لئے کوئی جگہ چاہئے۔

بیژن نے کہا: یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں جنگ کر سوروں کا مقابلہ کرنا ہے۔ تو تالاب کے کنارے بیٹھ کر تاک لگا۔ اگر کوئی سور میری تلوار سے بچ نکلے تو اپنے گرز سے اس کا سر کچل دے۔ لیکن گرگین ہاتھ بٹانے کے لئے تیار نہیں ہوا اور بولا: دیکھ اس مہم کے لئے تو نے کمر باندھی ہے تو کیں نے، شاہی انعام بھی تجھی کو ملے گا۔ میرا کام تو صرف راہنمائی ہے اور بس۔

بیژن کو بڑا تعجب ہوا کہ گرگین اس انداز میں بات کر رہا ہے۔ آخر وہ اکیلا ہی جنگل کو چل دیا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک آبدار خنجر تھا۔ ادھر سوروں نے وہ ہنگامہ برپا کر رکھا تھا کہ خدا کی پناہ۔ ایک سور نے بیژن پر حملہ کیا اور اس کی زرہ پھاڑ ڈالی۔ بیژن نے خنجر سے اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ اس طرح اس نے بہت سے سوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے سر کاٹ کر رکھ لئے تاکہ بادشاہ ایران کو لے جا کر دکھائے اور ایرانیوں سے اپنی شجاعت کی داد لے۔

بیژن کی مردانگی دیکھ کر گرگین کو افسوس ہوا۔ اس نے بظاہر تو اس کی تعریف کی مگر دل میں یہ سوچ کر پیچ و تاب کھانے لگا کہ اب اس کی بڑی بدنامی ہوگی۔ چنانچہ وہ بیژن کے خلاف طرح طرح کے منصوبے بنانے لگا۔

رات کو دونوں پہلوان شراب پی چکے تو گرگین نے ایک نیا نقشہ پیش کیا۔ اس نے کہا یہاں سے دو روز کی راہ پر ایک ہرا بھرا جنگل ہے۔ وہاں کے پانی سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ ساری فضا میں مشک و عنبر کی خوشبو بسی رہتی ہے۔ سبزہ کا یہ عالم ہے گویا ریشم کی چادر پھیلا دی گئی ہو۔ اس موقع پر ہر سال وہاں جشن ہوتا ہے خوبصورت لڑکیاں جمع ہوتی ہیں، اٹھکھیلیاں کرتی ہیں اور ہرن کی طرح کلیلیں بھرتی ہیں۔ انھیں میں افراسیاب کی لڑکی منیژہ بھی ہوتی ہے جو ستاروں میں آفتاب ہے منیژہ کے ساتھ سو کنیزیں ہوتی ہیں:

همه دخت ترکان پوشیده روی　　　همه سرو قد و همه مشکبوی

ہر ترک لڑکی کے چہرہ پر نقاب ہوتی ہے، ان کا قد سرو کی طرح نکلتا ہوا اور ان کا جسم مشک کی طرح معطر ہوتا ہے۔

همه رخ پر از گل همه چشم خواب　　　همه لب پر از می به بوی گلاب

ان کے رخساروں پر گویا گلاب کھلے ہوتے ہیں، ان کی آنکھوں میں شراب کا خمار ہوتا ہے اور ان کے ہونٹوں سے گلاب سی شراب چھلکی پڑتی ہے۔

گرگین نے کہا: ہم ان حسینوں کے پاس چلیں ان میں چند کو انتخاب کر کے خسرو کے پاس لوٹ جائیں۔

بیژن اس خبر سے بہت خوش ہوا۔ دونوں جشن گاہ کی طرف روانہ ہوئے ایک دن کی راہ طے کرنے کے بعد وہ اس مرغزار میں پہونچے اور وہاں دو روز قیام کیا ادھر منیژہ اپنی سو کنیزوں کے ساتھ آئی۔ جشن کی تقریبات شروع ہوئیں منیژہ کے ساتھ چالیس عماری پر سیم وزر اور اسباب طرب لد کر آیا تھا۔ لڑکیوں

نے وہ دھماچوکڑی مچائی کہ الٰہی توبہ۔ گرگین کو معلوم ہوا کہ جنگل کی شہزادی آچکی ہے تو اس نے بیژن کو خبر دی کہ منیژہ نے آن کر راگ رنگ کی محفل سجائی ہے بیژن نے کہا: چلو قریب سے چل کر ان تورانی حسینوں کا نظارہ کریں۔

بیژن نے شاہانہ ٹوپی پہنی۔ کیخسروی ہار ڈالا۔ اور ایک شہزادے کی طرح بن ٹھن کر گھوڑے پر سوار ہوا اور تیزی سے جشن گاہ کے قریب پہونچا وہاں اس نے ایک درخت کے سائے میں پناہ لی، ساری فضا نغمہ و آہنگ سے گونج رہی تھی۔ ہر طرف خوبصورت لڑکیاں ٹہل رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا زمین پر ستارے اتر آئے ہیں۔ بیژن گھوڑے سے نیچے اترا اور چھپ کر لڑکیوں کو دیکھتا رہا مگر جب اس نے منیژہ کو دیکھا تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

ادھر سے منیژہ نے بھی یہ دیکھ لیا کہ ایک سوار شاہانہ ٹوپی لگائے ریشمی لباس پہنے کھڑا ہے۔ اس کا چہرہ سہیل یمانی کی طرح دمک رہا ہے۔ منیژہ نے فوراً اپنی دایہ کو بھیجا کہ پتہ لگائے کہ سوار کون ہے، آدمی ہے یا جن، اس کا نام کیا ہے اور کہاں سے یہاں آیا ہے؟

دایہ بیژن کے پاس پہونچی اور اسے اپنی بانو کا پیغام دیا۔ بیژن یہ پیغام سن کر پھول کی طرح کھل اٹھا اور بولا: میں گیو کا لڑکا بیژن ہوں۔ یہاں جنگلی سور مارنے آیا تھا۔ میں نے ان میں سے بہتوں کے سر کاٹ کر رکھ لئے ہیں تاکہ شاہ ایران کے پاس لے جا سکوں لیکن جنگل میں یہ منگل دیکھ کر اب واپس لوٹنے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی خواب میں منیژہ کا دیدار کر سکوں گا۔

بیژن نے دایہ کو قیمتی کپڑے اور جواہرات سے مرصع ایک جام دیا اور کہا

اگر تو میری مدد کرے تو تجھے بہت سا اور انعام دوں گا۔

دایہ نے بیژن کا پیغام منیژہ کو سنایا۔ منیژہ نے جوابی پیغام بھجوایا:

گر آئی خرامان بہ نزدیک من　　　　برافروزی این جان تاریک من

اگر تو میرے پاس آنے کی زحمت کرے تو اس تاریک دل میں خوشی کی دھوپ آجائے گی۔

بہ دیدار تو چشم روشن کنم　　　　در و دشت و خرگاہ گلشن کنم

تیرے دیدار سے آنکھیں روشن ہوں گی اور تیرے وجود سے پورا ماحول لہلہا اٹھے گا۔

بیژن کو اور کیا چاہئے تھا۔ وہ پیدل منیژہ کے خیمہ کی طرف چل پڑا۔ منزل جاناں تک پہونچا تو منیژہ نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور مشک و گلاب سے اس کے پیر دھوئے اس کے بعد دسترخوان بچھا اور نا ؤ و نوش کی محفل شروع ہوئی۔ بیژن اور منیژہ تین دن اور تین رات عیش و طرب میں مشغول رہے اور خیمہ سے باہر نہیں آئے۔ چوتھے روز منیژہ کو گھر واپس ہونا تھا مگر بیژن کے دیدار سے ابھی اسے سیری نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی اور اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ بیژن کو شراب میں بیہوشی کی دوا ملا کر پلادیں۔ بیژن شراب پیتے ہی بیہوش ہوگیا۔ کنیزوں نے اسے اٹھا کر ایک عماری میں لٹا دیا جو مشک و گلاب سے مہک رہی تھی۔

منیژہ کی سواری شہر کے قریب پہونچی تو کنیزوں نے بیژن کو چادر میں لپیٹ دیا۔ اس طرح رات کی تاریکی میں اسے شہزادی کے محل میں پہونچا

دیا گیا۔ وہاں اس کے کان میں ایک دوا ڈالی گئی۔ بیژن نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو منیژہ کی آغوش میں پایا۔ اب وہ سمجھا کہ گرگین نے اس طرح اسے ایک حسین جال میں پھنسا دیا ہے۔ منیژہ فوراً اٹھی اور اسے شراب کا پیالہ پیش کرتے ہوئے بولی:

بخور می، مخور ہیچ اندوہ و غم　　　که از غم فزونی نیابد نہ کم

شراب پی، غم نہ کھا، غم کا کوئی حاصل نہیں۔

اگر شاہ یابد ز کارت خبر　　　کنم جان شیرین بہ پیشت سپر

اگر افراسیاب کو پتہ چل گیا اور اس نے تجھے نقصان پہونچانا چاہا تو میں اپنی جان قربان کر کے تجھے بچا لوں گی۔

بیژن نے چند دن حسینوں کے جھرمٹ میں گذارے۔ آخر کار شاہی دربان کو پتہ چل گیا اور اس نے جا کر افراسیاب کو خبر دی کہ شہزادی منیژہ نے ایک ایرانی عاشق کو اپنے محل میں چھپا رکھا ہے۔

افراسیاب یہ خبر سن کر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے سوچا لڑکی کی ذات ہی خراب ہوتی ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر ہر باپ کو اپنی بیٹی کی فکر لگی رہتی ہے۔

افراسیاب نے گرسیوز کو حکم دیا کہ شاہی فوج فوراً محل کا محاصرہ کر لے اور بیژن کو دست بستہ میرے پاس لے آئے۔

گرسیوز سپاہیوں کو لے کر منیژہ کے محل پر پہونچا۔ اس نے سپاہیوں کو چھت اور دروازوں پر تعینات کیا اور خود محل کے اندر کودا تو کیا دیکھتا ہے بیژن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھا شراب پی رہا ہے اور

داد عیش دے رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر گرسیوز کا خون کھول اٹھا، وہ چیختے ہوئے بولا، کمینے، ذلیل، آج تو شیر کے جنگل میں آ پھنسا ہے، دیکھوں بچ کر کیسے نکلتا ہے۔

بیژن نہتا تھا، ذرا گھبرایا مگر فوراً اس نے موزے کے اندر سے خنجر نکالا اور گرسیوز کو للکار کر بولا: آج میں تیرا خون کر کے رہوں گا۔

گرسیوز نے پانسہ پلٹتے ہوئے دیکھا تو نرم پڑ گیا اور کہنے لگا: یقین کر میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہونچاؤں گا۔ گرسیوز نے بیژن کو ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر کسی ترکیب سے اس کا خنجر لے لیا اور پھر اسے دست بستہ افراسیاب کے سامنے لے آیا۔ افراسیاب نے پوچھا: تو میرے علاقے میں کیسے آیا؟

بیژن بولا: میں آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ میں جنگلی سور مارنے آیا تھا، وہاں میرا ایک باز کھو گیا۔ میں اس کی تلاش میں نکلا۔ چلتے چلتے تھک گیا اور ایک سرو کے نیچے سو رہا۔ اس دوران میں وہاں سے ایک پری کا گذر ہوا۔ پری مجھے اٹھا کر چل پڑی اور میرا گھوڑا وہیں رہ گیا۔ تھوڑی دیر میں ادھر سے شہزادی منیژہ کی سواری گذری۔ پری نے منتر پڑھ کر مجھے شہزادی کی عماری میں لٹا دیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں محل کے اندر تھا۔ اس معاملہ میں نہ میں قصور وار ہوں اور نہ منیژہ۔ سارا قصور اس کم بخت پری کا ہے۔

افراسیاب نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے۔ تو مکر و فریب سے توران پر قبضہ کر کے یہاں کے لوگوں کو ملیامیٹ کرنا چاہتا ہے۔

بیژن نے کہا: حضور بہادر تیر و تلوار سے مسلح ہو کر میدان جنگ میں جاتے

ہیں۔ میں نہتا کیسے یہ بات سوچ سکتا ہوں ، اگر بادشاہ میری بہادری دیکھنا چاہتا ہے تو مجھے اسپ وگرز عطا کرے۔ اگر ہزاروں ترکوں میں سے ایک کو بھی زندہ چھوڑا تو میرا نام بیژن نہیں۔

افراسیاب یہ سن کر اور غصہ ہوا۔ اس نے حکم دیا ، بیژن کو چوراہے پر پھانسی دیدی جائے۔ سپاہی بیژن کو گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اسے واقعی افسوس تھا کہ موت آئی بھی تو کہاں ، وطن اور اعزہ سے دور۔

ایا باد بگذر بہ ایران زمین　　پیامی زمن بر بہ شاہ گزین

اے صبا ایران جاکر شہنشاہ کو میرا پیغام دے۔

بہ گردان ایران رسانم خبر　　وز آنجا بہ زابلستان برگذر

بہ رستم رسان زود از من خبر　　بدان تا ببندد بہ کینم کمر

اور وہاں کے پہلوانوں کو میری گرفتاری کا حال بتا اور زابل جاکر رستم سے کہہ کہ میرے انتقام کے لئے کمربستہ ہو جائے۔

بگویش کہ بیژن بہ سختی درست　　تنش زیر چنگال شیر ترست

رستم سے کہنا کہ بیژن بڑی مصیبت میں ہے ، یوں سمجھو وہ شیر نر کے پنجے میں پھنس گیا ہے۔

بہ گرگین بگو ای یل سست رای　　چہ گوئی تو با من بہ دیگر سرای

اور گرگین سے کہنا اے فریبی تو آخرت میں خدا کو کیا جواب دے گا

بہر حال بیژن کو یقین ہو گیا کہ موت سامنے ہے اور چند لمحوں میں اس

کی زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

اتفاقاً ادھر سے پیران پہلوان گذرا۔ اس نے دیکھا ترک سپاہی پھانسی کا تختہ ٹھیک کر رہے ہیں اور اس میں سے ایک لمبی رسی لٹک رہی ہے۔ پیران نے پوچھا کیا بات ہے۔ سپاہیوں نے کہا بیژن کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ پیران لپک کر بیژن کے پاس پہونچا۔ اس نے دیکھا بیژن تقریبًا ننگا ہے۔ اس کے ہاتھ پشت سے بندھے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

پیران نے بیژن سے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ بیژن نے سارا واقعہ سنایا پیران کو اس پر ترس آیا۔ اس نے جلادوں سے کہا ذرا ٹھہرو، اور خود دوڑ کر افراسیاب کی خدمت میں پہونچا۔ بادشاہ کے سامنے وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کورنش بجالایا اور زمین ادب چوم کر عرض کیا: جہاں پناہ، بیژن کو معاف کر دیا جائے۔

افراسیاب نے کہا! پیران میں تجھے کیسے بتاؤں کہ میری بیوقوف بیٹی نے اس بڑھاپے میں مجھے کیسا رسوا کیا ہے۔ لوگ شاہی حرم کی خواتین پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ ساری رعایا اور فوج مجھ پر ہنس رہی ہے۔ اب تو یہ کلنک کا ٹیکا ہمیشہ کے لئے لگ گیا۔

لیکن پیران برابر بیژن کی معافی کی درخواست کرتا رہا۔ آخر کار افراسیاب نے حکم دیا کہ بیژن کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ اس نے گرسیوز سے کہا: بیژن کو زنجیروں میں جکڑ کر کسی اندھے کنویں میں ڈال دو اور اس کا

منہہ بھاری پتھروں سے چن دو تاکہ وہ اس تاریکی میں سسک سسک کر دم توڑ دے ۔اس کے بعد منیژہ کو محل سے گھسیٹتے ہوئے باہر لاؤ اور اس کنویں پر چھوڑ دو تاکہ وہ دیکھے کہ جس عاشق کے ساتھ اس نے محل میں عیش کئے ہیں اب وہ اس اندھے کنویں میں دم توڑ رہا ہے اور وہیں وہ بھی سسک سسک کر مر جائے ۔

گرسیوز نے حکم کی تعمیل کی ۔اس نے بیژن کو ایک کنویں میں قید کیا اور اس کے بعد منیژہ کو ننگے پاؤں ننگے سر گھسیٹتا ہوا لاکر وہاں چھوڑ دیا۔ منیژہ اس جنگل بیابان میں تنہا خون کے آنسو روتی اور آہ وزاری کرتی۔ وہ دن کو ادھر ادھر سے روٹی مانگ کر لاتی اور شام کے اندھیرے میں کنویں کے سوراخ سے اندر ڈال دیتی تاکہ بیژن کھا سکے ۔

ادھر گرگین ہفتہ بھر بیژن کا انتظار کرتا رہا۔جب وہ نہیں لوٹا تو گرگین اس کی تلاش میں نکلا لیکن کہیں بیژن کا پتہ نہیں چلا۔گرگین کو بہت افسوس ہوا آخر وہ اس جگہ پہونچا جہاں بیژن اسے چھوڑ کر منیژہ کے پیچھے گیا تھا۔ وہاں اسے بیژن کا گھوڑا ملا ۔اس کی لگام ٹوٹی ہوئی اور زین الٹی ہوئی تھی۔گرگین سمجھ گیا کہ بیژن پر کوئی آفت آئی ہے ۔ مایوس ہوکر وہ ایران لوٹ گیا۔گیو کو معلوم ہوا کہ گرگین واپس آرہا ہے تو وہ اسے لینے گیا ۔اس نے دیکھا گرگین کے ساتھ بیژن نہیں ہے البتہ بیژن کا گھوڑا سر جھکائے چلا آرہا ہے ۔گیو اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ وہ غش کھاکر گر پڑا۔ہوش میں آیا تو بیٹے کے غم میں اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے بال نوچ لئے اور فریاد وفغاں کرنے لگا : ہائے دنیا میں میرا ایک ہی بیٹا تھا جو میرے

دکھ درد کا شریک اور خوشی غم کا ساتھی تھا۔ لیکن بد قسمتی نے اسے بھی مجھ سے چھین لیا اور مجھے موت کے منہہ میں ڈھکیل دیا۔

گیو کی یہ حالت دیکھ کر گرگین نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس نے کہا ہم بہت سے جنگلی سور مار کر اور ان کے دانت نکال کر گھر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں ایک گورخر ملا۔ بیژن نے اپنے گھوڑے شبرنگ کو اس کے پیچھے دوڑایا اور اس کی گردن میں کمند پھینکی، گورخر نکل بھاگا، بیژن نے اس کا تعاقب کیا اور جنگل میں کہیں کھو گیا۔ میں نے سارا علاقہ چھان مارا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔

گیو کو گرگین کی بات پر یقین نہیں ہوا۔ اس نے جا کر بادشاہ کو سارا ماجرا سنایا۔ گرگین دربار میں طلب ہوا۔ اس نے وہاں بھی جھوٹ سچ داستان سنائی کیخسرو نے حکم دیا: گرگین کو گرفتار کر لیا جائے، پھر اس نے گیو کو تسلی دیتے ہوئے کہا: میرے سپاہی چاروں طرف جا کر بیژن کا پتہ لگائیں گے پھر بھی اگر اس کا پتہ نہ چلا تو فروردین کے مہینے میں جب ساری زمین گل و سبزہ سے ڈھک جاتی ہے میں جام جہاں نما میں دیکھوں گا کہ بیژن کہاں ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ جام جہاں نما میں دنیا کی ساری چیزیں نظر آتی ہیں۔

گیو کو بادشاہ کی بات سے ذرا تسلی ہوئی، دربار سے نکل کر اس نے خود بھی چاروں طرف اپنے آدمی بھیجے۔ یہ لوگ ایران اور توران کے سبھی شہروں میں بیژن کو ڈھونڈتے رہے مگر کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔

نوروز کا مبارک دن آیا تو گیو کیخسرو کے پاس گیا۔ اس کا دل افسردہ اور چہرہ اداس تھا۔ اس نے بادشاہ کو جام جم کی بات یاد دلائی، کیخسرو نے جام منگوایا

رومی قبا زیب تن کی اور پھر خدا کے حضور میں انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی۔ اس کے بعد اس نے جام میں دیکھنا شروع کیا۔ ساری کائنات وہاں نظر آ رہی تھی، کیخسرو ایک ایک ملک کو دیکھتا رہا۔ جب اس نے توران کے علاقے پر نظر جمائی تو بیژن ایک اندھے کنوئیں میں قید نظر آیا اور وہاں ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی بیٹھی ہوئی دیکھی بادشاہ نے گیو پہلوان کو خوشخبری دی کہ بیژن زندہ ہے البتہ وہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ناامید ہو چکا ہے اور اس کال کوٹھڑی میں گھل گھل کر جان دے رہا ہے۔

چو ابر بہاری بہ بارندگی   همی مرگ جوید بدان زندگی

اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی ہے اور وہ ایسی زندگی کے بجائے موت کی آرزو کر رہا ہے۔

یہ سن کر سب نے کہا کہ رستم کے علاوہ کوئی اور ایرانی پہلوان بیژن کو قید سے نجات نہیں دلا سکتا۔ چنانچہ بادشاہ نے رستم کو ایک خط لکھا اور گیو کو دے کر زابل بھیجا۔ گیو نے دو روز کا راستہ ایک دن میں طے کیا۔ اس نے رستم کو بادشاہ کا خط دیا تو وہ بیژن کی حالت پر تڑپ اٹھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ دراصل گیو کی بیوی رستم کی بیٹی تھی اور اس طرح بیژن رستم کا نواسہ تھا۔ ادھر رستم کی شادی گیو کی بہن سے ہوئی تھی۔ دونوں خاندانوں میں پرانی رشتہ داری تھی۔ رستم نے کہا: میں جب تک بیژن کو آزاد نہ کراؤں گھوڑے سے زین نہیں اتاروں گا۔

گیو چند دن رستم کے یہاں مہمان رہا۔ اس کے بعد دونوں شاہی دربار

کے لئے روانہ ہوئے۔ کیخسرو نے رستم کے اعزاز میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ شاہی باغ میں ایک درخت کے نیچے رستم کے لئے تخت بچھایا گیا اور اسے تاج زریں پیش کیا گیا!

درختی زد نداز بر گاہ شاہ   کجا سایہ گسترد بر تاج و گاہ

شاہی تخت کے سامنے ایک درخت لگایا گیا جس کا سایہ تخت اور تاج پر پڑتا تھا۔

تنش سیم و شاخش ز یاقوت زر   برو گونہ گون خوشہ ہای گہر

درخت کا تنا چاندی کا تھا، اس کی شاخیں سنہرے یاقوت کی تھیں اور اس پر رنگارنگ موتیوں کے خوشے لگے ہوئے تھے۔

عقیق و زبرجد ہمہ برگ و بار   فروہشتہ از شاخ چون گوشوار

درخت میں عقیق اور زبرجد کے پھول پتے تھے جو کسی حسینہ کے گوشوارے کی طرح شاخ سے آویزاں تھے۔

بدو اندرون مشک سودہ بہ می

ہمہ پیکرش سفتہ برسان نی

شاخوں میں جگہ جگہ سوراخ کرکے شراب میں گھلی ہوئی مشک بھر دی گئی تھی۔

بفرمود تا رستم آمد بہ تخت   نشست از بر گاہ زیر درخت

بادشاہ کا حکم پاکر رستم شاہی تخت کے مقابل بچھے ہوئے تخت پر رونق افروز ہوا۔

بادشاہ نے رستم سے کہا: بیژن کی رہائی صرف تیرے ہاتھوں ممکن ہے۔ رستم نے دست لبستہ عرض کیا میں شاہی فرمان بجالاؤں گا چاہے مجھ پر کچھ ہی کیوں نہ بیت جائے۔ رستم نے گرگین کی بھی سفارش کی اور اسے بھی بادشاہ سے معاف کر دیا۔

کیخسرو نے رستم سے پوچھا: اس کام کا نقشہ کس طرح تیار ہوگا؟

رستم نے کہا: مجھے مکر و فریب سے کام لینا پڑے گا اور ساری بات کو انتہائی راز میں رکھنا ہوگا ورنہ بیژن کو نقصان پہونچنے کا خطرہ ہے۔ نقشہ یہ ہے کہ میں سوداگر کا بھیس بدل کر توران جاؤں گا۔ اس کام کے لئے مجھے بہت سارا زر و جواہر درکار ہے تاکہ ظاہری کاروبار بھی کروں اور وقت پر لوگوں کو انعام بھی دے سکوں۔

رستم نے اپنے ہمراہ سات پہلوان اور ایک ہزار سوار لئے۔ توران کی سرحد پر پہونچ کر سواروں کو وہیں چھوڑا اور خود ساتوں پہلوانوں کے ساتھ توران میں داخل ہوگیا۔ سبھی پہلوان سوداگر کے بھیس میں تھے۔ رستم کے ساتھ دس اونٹوں پر جواہرات اور سو اونٹوں پر فوجی لباس لدے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے یہ لوگ ختن پہونچے۔ وہاں راستے میں پیران پہلوان ملا۔ رستم نے اس سے کہا: میں سوداگر ہوں۔ یہاں جواہرات بیچنے اور جانور خریدنے آیا ہوں۔ آپ جیسے لوگوں کی توجہ ہو تو میرا کام بن جائے گا۔

اس کے بعد رستم نے پیران کی خدمت میں ایک مرصع جام پیش کیا۔ پیران نے جام میں جڑے ہوئے جواہرات دیکھے تو دنگ رہ گیا۔ اس نے رستم کا شکریہ ادا کیا اور اسے اپنے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ مگر رستم نے کہا: اجازت ہو تو میں

شہر سے باہر کہیں قیام کروں۔
پیران نے رستم کے سامان کی حفاظت کے لئے پاسبان مقرر کر دئے۔ رستم نے ایک مکان کرایہ پر لیا اور وہاں تجارت کرنے لگا۔ ادھر ادھر سے کافی لوگ اس کے پاس ریشمی کپڑا اور جواہرات خریدنے آتے۔ اس طرح خاصا وقت گذر گیا۔
ایک دن منیژہ ننگے پاؤں ننگے سر رستم کے پاس آئی اور بولی: اے سوداگر تو تو ایران سے آیا ہے، کیا تجھے شاہ ایران، گیو، گودرز اور دوسرے پہلوانوں کے بارے میں کچھ اطلاع ہے۔ تجھے معلوم ہے بیژن اندھے کنویں میں قید ہے اور اس کے پاؤں میں بھاری بیڑی پڑی ہوئی ہے۔ کیا ایران میں بیژن کی گرفتاری کی خبر پہونچی ہے اور اس کے باپ نے اس کی رہائی کی کوئی تدبیر سوچی ہے؟
یہ باتیں سن کر رستم کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے بناوٹی غصہ میں کہا: میں کسی کیخسرو، گیو یا گودرز کو نہیں جانتا۔ میرا اس شہر سے کوئی تعلق نہیں جہاں کیخسرو رہتا ہے۔
یہ سن کر منیژہ رونے اور اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ منیژہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رستم کا دل پسیج گیا۔ اس نے کچھ کھانے کو منگوایا اور تفصیل سے ایک ایک واقعہ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ منیژہ نے پہلے اپنے بارے میں بتایا:

منیژہ منم دخت افراسیاب برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

میں افراسیاب کی بیٹی منیژہ ہوں، جب تک میں شاہی محل میں تھی، کبھی سورج نے مجھے بے پردہ نہیں دیکھا تھا۔

کنون دیدہ پر خون و دل پر ز درد ازین در بدان در، دو رخسارہ زرد

لیکن اب آنکھیں اشکبار ہیں، دل درد سے بوجھل ہے، چہرہ غم سے
زرد ہے اور در در کی ٹھوکر کھا رہی ہوں۔

همی نان کشکین فراز آورم　　　چنین راند ایزد قضا بر سرم

میں جو موتی چگتی تھی اب سوکھی روٹی مانگتی پھرتی ہوں، کیا کروں
خدا نے قسمت ہی کھوٹی بنائی۔

برای یکی بیژن شور بخت　　　فتادم زتاج و فتادم زتخت

اب اس بدبخت بیژن کے عشق میں تخت و تاج بھی گیا اور عزت
و آبرو بھی۔

منیژہ نے کہا: اے سوداگر تو ایران جائے اور شاہی دربار میں گیو اور رستم سے ملے تو انھیں بیژن کا حال ضرور بتا دینا۔

رستم نے منیژہ کے لئے بہت سا کھانا منگوایا۔ اس کے علاوہ ایک بھنے ہوئے مرغ کو روٹی میں لپیٹا اور اس میں چپکے سے اپنی انگوٹھی رکھ دی۔ پھر منیژہ سے بولا: یہ کھانا لے جاکر بیچارے بیژن کو کھلا دے۔

منیژہ دوڑی دوڑی آئی اور کھانے کی پوٹلی کنویں میں ڈال دی۔ بیژن اتنا کھانا دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے منیژہ سے پوچھا: یہ کھانا کہاں سے لائی ہے؟

منیژہ بولی: ایک ایرانی سوداگر آیا ہے اس نے تیرے لئے یہ کھانا بھیجا ہے۔

بیژن نے پوٹلی کھولی تو اس کی نظر انگوٹھی پر پڑی جس میں رستم کی فیروزہ والی مہر تھی۔ بے اختیار اس کی ہنسی نکل گئی۔ منیژہ نے اوپر سے سنا تو تعجب سے بولی: تجھے ہنسی کیوں آرہی ہے؟

بیژن نے پہلے اس سے وفاداری کی قسم لی۔ پھر اسے یہ راز بتایا کہ جس جواہر فروش نے تجھے یہ مرغ دیا ہے وہ دراصل میری خاطر توران آیا ہے۔ تو جاکر اس سے پوچھ کیا آپ صاحب رخش ہیں۔

منیژہ جلدی جلدی رستم کے پاس آئی اور اس سے بیژن کی بتائی ہوئی بات پوچھی۔ رستم سمجھ گیا کہ بیژن نے اس لڑکی کو سارا راز بتا دیا ہے چنانچہ اس نے بھی اسے اپنا اصلی نام بتا دیا اور اس سے کہا: اب تو کنوئیں پر جا، جب رات ہو جائے تو وہاں ڈھیر سی آگ جلا دینا تاکہ اس کی مدد سے میں کنوئیں تک پہونچ سکوں۔

منیژہ کنوئیں پر لوٹی۔ اس نے جنگل سے لکڑیاں جمع کیں اور جب رات ہو گئی تو لکڑیوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی۔

ادھر رستم نے زرہ پہنی، خدا سے دعا کی اور اپنے پہلوانوں کو لے کر کنوئیں کی طرف چل دیا۔ وہاں پہونچ کر ساتوں پہلوانوں نے بہت زور لگایا مگر کنوئیں کے پتھر کو نہیں ہٹا سکے۔ آخر رستم گھوڑے سے اترا۔ اس نے خدا کا نام لے کر پتھر کو اٹھا لیا اور اس زور سے جنگل میں پھینکا کہ سارا علاقہ لرز گیا۔ اس کے بعد کمند ڈال کر بیژن کو اوپر کھینچا۔ نکالنے سے پہلے ہی رستم بیژن سے یہ قول لے چکا تھا کہ وہ گرگین کو معاف کر دے گا۔

بیژن باہر آیا تو اس کا عجیب حلیہ تھا۔ الجھے ہوئے بال، بڑھے ہوئے ناخن، پھٹے ہوئے کپڑے اور ستا ہوا چہرہ۔ زنجیر کی وجہ سے اس کا سارا جسم لہولہان ہو رہا تھا اور درد کے مارے وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔

رستم بیژن کو لے کر گھر لوٹا۔ سب نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے۔ اونٹوں پر کجاوے کسے گئے اور گھوڑوں پر زین۔ رستم نے منیژہ کو پہلوانوں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود بیژن اور سپاہیوں کے ہمراہ افراسیاب کے فوجیوں سے لڑتا بھڑتا ایران واپس ہوا۔

ایرانی پہلوانوں کو رستم اور بیژن کے لوٹنے کی خبر ملی تو ان کے استقبال کے لئے گئے اور اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں شاہی دربار لے آئے۔ رستم نے بیژن کا ہاتھ پکڑ کر اسے کیخسرو کے حوالے کیا۔ بادشاہ نے بیژن سے کہا تجھ پر جو کچھ بیتی ہے اسے تفصیل سے بتا۔ بیژن نے تفصیل سے اپنے عشق اور قید کی باتیں بتائیں۔

کیخسرو نے بیژن کو بہت سارا انعام دیا کہ یہ سب لے جا کر منیژہ کی خدمت میں پیش کرے۔ اس میں دیبائے رومی کے سو جوڑے تھے جن پر ہیرے جواہرات ٹنکے تھے، دینار کے دس توڑے، فرش فروش، تاج اور غلام کنیز شامل تھے۔ اس کے بعد بادشاہ نے بیژن کو یہ نصیحت کی:

بہ رنجش مفرسای و سردش مگوی　　　نگر تا چہ آوردی او را بہ روی

منیژہ کو کبھی دکھی نہیں کرنا، اس سے کبھی سرد مہری نہ برتنا، اور ہمیشہ اس کا خیال رکھنا کہ غم سے اس کا چہرہ دھندلانے نہ پائے۔

تو با او جہان را بہ شادی گذار　　　نگہ کن بر این گردش روزگار

اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گذارنا لیکن گردش روزگار سے کبھی غافل نہ ہونا ۔

سکندر اور کید ہندی

شاہنامہ کی تاریخی داستانوں میں سے
ایک داستان سکندر اور کید ہندی کی ہے
سکندر دنیا کی تسخیر کے لئے نکلا تھا مگر جب وہ
ہندوستان پہونچا تو وہاں کے راجہ کی چال
میں آکر صلح کر بیٹھا اور اس کی راجکماری سے
شادی کر کے جنگ کا منصوبہ بھول گیا۔



اسکندر و کید هندی

کنون این زمان روز اسکندر است
کہ برتارک مہتران افسر است

اب سکندر کا زمانہ ہے سکندر جو سلاطین عالم کا سرتاج ہے

ہندوستان میں کید نام کا ایک راجا تھا، دانا اور عقلمند۔ راجا دس رات تک عجیب وغریب خواب دیکھتا رہا۔ قدرتی طور پر وہ پریشان ہوا۔ آخر اس نے حکم دیا کہ ملک کے تمام حکما جمع ہوں۔ جب سب جمع ہوئے تو راجا نے ان سے اپنا خواب بیان کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کی تعبیر نہیں بتا سکا۔ آخر ایک درباری بولا: حضور، مہران نام کا ایک گیانی ہے جو آدمیوں کی بستی سے دور جنگل بیابان میں رہتا ہے وہ ہم لوگوں کو انسان نہیں سمجھتا۔ جنگل کے جانور اس کے ساتھی ہیں اور درخت کی پتیاں اس کی خوراک۔ آپ کے خواب کی تعبیر صرف وہی بتا سکتا ہے۔ انجان لوگوں سے پوچھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

راجا کید یہ سن کر خوش ہوا۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا۔ دربار کے ودوانوں کو ساتھ لیا اور مہران کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ عرصہ تلاش کرنے کے بعد مہران مل گیا راجا نے کہا: اے جنگلی جانوروں میں جیون بتانے والے مہاتما، میں نے چند خواب دیکھے ہیں انھیں سنئے اور ایک ایک کی تعبیر بتائیے۔

اس کے بعد راجا نے اس مہا تما سے اپنا ایک ایک خواب بیان کیا۔
راجا نے کہا: ایک رات میں تنہا سویا۔ پرسکون رات تھی، مجھے بھی کوئی تشویش یا فکر نہیں تھی، آدھی رات گذری ہو گی کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا سا مکان ہے۔ بظاہر اس میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔ سامنے ایک چھوٹا روزن ہے۔ ایک ہاتھی اس روزن سے اندر جا رہا ہے۔ میں نے دیکھا اتنا بڑا ہاتھی اس روزن سے اندر چلا گیا مگر اس کی سونڈ روزن میں پھنس گئی۔

دوسری رات میں نے خواب دیکھا کہ شاہی تخت خالی ہے اور اس پر ایک اجنبی آدمی تاج پہنے بیٹھا ہے۔

تیسری رات میں نے خواب دیکھا ایک ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔ چار آدمی اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں مگر نہ تو ٹاٹ پھٹتا ہے اور نہ وہ لوگ تھکتے ہیں۔

چوتھی رات کو دیکھا کہ ندی کے کنارے ایک پیاسا شخص ہے اور اس پر ایک مچھلی پانی ڈال رہی ہے۔ پانی دیکھ کر پیاسا بھاگا۔ وہ آگے آگے اور پانی پیچھے پیچھے۔

پانچویں رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر اس کے تمام باشندے اندھے ہیں۔ لیکن کسی کو اپنے اندھے پن کا غم نہیں ہے۔ شہر میں خوب چہل پہل ہے اور سبھی اندھے خرید و فروخت میں مشغول ہیں۔

چھٹی رات خواب میں دوسرا شہر دیکھا جس میں سب لوگ بیمار ہیں مگر وہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ بیمار لوگ تندرست شخص کی عیادت کو جاتے ہیں۔ بلکہ جو لوگ بالکل جاں بلب ہیں وہ بھی تندرستوں کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔

ساتویں رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ جنگل میں ایک گھوڑا ٹہل رہا ہے

اس کے چار ہاتھ پاؤں اور دو منہہ ہیں۔ وہ دونوں منہہ سے گھاس کھا رہا ہے مگر فضلہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

آٹھویں رات کو یہ خواب نظر آیا کہ تین مٹکے رکھے ہیں۔ دو پانی سے بھرے ہوئے اور ایک خالی سوکھا ہوا۔ دو آدمی بھرے ہوئے مٹکوں سے پانی نکال نکال کر خالی مٹکے میں ڈال رہے ہیں لیکن بھرے ہوئے مٹکے اسی طرح بھرے ہیں اور خالی مٹکا بدستور خالی ہے۔

نویں رات میں نے یہ خواب دیکھا کہ ایک موٹی تازی گائے دھوپ میں سو رہی ہے اور اس کے پاس ایک سوکھا ہوا کمزور بچھڑا پڑا ہے اور وہ موٹی گائے اس مریل بچھڑے کا دودھ پی رہی ہے۔

دسویں رات یہ خواب نظر آیا کہ ایک چشمہ ہے جس کا پانی جگہ جگہ سے پھوٹ کر سارے جنگل کو سیراب کر رہا ہے لیکن خود اس چشمہ کا دہانہ خشک ہے۔

مہران نے راجہ کید کی باتیں سنیں تو اسے تسلی دیتے ہوئے بولا: ان خوابوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ نہ تو تیرے راج پر کوئی آنچ آئے گی اور نہ تیرے اونچے نام کو کوئی ٹھیس لگے گی۔ البتہ سکندر یونانی ایک زبردست فوج لے کر ہندوستان کی طرف آ رہا ہے۔ وہ ایران سے چل چکا ہے۔ اب اگر تو اپنی عزت محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو سکندر سے جنگ کی بات نہ کر، تیری کمزور فوج اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ البتہ تیرے پاس چار بے نظیر چیزیں ہیں جنھیں سکندر کی خدمت میں پیش کر کے تو اپنے راج پاٹ کو بچا سکتا ہے۔ ایک تیری لڑکی، دوسرا وہ حکیم جو تجھے دنیا کے راز سے آگاہ کرتا ہے، تیسرا تیرا طبیب اور چوتھا تیرا

پیالہ جس کا پانی دھوپ یا آگ میں گرم نہیں ہوتا اور پینے سے ختم نہیں ہوتا۔

اس کے بعد مہران بولا: اب میں تجھے خوابوں کی تعبیر بتاتا ہوں۔

وہ محل جس میں ایک چھوٹا سا روزن ہے دراصل دنیا ہے۔ ہاتھی جو روزن سے نکل گیا مگر اس کی سونڈ پھنسی ہوئی ہے ظالم اور لالچی راجا ہے جو اپنے پیچھے برا نام چھوڑ جاتا ہے۔

دوسرے دن تو نے اپنے تخت پر دوسرے کو بیٹھے دیکھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا آج تیرے پاس ہے کل کسی اور کے پاس۔ ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے تیسری رات تو نے دیکھا، ایک ٹاٹ کا ٹکڑا ہے جسے چار آدمی کھینچ رہے ہیں مگر نہ تو ٹاٹ پھٹتا ہے اور نہ کھینچنے والے تھکتے ہیں۔ یہ ٹاٹ دین خدا ہے اور وہ چار آدمی چار مذہبی گروہ ہیں جو دین خدا کو بچانے کے لئے ایک دوسرے کی جان کے درپے ہیں۔ ان میں سے پہلا مذہبی فرقہ ایران کے آتش پرستوں کا ہے دوسرا موسیٰ کے ماننے والے یہودیوں کا، تیسرا یونان کے فلسفیوں کا اور چوتھا دین اسلام ہے۔

چوتھا خواب اس پیاسے کے بارے میں ہے جو پانی سے بھاگ رہا ہے اور مچھلی اس پر پانی انڈیل رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا جب انسان علم و دانش حاصل کر کے ذلیل و رسوا ہو گا۔ وہ جاہلوں کو علم کے دریا کی طرف بلائے گا مگر جاہل فرار کرے گا۔ پھر بھی دنیاوی عزو جاہ جاہل کو ملے گا اور دانشمند یونہی خوار پھرے گا۔

پانچویں رات کے خواب میں تو نے اندھوں کا شہر دیکھا جس کے باشندے

اپنے کاروبار میں مشغول اور خوش ہیں۔یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب دانشمند خوار ہونگے، جاہل راج کریں گے۔سب لوگ جاہلوں کی مدح وثنا کریں گے۔لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ بولیں گے۔دل اور زبان میں تال میل نہیں ہوگا۔دل میں زہر بھرا ہوگا مگر زبان میں شہد گھلا ہوگا۔

چھٹی رات تونے بیماروں کو دیکھا جو تندرستوں کی عیادت کے لئے جارہے ہیں۔ایک وقت آئے گا کہ فقیر مالداروں کے چکر کاٹیں گے۔لیکن کچھ ہاتھ نہیں آئے گا پھر بھی مفت کی غلامی اور بندگی کرتے رہیں گے۔

ساتویں رات تونے ایک گھوڑے کو دیکھا جو دو منہہ سے کھا رہا تھا۔ایک دور آئے گا کہ تمام نعمتوں کے باوجود لوگوں کو سیری نہیں ہوگی۔لوگوں کو جو ملے گا خود ہی رکھ لیں گے، فقیر فقرا کو کھانا نہیں دیں گے، کوئی کسی غریب بیکس کی فریاد نہیں سنے گا۔

آٹھویں رات کو تونے خواب دیکھا کہ دو مٹکے پانی سے بھرے ہیں اور ایک خالی ہے، ایک زمانہ آئے گا جب درویش سوکھے گھڑے کی طرح بیکار ہو جائے گا اگر ساری دنیا ابر فیض سے سیراب ہو تو وہ سوکھے کا سوکھا ہی رہے گا۔

نویں رات کو تونے دیکھا کہ ایک فربہ گائے اپنے مریل بچھڑے کا دودھ پی رہی ہے۔یہ بھی بے فیض درویشوں کی طرف اشارہ ہے کہ امراان سے طلب فیض کریں گے مگر محروم رہیں گے۔

دسویں رات تونے ایک خشک چشمہ دیکھا جس کے چاروں طرف پانی ہے، یہ چشمہ سکندر ہے جو عقل سے بے بہرہ ہے مگر اس کی ہوس کشور کشائی نے ساری دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔

اے راجا، یہ سکندر کا دور ہے۔ وہ سلاطین عالم کا سرتاج ہے۔ جب سکندر یہاں پہونچے تو اسے یہ چاروں چیزیں پیش کر کے اپنی جان اور آبرو بچا لے۔ سکندر یہ چیزیں پاکر خوش ہو جائے گا اور یہاں سے چلا جائے گا۔

راجا کید نے مہران کی باتیں غور سے سنیں۔ اس کے بعد وہاں سے اٹھا۔ مہران کو تعظیم بجا لایا اور سکون قلب کے ساتھ گھر واپس ہوا۔

ادھر سکندر نے ایران کو فتح کر کے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور برابر آگے بڑھتا رہا۔ وہ جس شہر کے پاس پہونچتا اس کے دروازے یونانی فوج کے لئے کھول دئے جاتے۔ آخر وہ راجا کید کے ملک میلاد کی سرحد پر پہونچا۔ لشکر نے وہاں پڑاؤ کیا۔ اور راجا کو سکندر نے یہ خط لکھا:

کامیاب اور عقل مند بادشاہ وہ ہے جو ایسا کوئی کام نہ کرے جس میں پریشانی ہو یا جس کا انجام خراب ہو۔ بادشاہ کو چاہئے کہ خدا پر بھروسہ کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ امید و بیم کا سرچشمہ وہی ہے اور یہ سمجھے کہ تخت و تاج ہماری بدولت ہے اور دنیا کے تمام بادشاہ ہمارے زیر سایہ ہیں۔ ہم تمہارے پاس یہ خط بھیج رہے ہیں، اسے پڑھنے کے بعد دیر نہ کرو۔ رات ہو تو صبح کی روشنی کا انتظار نہ کرو بلکہ فوراً ہماری خدمت میں حاضر ہو، لیکن اگر تم نے ہماری بات کو نظر انداز کیا تو یہ سمجھ لو ہم اپنی دھن کے پکے ہیں تمہارے تخت و تاج کو روند کر رکھ دیں گے۔

راجا کید کو سکندر کا خط ملا تو اس نے قاصد کو پاس بلا کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور بولا: میں سکندر کے فرمان سے بیحد خوش ہوں اور کبھی اس سے عہد شکنی نہیں کروں گا لیکن، اگر میں یونہی منہہ اٹھا کر اس کے پاس چل دوں

تو یہ بات نہ خدا کو پسند آئے گی اور نہ سکندر کو۔

چنانچہ راجا نے اپنے منشی کو حکم دیا کہ سکندر کے خط کا جواب لکھے۔ خط میں خدا کی تعریف کے بعد یہ مضمون تھا:

دنیا کے نیک لوگ بڑے بادشاہوں کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ مجھے بھی زیب نہیں دیتا کہ آپ سے کوئی راز رکھوں۔ میرے پاس چار چیز ہے جو دنیا میں اب تک نہ کسی کے پاس رہی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ پہلے انھیں آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں، اس کے بعد بھی اگر شہنشاہ کا حکم ہوا تو غلام خود حاضر ہوگا۔

سکندر نے خط پڑھ کر قاصد کو پھر دوڑایا کہ جا راجا سے پوچھ کر آ کہ تیرے پاس کیا چیز ہے جو دنیا میں اب تک کسی کے پاس نہیں رہی ہے۔ ہم نے دنیا کی ہر چیز دیکھی ہے۔ کیا تیرے پاس آسمان سے کوئی نئی چیز اتری ہے۔

راجا نے قاصد کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا: پہلے میری لڑکی ہے۔

که گر بیندش آفتاب بلند — شود تیره از روی آن ارجمند

کہ اگر آفتاب اس کا چہرہ دیکھ لے تو پھیکا پڑ جائے گا۔

کمند است گیسوش همرنگ قیر — همی آید از دو لبش بوی شیر

اس کی سیاہ زلفیں کمند کی طرح لمبی ہیں۔ حالانکہ اس کے ہونٹوں سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے۔

خم آرد ز بالای او سرو بن — در افشان کند چون سر آید سخن

سرو اس کے قد کو دیکھ کر جھک جاتا ہے، وہ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

چو خامش بود جای شرم است و بس

چو او در زمانہ ندید است کس

وہ خاموش رہتی ہے تو شرم و حیا کی پتلی معلوم ہوتی ہے،

سچ تو یہ ہے دنیا میں اس کی نظیر نہیں ہے۔

راجا نے کہا: دوسرے یہ کہ میرے پاس ایک پیالہ ہے کہ اگر بادشاہ اسے پانی یا شراب سے بھردے اور دس سال تک اپنے ندیموں کے ساتھ پیتا رہے تو پیالہ خالی نہیں ہوگا۔

تیسرے میرے پاس ایک طبیب ہے جو آنسو دیکھ کر بیماری کا پتہ چلا لیتا ہے۔ اگر وہ سکندر کے پاس ہو تو بادشاہ کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

چوتھے میرے دربار میں ایک فلسفی ہے جو دنیا کی ساری چیزوں سے واقف ہے۔ وہ آپ کو آنے والے واقعات اور چاند سورج کی گردش سے باخبر رکھے گا۔

قاصد نے جاکر سکندر کو یہ باتیں بتائیں۔ بادشاہ نے کہا: اگر راجا یہ چاروں چیز مجھے دیدے تو میں اس کے راج کو کوئی نقصان نہیں پہونچاؤں گا بلکہ چپکے سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔

چنانچہ سکندر نے دس دانا اشخاص کو چنا اور انھیں یہ خط دے کر راجا کے پاس بھیجا کہ یہ دس آدمی ان چاروں چیزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھیں گے اور اگر یہ شہادت دے دیں کہ یہ چیزیں واقعی دنیا میں بے نظیر ہیں تو ہم فرمان صادر کریں گے کہ راجا کید جب تک زندہ ہے ہندوستان کا راجا رہے گا۔

راجا نے آنے والوں کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش

آیا۔ دوسرے دن اس نے اپنی لڑکی کو آراستہ پیراستہ کر کے تخت زریں پر بٹھایا اور ان دس بڈھوں کو اسے دیکھنے کے لئے بھیجا۔

بڈھوں نے دیکھا شہزادی محل میں تخت پر بیٹھی ہے اور اس کے جمال سے سارا ماحول جگمگا رہا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ انھیں ایسا لگا جیسے ان کے پاؤں میں وہاں سے آگے بڑھنے کی سکت نہیں ہے۔ سب کے سب وہیں جم کر رہ گئے۔

راجا نے دیکھا سکندر کے آدمی لڑکی کے پاس سے نہیں لوٹے تو اس نے اپنا آدمی بھیج کر انھیں بلوایا اور ان سے دیر کرنے کی وجہ پوچھی۔ یونانیوں نے کہا: اسے راجا، کسی نے آج تک شاہی محل میں ایسی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی ہوگی۔ ہم میں سے ہر شخص سکندر کو لڑکی کے صرف ایک عضو کی تعریف لکھے گا۔ چنانچہ وہ خط لکھنے بیٹھے۔ ہر ایک نے لڑکی کے کسی نہ کسی عضو کے بارے میں تھوڑا تھوڑا لکھا اور سارا خط بھر گیا۔

سکندر نے اپنے آدمیوں کا خط پڑھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے فوراً پیغام بھیجا: اب چاروں چیزیں لے کر آجاؤ۔ اس سے زیادہ ثبوت درکار نہیں ہے۔ راجا کو ہمارا یہ فرمان سنادو کہ آج سے کوئی اس کے درپے آزار نہ ہو۔ اس نے ہمیں جو کچھ دیا ہے دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا۔

راجا کید سکندر کا فرمان پاکر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ آخر وہ حملۂ سکندری سے بچ گیا۔ اب راجا نے خزانے کا منہہ کھول دیا۔ اس نے راجکماری کے لئے بہترین کپڑے جواہرات، زیورات، تاج اور مسند کا انتخاب کیا۔ تین سو اونٹوں پر جواہرات اور کپڑے

لادے گئے۔ دس خچر دینار اٹھائے ہوئے تھے۔ سو اونٹوں پر سیم و زر اور درہم لدے تھے۔ دس ہاتھی شہزادی کا تخت زریں لے جا رہے تھے۔

لڑکی آنسوؤں میں ماں باپ سے رخصت ہوئی۔ اس کے ساتھ راجا کا مخصوص جام بھی تھا، راجا کا طبیب اور اس کا مخصوص حکیم بھی لڑکی کے ہمراہ تھے

راجکماری سج دھج کر سکندر کے محل میں پہونچی۔ اس کے ارغوانی چہرہ پر سیاہ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔

دو چشمش چو دو نرگس اندر بہشت　　　　که گفتی که از ناز دارد سرشت

اس کی آنکھیں آسمانی نرگس کی طرح تھیں گویا وہ ناز و ادا کے خمیر سے بنی تھی۔

به قد و به بالا چو سرو روان　　　　ز دیدار او دیده و بد ناتوان

اس کا قد سرو جیسا نکلتا ہوا تھا آنکھیں اس کے جلوے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔

سکندر نگه کرد بالای او　　　　همان موی و روی و سراپای او

همی گفت کاینت چراغ جهان　　　　همی آفرین خواند اندر نهان

بر آن دادگر کو سپهر آفرید　　　　بر آنگونه بالا و چهر آفرید

سکندر نے جب اس لڑکی کی صورت، گیسو اور سراپا پر نظر ڈالی تو بولا یہ لڑکی نہیں دنیا کا نور ہے۔ وہ دل ہی دل میں خدا کی تعریف کرنے لگا کہ جس خدا نے آسمان اور بہشت بنایا ہے اسی نے یہ قد اور صورت بھی بنائی ہے۔

پھر سکندر نے پادریوں کو بلایا اور عیسائی مذہب کے مطابق اس لڑکی سے شادی کی۔ اس نے اپنی دلھن کو سونے چاندی کے زیورات سے اس قدر لاد دیا کہ لڑکی کے لئے چلنا دشوار ہو گیا۔

شادی سے فارغ ہو کر سکندر نے راجا کے فرستادہ لوگوں کو آزمانا شروع کیا۔ اس نے ایک پیالہ میں گائے کا گھی بھر کر حکیم کے پاس بھیجا کہ اس سے اپنے جسم پر مالش کر لو تھکن جاتی رہے گی۔

حکیم نے گھی دیکھا تو سمجھ گیا اس میں کیا راز ہے۔ اس نے گھی میں ایک ہزار سوئیاں ڈال کر سکندر کو واپس کر دیا۔ سکندر نے ایک لوہار کو بلوا کر سوئیوں کا ایک مہرہ بنوایا اور پھر اسے حکیم کے پاس بھیجا۔ حکیم نے اس کالے لوہے سے ایک چمکتا ہوا آئینہ بنا کر سکندر کو واپس کر دیا۔ سکندر نے آئینہ کو نمی میں رکھا تاکہ وہ زنگ سے سیاہ پڑ جائے اس نے دوبارہ زنگ خوردہ آئینہ حکیم کے پاس بھیجا۔ حکیم نے اسے اس طرح صیقل کر دیا کہ دوبارہ زنگ نہ لگنے پائے۔

سکندر نے یہ دیکھا تو حکیم کو اپنے پاس بلایا اور اس سے گھی کے پیالہ کا راز پوچھا۔

حکیم نے کہا: تو نے گھی کا پیالہ بھیج کر یہ بتانا چاہا کہ تو عقل و دانش میں تمام فلاسفہ سے برتر ہے۔ میں نے یہ جواب دیا کہ دنیا کے دانا اور پارسا لوگ ہمیشہ آمادہ و مستعد رہتے ہیں چاہے ان کی جان پر کیوں نہ بن جائے، اور اگر ان کے سامنے کوئی رکاوٹ آتی ہے تو وہ اس سے بآسانی گذر جاتے ہیں، اس کے علاوہ میں نے تجھے یہ بتانا چاہا کہ میری باتیں بال سے زیادہ باریک اور تیرا دل لوہے سے زیادہ زنگ خوردہ ہے۔ تو نے جواب دیا: زندگی کے اتنے سال بیت گئے اور دل غم سے زنگ آلود ہو گیا ہے۔ اب

یہ سیاہی کیسے جائے گی ؟

میں نے کہا تیرے دل پر علم و دانش کی ایسی صیقل کروں گا کہ پھر کبھی زنگ کا اثر نہیں ہوگا۔

سکندر کو حکیم کی بات بہت پسند آئی۔ اس نے اسے خلعت اور سیم و زر سے نوازا لیکن حکیم نے قبول نہیں کیا اور کہا : میرے پاس ایک گوہر ہے جو سیم و زر سے زیادہ روشن ہے۔ مال و دولت شیطان کی دین ہے مگر یہ خدا کا عطیہ ہے۔ اس گوہر کی حفاظت کے لئے رات کو پاسبان کی ضرورت نہیں اور سفر میں چور ڈاکو کا خطرہ نہیں یہ علم و عقل کا گوہر ہے۔ اس گوہر کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور نعمت کی ضرورت نہیں

سکندر حکیم کی باتیں سن کر حیرت زدہ ہوگیا اور کہنے لگا : میں دل و جان سے تیری فہم و فراست و پند و نصیحت پر فدا ہوں۔

اس کے بعد سکندر نے راجا کے طبیب کو بلا کر پوچھا : مریضوں میں سب سے زیادہ دکھی کون ہے ؟

طبیب نے جواب دیا : سب سے زیادہ دکھی شخص وہ ہے جو ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتا ہے۔ زیادہ کھانے سے صحت بالکل خراب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد طبیب نے سکندر سے کہا : میں تجھے جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی ایک دوا دیتا ہوں جس سے تو ہمیشہ تندرست رہے گا۔ یہ دوا جب تیرے پیٹ میں پہونچے گی تو تجھے بھوک بڑھے گی۔ زیادہ کھائے گا تو بدہضمی نہیں ہوگی۔ اس دوا سے جسم میں خون بڑھے گا ، قوت آئے گی طبیعت میں انبساط پیدا ہوگا ، چہرے پر شگفتگی رہے گی ، بال سفید نہیں ہوں گے ، خیالات پاکیزہ رہیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تو زندگی سے جلد

ناامید نہیں ہوگا۔

سکندر نے کہا میں نے کسی طبیب سے ایسی دوا کے بارے میں نہیں سنا ہے اگر تو مجھے یہ دوا دے تو میں دل و جان سے تیرا خیر خواہ رہوں گا اور تیرے بارے میں کبھی کوئی غیبت نہیں سنوں گا۔

چنانچہ طبیب تنہا پہاڑ پر گیا۔ اسے تمام جڑی بوٹیوں کا گیان تھا، وہ جانتا تھا کہ زہر کیا ہے اور تریاق کیا۔ اس نے بیکار گھاس پھونس ایک طرف ڈالی اور مفید جڑی بوٹیوں سے ایک دوا تیار کی جو جسم سے ہر طرح کا زہریلا اثر دور کر دے۔ طبیب نے سکندر کے جسم کو اس دوا سے دھویا۔ اور اس کی صحت کا بہت خیال رکھنے لگا۔

لیکن سکندر راتوں کو سونے کے بجائے عورتوں کے ساتھ عیش کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی صحت گرنے لگی۔ ایک دن طبیب نے دیکھا سکندر کی آنکھوں سے ضعف جھلک رہا ہے۔ اس نے کہا: شب و روز ہم بستری کرنے سے جوان بھی جلدی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تو تین رات سے نہیں سویا ہے۔

سکندر نے پہلے تو انکار کیا مگر طبیب نے اس کی بات نہیں مانی، لیکن احتیاطاً طبیب نے طاقت کی دوا بنا کر رکھ لی۔ اس رات سکندر اکیلا سویا اور کسی حسینہ کے ساتھ ہم بستر نہیں ہوا۔ صبح کو طبیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو دوا پھینک دی، طبیب خوش تھا۔ سکندر کو بھی اس کی حذاقت پر مسرت ہوئی۔ اس نے حکم دیا دسترخوان لگایا جائے اور رقص و مطرب کا اہتمام کیا جائے، اس کے بعد سکندر نے طبیب سے پوچھا تو نے اتنی محنت سے دوا تیار کی تھی، پھر پھینک کیوں دی،

طبیب نے کہا: آپ کل رات تنہا سوئے، اگر بادشاہ تنہا سوئیں تو دوا کی

ضرورت نہیں ہے۔

سکندر بیحد خوش ہوا۔ اس نے طبیب کو روپیوں کی تھیلی اور سنہری لگام والا مشکی گھوڑا انعام دیا۔

اس کے بعد سکندر کی خدمت میں راجا کا بھیجا ہوا پیالہ لایا گیا اور اس میں ٹھنڈا پانی بھر اگیا۔ لوگ صبح سے رات تک اس پیالے سے پیتے رہے مگر پانی اتنے کا اتنا ہی رہا۔ سکندر نے حکیم کو بلایا اور اس سے پوچھا: ہندوستان جادو منتر کا ملک ہے مگر اس پیالے کا راز کیا ہے کہ اس کا پانی کم نہیں ہوتا۔

حکیم نے کہا: اے بادشاہ، اس پیالے کے بنانے والوں نے برسہا برس خون جگر کھایا ہے۔ راجا کید کے دربار میں ساری دنیا کے جیوتشی جمع ہوئے اور انھوں نے دن رات برسوں تک ایک ایک ستارے کی خصوصیت کا مطالعہ کیا۔ تب کہیں جا کر یہ پیالہ تیار ہوا جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح یہ پیالہ جب خالی ہونے لگتا ہے تو آسمان کے پانی کو جذب کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس عمل کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

سکندر کو حکیم کی بات پسند آئی۔ اس نے راجا کے لوگوں سے کہا: میں نے راجا کید سے جو معاہدہ کیا ہے اسے کبھی نہیں توڑوں گا کیونکہ اس نے مجھے ایسی چار چیزیں دی ہیں جن کا دنیا میں جواب نہیں۔

سکندر نے راجا کو بہت سارا انعام اور سو مرصع تاج بھیجے اور جو مزید سونا چاندی اور جواہرات بچ رہے اسے اس نے پہاڑوں میں بکھیر دیا۔ سچ ہے سکندر کے بعد کسی نے دنیا میں پھر اتنا خزانہ نہیں دیکھا۔

داستان پیدایش شطرنج



شطرنج کی ایجاد

فردوسی نے نوشیرواں کی سلطنت کا ذکر
کرتے ہوئے شطرنج کی ایجاد کا قصہ بیان
کیا ہے۔ ممکن ہے یہ قصہ اصل میں ہندوستانی
ہو، ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے

ہمیشہ ہمی ریخت خونین سرشک
برآں درد شطرنج بودش پزشک

وہ ہمیشہ خون کے آنسو بہاتی رہتی اور اس درد وغم میں شطرنج طبیب کا کام کرتا۔

ہندوستان کے شہر سندل میں جمہور نام کا ایک راجا تھا۔ بست و کشمیر سے چین تک اس کا راج پھیلا ہوا تھا۔ راجا کے پاس بہت خزانہ اور لشکر تھا۔ ہر جگہ اس کا حکم چلتا تھا۔ راجا بہت عقلمند تھا اور رعایا اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ آخر راجا کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام گورکھا گیا۔ کچھ ہی دن بعد راجا بیمار پڑا۔ اس نے مہارانی کو وصیت کی کہ میرے بعد میرا بیٹا راج کرے گا۔

کچھ دنوں کے بعد راجا اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے انتقال کے بعد فوج اور دربار کے لوگ جمع ہوئے۔ عورت مرد، بوڑھے جوان سبھی مشورہ کے لئے بیٹھے سب نے کہا یہ چھوٹا بچہ کچھ نہیں جانتا۔ نہ فوج کو حکم دے سکتا ہے نہ عدل و انصاف کر سکتا ہے، نہ خود سے تخت پر بیٹھ سکتا ہے اور نہ اپنے سر پر تاج رکھ سکتا ہے، اس لئے وہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر کسی معقول شخص کو راجا نہیں بنایا گیا تو سارے راج میں افراتفری پھیل جائے گی۔

چنانچہ طے پایا کہ راجا کے بھائی "مائے" کو جو شہر دنبر کا حاکم ہے بلایا جائے اور

اسے راج گدی پیش کی جائے۔ مالے اپنے شہر سے سندل آیا اور تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے مرحوم بھائی کی بیوی کو اپنی رانی بنالیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مالے سے بھی رانی کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام طلمند رکھا گیا۔ مالے اسے بہت چاہتا تھا لیکن ابھی طلمند دو سال کا اور گوسات سال کا ہوا تھا کہ مالے بھی بیمار پڑا اور دو ہفتے کے بعد گذر گیا

سندل کے لوگوں کو مالے کی موت کا بہت افسوس ہوا وہ ایک مہینہ تک اس کی موت کا ماتم کرتے رہے۔ اس کے بعد فوج کے افسر اور شہر کے دانا لوگ جمع ہوئے اور اگلے راجا کے بارے میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار سب نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ جب تک راجکمار چھوٹے ہیں، رانی راج کی دیکھ بھال کریں۔ سبھی لوگ رانی کی انصاف پسند طبیعت کے مداح تھے اور اسے تاج و تخت کے لائق سمجھتے تھے، چنانچہ لوگ رانی کے پاس گئے اور اس سے بولے: یہ راج تیرے دونوں بیٹوں کا ہے لیکن جب تک وہ بڑے نہیں ہوتے تو ہی راج کر، جب وہ بڑے ہو جائیں تو راج پاٹ ان کے حوالے کرکے خود ان کے وزیر کی جگہ لے لینا۔

رانی نے جنتا کی بات مان لی اور بڑی خوبی کے ساتھ راج کرنے لگی۔ اس نے دو عقل مند برہمن اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کئے۔

وقت گذرتا گیا۔ رفتہ رفتہ بیٹے بڑے ہو گئے۔ کبھی کبھی وہ الگ الگ اپنی ماں سے پوچھتے کہ ہم میں سے کون بہتر ہے؟ ماں جواب دیتی تم میں سے جو زیادہ عقلمند پرہیزگار اور دیندار ہے وہ بہتر اور برتر ہے۔ پھر وہ یہ پوچھتے یہ ملک کس کا ہے اور یہ خزانہ اور تخت و تاج کس کے حصہ میں آئے گا؟

ماں دونوں سے الگ الگ کہتی: یہ ملک اور تخت و تاج تیرا ہے۔ اس

جواب سے دونوں بیٹے اپنی اپنی جگہ خوش ہوتے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے دل میں حسد نے انگڑائی لینی شروع کی اور وہ تخت وتاج کے لئے پریشان ہونے لگے۔ کبھی کبھی من ہی من میں بہت رنجیدہ ہوتے، ادھر دونوں کے مصاحبین بھی ان کو بھڑکاتے رہتے اور کہتے: اپنی ماں سے جاکر پوچھو ہم میں سے کون بہتر اور لائق ہے اور کون بھلے برے حالات میں زیادہ صبر وتحمل سے کام لے سکتا ہے،

آخر ایک دن ماں نے کہا: شہر کے عقل مند لوگوں اور نیک دل برہمنوں کو بلاکر مشورہ کیا جائے کہ ان دونوں بیٹوں میں کون تاج وتخت کا سزاوار اور انصاف پسند ہے۔ ظلم وستم سے راج کا ناس ہو جائے گا۔

ماں کی بات سن کر بڑا بیٹا گو بولا: ماں سچ سچ بتا، بہانے مت بنا۔ اگر میں راج کے لائق نہیں ہوں تو طلحند کو راج دیدے۔ میں چھوٹے بھائی کی طرح اس کی خدمت کروں گا۔ لیکن اگر میں عمر اور عقل دونوں میں طلحند سے بڑا اور اپنے باپ کا سچا بیٹا ہوں تو طلحند سے کہہ دے کہ وہ راج گدی پر نظر نہ لگائے اور اس بات کا زیادہ برا نہ مانے۔

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا: بیٹا، راج تاج کے لئے زیادہ دکھی نہ ہو، یہ دنیا کسی کی نہیں۔ دیکھو تیرا باپ راجا جمہور کتنا اچھا آدمی تھا، مرگیا۔ اس کے بعد تیرا چاچا تخت پر بیٹھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی چل بسا۔ تو بڑا ہے، طلحند سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا ہے، پھر کیوں بلا وجہ کڑھتا ہے؟

ماں نے کہا: میری مجبوری یہ ہے کہ اگر تم میں سے ایک کو راج پاٹ کے لئے انتخاب کروں تو دوسرا میرا دشمن ہو جائے گا اور پھر خون خرابے پر اتر آئے گا۔ لیکن میں کہتی ہوں اس چند روزہ دنیا کے لئے خون خرابہ کرنے سے کیا فائدہ؟

ادھر طلحند یہ سوچتا کہ ماں گو کی حمایت کرتی ہے، وہ ماں سے کہتا: صحیح ہے کہ گو مجھ سے عمر میں بڑا ہے، لیکن مجھ سے بہتر اور شایستہ نہیں ہے۔ افسوس میرا باپ جوانی میں مر گیا اور مجھے تاج و تخت کا وارث نہیں بنا سکا۔ ماں، تیرا من گو میں لگا ہے اور تو اسی کو مجھ سے آگے بڑھانا چاہتی ہے۔

ماں نے قسم کھائی کہ اس کے من میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اس نے دیکھا اب سمجھانے بجھانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس لئے اس نے دوسری راہ اختیار کی اس نے ملک کے تمام عقل مند لوگوں کو جمع کیا ان کے سامنے دونوں راجاؤں کے خزانے کی کنجیاں رکھ دیں اور انھیں بتایا کہ دونوں بیٹے راج پاٹ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں

گو نے طلحند سے کہا: تجھے معلوم ہے میرا باپ جمہور تیرے باپ ماے سے عمر اور عقل میں بڑا تھا۔ لیکن تیرا باپ شریف آدمی تھا کیونکہ بڑے بھائی کے جیتے جی اس نے کبھی تخت و تاج کی ہوس نہیں کی، اور بڑا بننے کی کوشش نہیں کی، لیکن اگر تو تخت پر بیٹھے اور میں چھوٹے بھائی کی طرح تیری سیوا کروں تو خدا لگتی بات نہیں ہو گی۔ بہتر ہے ہم چند دانا لوگوں کو جمع کریں اور وہ لوگ جو فیصلہ کریں اسے مان لیں کیونکہ وہ لوگ بہر حال ہم سے علم و عقل میں بہتر ہیں۔

چنانچہ گو اور طلحند کی طرف سے ایک ایک دانا شخص کا انتخاب کیا گیا۔ دونوں نمائندے گفتگو کرنے بیٹھے۔ گو کا نمائندہ بولا کہ سندل کا تاج و تخت گو کو ملنا چاہئے اور اس کو یہاں کا راجا بنانا چاہئے۔ مگر طلحند کا آدمی اپنے راجکمار کے حق میں دلیلیں پیش کرتا رہا۔ چنانچہ صلاح و مشورہ کے بجائے دونوں ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

آخر کار ایوان میں دو تخت بچھائے گئے۔ گو اور طلحند ان پر بیٹھے اور ان کا

اپنا اپنا نمائندہ ان کی داہنی طرف براجمان ہوا۔ انھوں نے شہر کے تمام سمجھدار اور بڑے بوڑھوں کو جمع کیا اور تخت کے دائیں بائیں بٹھایا۔ نمائندوں نے حاضرین سے پوچھا کہ آپ لوگ ان دونوں راجکماروں میں سے کس کو راجا بنانا چاہتے ہیں۔

برہمنوں نے دیکھا کسی ایک راجکمار کا انتخاب مشکل ہے۔ اس سے بات جنگ تک پہونچے گی۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اور شرفا مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ ایک کمیٹی بنا کر باہم مشورہ کریں اور جو طے پائے اس سے دونوں راجکماروں کو مطلع کر دیں۔

یہ کہہ کر برہمن اور بڑے بوڑھے لوگ راج نواس سے باہر نکلے۔ ان کے من اداس اور چہرے اترے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ساری رات صلاح مشورہ کرتے رہے مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچے۔ صبح کو سارے شہر میں اسی بات کا چرچا تھا۔ ایک گروہ گو کا حامی تھا دوسرا طلحند کا۔ طلحند کے حمایتی گو کو گالی دے رہے تھے اور گو کے طرفدار اس پر جان چھڑکنے کو تیار تھے۔ اس طرح سندل راج میں ہر طرف فتنہ و آشوب اٹھ کھڑا ہوا۔ سچ ہے جب کسی گھر میں دو حکم چلنے لگیں تو گھر برباد ہو جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ حل نکالا کہ دونوں راجکمار الگ الگ علاقے کے راجا بن جائیں اور اپنی ہوس حکمرانی کی خاطر ملک کو برباد نہ کریں۔ لیکن دونوں راجکماروں کے سر میں جنگ کا دھواں بھرا تھا اور چہرے پر نفرت کی شکن ابھر آئی تھی۔ ہر ایک دوسرے سے تسلیم و اطاعت کا مطالبہ کرتا تھا۔ آخر صلاح مشورہ کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور جنگ و جدال کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

چنانچہ گو اور طلحند کے طرفدار جوق درجوق جنگ کے لئے جمع ہونے لگے۔

طلحند نے اپنے باپ کے خزانے کا منہ کھول دیا۔ سپاہیوں کو زرہ اور ہتھیار دیا اور خود مسلح ہو کر جنگ کے لئے آمادہ ہو گیا۔ گو نے بھی فوجی لباس پہنا، خود لگائی باپ کی روح پر درود بھیجا اور مدافعت کے لئے تیار ہو گیا۔ ہاتھیوں پر ہودج کسے گئے۔ جنگ کا بگل بجا اور ایسے زور کا رن پڑا کہ نہ پوچھو۔

گو اور طلحند کی فوجوں نے دو میل کے فاصلہ پر لشکر آرائی کی۔ دونوں راجکمار ہاتھی پر سوار ہو کر میدان جنگ میں آئے۔ ان کے آگے آگے پیدل سپاہی نیزہ اور سپر لئے ہوئے تھے۔ گو کو یہ سوچ کر بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ میدان جنگ میں اتنے بے گناہ مارے جائیں گے۔ چنانچہ اس نے بھائی کے پاس پھر قاصد بھیجا کہ اب بھی جنگ سے باز آ اور دشمن کی بات میں آکر سچائی کا راستہ نہ چھوڑ اور ایسا نہ کر کہ ہمارے باپ دادا کا ملک ویران ہو جائے اور یہاں شیر گیدڑ آ بسیں۔ اگر تو صلح کر لے اور یہاں سے کہیں دور چلا جائے تو میں تجھے بے پناہ جاگیر اور مال و دولت دوں گا اور تجھے جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ لیکن اگر تو جنگ پر تلا ہے تو انسانوں کی بربادی اور ملامت و پشیمانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

طلحند کو بھائی کا پیغام ملا تو اس نے کہلوایا جنگ میں بہانے بازی سے کام نہیں چلتا۔ تو نہ میرا بھائی ہے نہ میرا دوست اور نہ میرے خاندان کا فرد، جنگ تو نے چھیڑی ہے میں نے نہیں اور اس کا گناہ بھی تیری گردن پر ہو گا۔ بدنامی اور پشیمانی تیرے حصہ میں آئے گی۔ رہ گئی یہ بات کہ تو مجھے جاگیر اور تخت و تاج دینا چاہتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اگر تیرے راج میں میں کوئی جاگیر یا انعام قبول کروں تو خدا مجھے موت دے۔

طلحند نے قاصد سے مزید کہا کہ اب میں فوج لے کر میدان جنگ میں اتر رہا ہوں

تاکہ گو کو دست لبستہ اسیر کروں اور اس کے فوجیوں کو تلوار کے گھاٹ اتاروں۔

بھائی کا جواب سن کر گو کو بڑا صدمہ ہوا لیکن اپنے عقل مند مشیروں کے کہنے پر پھر بھی وہ سختی سے باز رہا اور بھائی کو سمجھا بجھا کر رام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دوبارہ یہ پیغام بھیجا کہ بھائی بھائی کی جنگ مناسب نہیں ہے۔ ہمارے چاروں طرف دشمن ہیں۔ اگر ہم نے جنگ کی تو فغفور چین سے لے کر شاہ کشمیر تک سبھی ہم پر لعن طعن کریں گے۔ اب بھی تو میرے پاس آجا میں تجھے زر و جواہر اور اسپ و فیل سبھی عنایت کروں گا۔ مجھے جنگ کی کوئی خواہش نہیں ہے۔

لیکن طلحند نے پھر سخت جواب دیا اور کہا میں نے تیری بکواس سن لی ہے، تو ہے کون جو مجھے جاگیر و دولت دینے کا وعدہ کرے، خزانہ اور طاقت تو میرے پاس ہے، زمین و آسمان پر میری حکومت ہے، البتہ تو جو اس قدر بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا ہے تو یہ لگتا ہے کہ چیونٹی کے پر نکل آئے ہیں۔ اب چونکہ تو کھائی میں گرنے والا ہے اس لئے چکنی چپڑی باتیں کر کے مجھے جنگ سے روکنا چاہتا ہے، بس اب جنگ کی تیاری کر، دیر نہ کر۔

ناچار گو جنگ کے لئے آمادہ ہوا۔ صبح کو جب نیلے آسمان پر پیلی کرنیں پھیلیں تو دونوں فوج آمنے سامنے صف آرا ہوئی۔ میمنہ اور میسرہ ترتیب دیا گیا۔ دونوں راجکمار اپنی اپنی فوج کے قلب میں تھے ان کے پہلو میں ان کے دانا مشیر تھے۔ گو نے کہا میری فوج کا کوئی بہادر حملہ میں پہل نہ کرے بلکہ جہاں کھڑا ہے وہیں علم کو اٹھائے رہے، جنگ میں جلد بازی عقل مندوں کا شیوہ نہیں ہے۔ ہم یہیں ٹھہر کر دیکھیں کہ طلحند اپنی فوج کو لے کر کیسے آگے بڑھتا ہے۔ ہم نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش

کی مگر افسوس اس نے ہماری بات نہ سنی، اگر اس جنگ میں خدا نے ہمیں فتح دی تو خبردار کوئی فوجی محض مال غنیمت کے لئے کسی کا خون نہ کرے اور اگر ہمارے بہادروں سے کوئی مخالف فوج کے قلب تک پہونچ جائے اور طلحند پر قابو پالے تو مبادا اسے کوئی نقصان نہ پہونچائے۔

تمام فوج نے گو کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ ادھر طلحند نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اگر قسمت سے ہمیں فتح نصیب ہوئی تو دشمن کے ایک ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ البتہ اگر گو اسیر ہو جائے تو اسے نہ تو مارو اور نہ سخت سست کہو بلکہ اس کے ہاتھ باندھ کر گھسیٹتے ہوئے میرے پاس لے آؤ۔ آخر جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں شہزادے اپنے اپنے بہادروں کے ساتھ قلب سے باہر نکلے اور شام تک کشت و خون کرتے رہے۔ شام کو گو نے طلحند کے سپاہیوں سے کہا تم میں سے جو شخص بھی میری طرف آجائے میں اس کی جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔

یہ اعلان سن کر طلحند کے بہت سے سپاہی گو کی پناہ میں آگئے، بہت سارے مارے گئے اور بقیہ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے، طلحند اکیلا رہ گیا، گڈریا رہ گیا تھا گلہ چلا گیا تھا۔

طلحند کو تنہا دیکھ کر گو نے پھر کہا: بھائی، اب تو بھی اپنے محل کو واپس ہو جا اور اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کر۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تجھے کوئی ضرر نہیں پہونچاؤں گا۔

طلحند بھائی کی یہ پیشکش سن کر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ آخر کار وہ میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک محفوظ جگہ پہونچ کر اس نے اپنے سپاہیوں کو پھر جمع کیا، انھیں انعام و اکرام سے نوازا اور ان کی طرف سے مطمئن ہو کر گو کو پھر پیغام بھیجا

کہ ہمت ہے تو دوبارہ شیر کی طرح میدان جنگ میں آ اور اس چیلنج کو ہوائی نہ خیال کر۔

گو کو دوبارہ طلحند کا یہ سخت پیغام ملا تو اسے افسوس ہوا لیکن اس نے پھر بھی نرمی سے کام لیا، محبت آمیز باتیں کیں اور بھائی کو صلح کی دعوت دی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہلوایا کہ اگر تو جنگ پر بضد ہے تو میں بھی آمادہ ہوں۔ لیکن اس بار ہم یہاں سے دور سمندر کے کنارے جنگ کریں گے اور فوج کے چاروں طرف خندق کھود دیں گے تاکہ فوج محصور رہے اور شکست کے بعد فرار نہ کر سکے۔

طلحند نے اپنی فوج کے جرنلوں کو بلایا اور ان کے سامنے گو کا نقشہ رکھتے ہوئے بولا: جب لڑنا ہی ہے تو کیا دشت و بیابان اور کیا کوہ و دریا۔ طلحند نے کہا اگر ہماری جیت ہوئی تو میں تم سب کو دولت سے مالا مال کر دوں گا۔

طلحند اور گو کی فوجیں سمندر کی طرف چلیں۔ دونوں بھائی آمنے سامنے صف آرا ہوئے۔ خندقیں کھود کر انھیں پانی سے پر کیا گیا۔ راجکماروں نے قلب سے اپنی اپنی فوج کی کمان سنبھالی۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ گرد و غبار سے فضا اٹ گئی۔ سمندر میں زلزلہ سا آگیا۔ میدان جنگ کا عجیب نقشہ تھا، کہیں کسی کا پیٹ چاک تھا، کہیں کسی کا سر کٹا تھا، ہر طرف انسانوں کے اعضا بکھرے ہوئے تھے، زمین پر خون کی کیچڑ ہو رہی تھی، گھوڑوں کی ٹاپیں اس خون آلود کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھیں۔

طلحند نے اپنے ہاتھی سے نظر دوڑائی تو سارا میدان جنگ خون سے سرخ ہو رہا تھا، اب اس کے پاس نہ کوئی راہ فرار تھی اور نہ دشمن کی تلوار سے بچنے کی سبیل۔ اس نے دیکھا اب میں واقعی پھنس گیا اور میرا وقت آن پہونچا۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب گیا اور اس عالم میں وہ اپنے تخت پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی طلحند کی روح پرواز کر گئی۔

گو نے دیکھا طلحند کا جھنڈا نظر نہیں آرہا ہے۔ اس نے ایک سوار کو بھیجا کہ آگے بڑھ کر پتہ لگائے کہ طلحند کہاں ہے۔ سوار نے واپس آکر بتایا کہ راجکمار کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ یہ سن کر گو گھوڑے سے اتر پڑا اور روتا ہوا دشمن کی فوج کی طرف پیدل چل دیا۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ طلحند مر چکا ہے اور اس کے سپاہی افسوس کر رہے ہیں، گو نے یہ سنا تو بے اختیار ایک چیخ ماری:

ہمی گفت زار ای نبرد ہ جوان   برفتی پر از درد و خستہ روان

اور کہنے لگا اے بہادر جوان، تو دنیا سے اس طرح گیا کہ تیرا دل زخموں سے چور اور تیری جان درد سے لبریز تھی۔

ترا گردش اختر بد بکشت   وگرنہ نزد بر تو بادی درشت

تیرے ستارے ہی برے تھے جو تجھے موت آگئی ورنہ جیتے جی تجھے ہوا کا تیز جھونکا بھی نہیں لگا۔

بپیچید از آموزگاران سرت   تو رفتی و مسکین دل مادرت

افسوس تو نے سمجھانے بجھانے والوں کی بات نہیں مانی، آج تیرے سوگ میں تیری ماں کا دل کتنا دکھی ہے۔

بجوبی بسی رانده ام با تو پند   نیامد ترا پند من سودمند

میں نے تجھے کتنی نصیحتیں کیں مگر افسوس تو نے میری کسی نصیحت پر کان نہیں دھرا۔

اتنے میں گو کا مشیر آگیا اور راجکمار کو تسلی دینے لگا۔ گو نے حکم دیا کہ طلحند کے لئے عاج اور زر و جواہر کا ایک تابوت تیار کیا جائے، اس پر چینی ریشم کی چادر ڈالی جائے

اور اس کا دروازہ مشک و کافور سے بند کیا جائے ۔ اس کے ساتھ ہی گو نے طلحند کے
تمام سپاہیوں کو معاف کر دیا۔

ادھر جب رانی نے سنا کہ دونوں راجکمار بھر جنگ کر رہے ہیں تو اس نے کھانا پینا
چھوڑ دیا اور رو رو کر دن کاٹنے لگی ۔ اس نے ایک مخبر کو مقرر کیا کہ برابر میدان جنگ کی
خبر لاتا رہے ۔ جب گرد چھٹی تو مخبر نے دیکھا کہ گو کا جھنڈا تو نظر آرہا ہے مگر طلحند کا اتا پتا نہیں
ہے ، اس نے رانی کی خدمت میں ایک سوار کو دوڑایا کہ ایسا لگتا ہے طلحند ختم ہو چکا ہے
رانی کو یہ افسوسناک خبر ملی تو اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ نکلے ، اس نے
اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بال نوچ لئے ۔ سارے محل میں کہرام مچ گیا ۔ رانی نے حکم دیا کہ
ایک چتا تیار کی جائے ۔ تاکہ وہ ہندو دھرم کے مطابق اپنے آپ کو ستی کر سکے ۔

گو کو جب یہ علم ہوا کہ ماں ستی ہونے والی ہے تو وہ بگ ٹٹ اس کی خدمت
میں پہونچا اور رو رو کر یہ کہا کہ ماں پہلے میری بات تو سن ، طلحند کو نہ میں نے مارا ہے اور
نہ میرے کسی سپاہی یا افسر نے ، اسے اس کی بدبختی مار گئی ۔

ماں کو گو کی باتوں پر یقین نہیں آیا ۔ اس نے کہا : تو بدمعاش اور اپنے بھائی کا قاتل ہے
گو نے صفائی دیتے ہوئے کہا : تو ذرا دھیرج کر ، پھر تجھے لے چل کر میدان جنگ دکھاؤں
گا اور یہ ثابت کروں گا کہ طلحند کی موت میں کوئی قصوروار نہیں ہے ۔ بس اس کے دن پورے
ہو گئے تھے ، لیکن اگر اب بھی تجھے یقین نہ ہو تو بھگوان کی قسم اسی آگ میں میں اپنے آپ
کو جلا کر بھسم کر لوں گا تاکہ میرے دشمنوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو ۔

رانی بیٹے کی بات سن کر سوچنے لگی ایک بیٹا تو گیا ہی دوسرا بھی جاتا رہا تو کتنا
افسوس ہوگا ، اور وہ بھی ایسا جیالا جوان ، چنانچہ وہ گو سے بولی : چل مجھے چل کر بتا طلحند

ہاتھی پر کیسے مرا تاکہ مجھے یقین اور میرے دل کو سکون ہو۔

گو اپنے محل میں گیا۔ اس نے اپنے جہاں دیدہ مشیر کو بلایا اور اسے اپنی اور ماں کی گفتگو بتائی۔ آخر سارے ملک سے عقل مند اور ہوشیار لوگ کیا جوان اور کیا بوڑھے جمع ہوئے تاکہ میدان جنگ کا نقشہ تیار کریں۔ گو نے جنگ کی ساری تفصیل بتائی، ان لوگوں نے ساری رات غور کیا اور اس کے بعد آبنوس کی لکڑی کا ایک تختہ بنایا جس میں سو خانے تھے اور ان خانوں میں آمنے سامنے دو شاہ اور ان کی فوج نقل و حرکت کرتی ہوئی دکھائی گئی تھی، دونوں فوجوں میں سے ایک لشکر ساگوان کا بنایا گیا اور دوسرا ہاتھی دانت کا۔ بادشاہ، وزیر، گھوڑا، پیل اور پیادہ آمنے سامنے قرار پائے۔ ہر بادشاہ اپنے لشکر کے قلب میں تھا، اس کے پہلو میں اس کا وزیر تھا، اور ان کے دائیں بائیں ایک ایک پیل، ایک ایک اونٹ، ایک ایک گھوڑا، اور ایک ایک رخ تھے (۱)

پیادہ برفتی ز پیش و ز پس   کہ او بود در جنگ فریادرس

پیادہ آگے بھی چلتا اور پیچھے بھی کیونکہ جنگ میں اس کی حیثیت فریادرس کی سی تھی۔

چو بگذاشتی تا سر آوردگاہ   نشستی چو فرزانہ بر دست شاہ

لیکن جب وہ بساط کے دوسرے سرے پر پہونچ جاتا تو فرزین کی طرح بادشاہ کے پہلو میں جگہ پاتا۔

ھمان مرد فرزانہ یک خانہ بیش   نرفتی بہ جنگ از بر شاہ خویش

---

(۱) متن میں ان دس مہروں کے علاوہ "دو مرد" بھی ہے،

فرزین بادشاہ کے پاس سے جنگ کی خاطر ایک خانہ سے زیادہ نہیں جاتا۔

سہ خانہ برفتی سرافراز پیل بدیدی ہمہ رزمگاہ از دو میل

سربلند ہاتھی تین خانے چلتا تھا اور گویا دو میل کی دوری سے سارے میدان جنگ پر نظر دوڑاتا تھا،

خانہ برفتی شتر ہمچنان برآورد گہ بردمان و دنان

اسی طرح اونٹ بھی تین خانے چلتا تھا۔

ہمان رفتن اسب خانہ بود بہ رفتن یکی خانہ بیگانہ بود

اسی طرح گھوڑے کی چال بھی تین خانے تک تھی، مگر ایک خانہ میں وہ بیگانہ سا رہتا۔

برفتی زہر سو رخ کینہ خواہ ہمی تاختی او ہمہ رزمگاہ

رخ دشمنی میں سارے میدان جنگ میں دھاوا بولتا ہوا چاروں طرف چلتا تھا۔

ہمی راند ہر کس بہ میدان خویش بہ رفتن نکردی کسی کم و بیش

ہر مہرہ اپنے میدان میں چلتا تھا اور اس میں کوئی کم و بیشی نہیں کرتا تھا۔

چو دیدی کسی شاہ را در نبرد بہ آواز گفتی کہ ای شاہ برد

جب کوئی بادشاہ کے مقابلہ میں آتا تو چلا کر کہتا کہ اے بادشاہ میں نے بازی جیت لی۔

شہ از خانۂ خویش برتر شدی ہمی تا بر و جای تنگ آمدی

تب بادشاہ اپنے خانہ سے آگے بڑھ جاتا اور اس طرح ایسی جگہ پہونچ
جاتا جہاں سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

از آن پس ببستند بر شاہ راہ   رخ و اسپ و فرزین و پیل و سپاہ

اس کے بعد رخ، اسپ، فرزین، پیل اور پیادے مل کر بادشاہ کی
راہ روک لیتے،

شد از رنج و زبستگی شاہ مات   چنین یافت از چرخ گردان برات

آخر کار تھک ہار کر بادشاہ کی مات ہو جاتی اور وہ زمانے کے
چکر سے چھوٹ جاتا۔

شطرنج کے اس کھیل کا مقصد یہ تھا کہ میدان جنگ میں طلحند کی پوزیشن اور اس کی موت کی حالت کو واضح کیا جائے۔ رانی نے غور سے یہ کھیل دیکھا اور گویا اپنی آنکھوں سے طلحند کی موت کا نقشہ دیکھ لیا۔ اس کے بعد وہ دن رات اداس بیٹھی رہتی اور شطرنج کی بساط پر مہروں کو دیکھتی رہتی۔ اس کی آنکھیں اشکبار رہتیں لیکن طلحند کی بے وقت موت سے اس کو جو صدمہ پہونچا تھا، شطرنج کا یہ کھیل کسی حد تک اس کا مداوا کرتا۔

داستان بختیار

ایران کی قدیم داستانوں میں سے ایک بختیار کی داستان ہے۔ اس داستان کی اصل کیا ہے، معلوم نہیں۔ یہ داستان سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں مدون ہوئی اور پھر چھٹی صدی ہجری میں دقایقی مروزی نے اسے مرصع نثر میں پیش کیا۔ اس کے بعد اس داستان کی کئی اور روایتیں ترتیب دی گئیں جن میں سے ایک روایت متعدد بار یورپ میں چھپ چکی ہے۔ ایک دوسری روایت مجلۂ ارمغان (تہران) میں چھپی تھی۔ ذیل کی داستان مؤخر الذکر روایت کا خلاصہ ہے۔

یہ داستان الف لیلہ، طوطی نامہ اور سندباد نامہ جیسی داستانوں سے ملتی جلتی ہے اور غالباً ان سب داستانوں کا ماخذ ہندوستانی روایات ہیں۔

قصه بختیار



ایران میں آزاد بخت نام کا ایک بادشاہ تھا جس کے دس وزیر تھے اور ایک سپہ سالار۔ سپہ سالار کی ایک لڑکی تھی بہت خوبصورت اور باپ کی بیحد لاڈلی۔ سپہ سالار جب تک صبح کو اسے دیکھ نہیں لیتا تھا کوئی کام شروع نہیں کرتا تھا۔

اتفاق سے سپہ سالار کو سفر پر جانا پڑا مگر پردیس میں اس کا جی نہیں لگا، بیٹی جو پاس نہیں تھی، آخر اس نے ایک قاصد بھیج کر بیٹی کو اپنے پاس بلوایا۔ لڑکی نے سفر کی تیاری کی اور باپ کے پاس جانے کے لئے عماری میں بیٹھی، اتفاق سے اسی وقت آزاد بخت اپنے خدم وحشم کے ساتھ شکار کے لئے نکلا تھا، اس کی نظر آراستہ عماری پر پڑی تو غلام کو بھیج کر معلوم کیا کہ صاحب محمل کون ہے؟

غلام نے آکر بتایا کہ محمل میں سپہ سالار کی بیٹی ہے۔ آزاد بخت محمل کے قریب گیا تاکہ لڑکی کے ذریعہ سپہ سالار کو پیغام دے سکے۔ اتفاقاً اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا اور عماری کا پردہ ہٹ گیا۔ بادشاہ کی نظر لڑکی پر پڑی تو وہ دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔

آزاد بخت نے نوکر کو بلا کر کہا: اب میں کیا کروں؟ اس حسینہ کو دیکھ کر میں دل دے بیٹھا ہوں، میرا سر چکرا رہا ہے۔ کسی کو سپہ سالار کے پاس بھیج کر اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لوں۔

خادم نے عرض کیا اگر جہاں پناہ یہیں سے سپہ سالار زادی کو لے کر شاہی محل لوٹ

جائیں تو لوگ خیال کریں گے لڑکی پر بادشاہ کا غضب نازل ہوا ہے۔ لیکن اگر حضور اجازت دیں تو لڑکی کو اس کے باپ کے پاس لے جائیں اور وہاں آپ کی خواہش کا اظہار کریں۔ مجھے یقین ہے کہ سپہ سالار اس بات سے ممنون ہوگا اور لڑکی تمام ساز و سامان کے ساتھ آپ کی خدمت میں روانہ کرے گا۔

بادشاہ خادم کی بات سن کر بھڑک اٹھا اور بولا: تیری یہ مجال کہ مجھے نصیحت کر رہا ہے اور میرے سامنے زبان چلا رہا ہے۔ یہ کہہ کر آزادبخت نے خادم کو دھتکار دیا اور لڑکی کے ساتھ شہر کی راہ لی۔ اگلے روز بادشاہ نے اس سے عقد کیا اور سپہ سالار کو مبارکباد کے خطوط روانہ کئے۔

ادھر خادم بادشاہ سے ناراض ہو کر سیدھا سپہ سالار کے پاس پہونچا اور اسے اپنی اور بادشاہ کی گفتگو بتائی اور اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح فتنہ کی آگ بھڑک اٹھے۔ سپہ سالار اس خبر سے بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے بادشاہ کو ایک خط لکھا کہ آپ کے اقدام سے میرا نصیب جاگ اٹھا مگر اس ظاہری شکریہ کی تہہ میں کینہ ہی کینہ بھرا تھا۔

کچھ عرصہ گذر گیا۔ سپہ سالار نے ایک دن سلطنت کے امرا اور بزرگوں کو جمع کیا اور کہا: میں آپ لوگوں سے راز کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر قسم کھائیے کہ اسے راز رکھیں گے۔

سب نے قسم کھائی۔ سپہ سالار کہنے لگا: آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں نے ملک میں فتنہ و فساد کی بیخ کنی کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ مگر بجائے اس کے کہ بادشاہ میری خدمات کی قدر کرتے، میری ہی بیٹی کو اڑا لے گئے اور اپنے دامن میں بزدلی کا داغ لگا لیا۔

یہ کہہ کر سپہ سالار رو پڑا۔ امرائے سلطنت نے قسم کھائی کہ ہم سب تیرے ساتھ

ہیں۔ چنانچہ سپہ سالار نے سب کو بہت سارا انعام دیا اور اپنی حمایت میں ایک بھاری فوج جمع کی۔ ادھر آزاد بخت اپنی نئی دلھن کے ساتھ وصال کے مزے اڑا رہا تھا کہ اسے سپہ سالار کی تیاریوں کا پتہ چلا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا: تیرے عشق نے یہ دن دکھائے آیہاں سے بھاگ چلیں اور شاہ کرمان کے یہاں چل کر پناہ لیں، وہ شریف آدمی ہے۔

چنانچہ آزاد بخت اور اس کی نئی بیوی نے ہتھیار باندھے، بہت سامال و زر ساتھ لیا اور محل کے خفیہ دروازہ سے نکل کر جنگل بیابان میں پہونچ گئے۔ اتفاق سے ملکہ حاملہ تھی اور اسے نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ چلتے چلتے آزاد بخت اور ملکہ ایک کنویں پر پہونچے جس کا پانی زہر کی طرح کڑوا تھا۔ وہاں ملکہ کے لڑکا پیدا ہوا، ماں نے بیٹے کو چھاتی سے لگایا اور دودھ پلانے لگی مگر بادشاہ بولا: یہ ممتا دکھانے کا وقت نہیں ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ بچے کو کنویں کی منڈیر پر خدا کے حوالے کر کے چلتے بنیں۔ چنانچہ آزاد بخت نے اس ننھے کو زربفت کی قبا میں لپیٹا اور اپنے بازو سے موتی کے دس دانے کھول کر بچے کے ہاتھ پر باندھے اور ماں باپ اسے وہیں چھوڑ کر آگے چل دیئے

شاہ کرمان کو خبر ملی کہ آزاد بخت اپنی ملکہ کے ساتھ اس کے پاس آرہا ہے تو اس نے اپنے امرا کو استقبال کے لئے بھیجا اور حکم دیا کہ مہمانوں کو پورے اعزاز کے ساتھ شہر میں لائیں۔ شاہ کرمان نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک شاہانہ ضیافت کا اہتمام کیا۔ شراب کا دور چلا، لیکن جب آزاد بخت کے سامنے پیمانہ آیا تو وہ رو پڑا۔ اس نے بادشاہ کو اپنے فرار کی داستان سنائی۔ شاہ کرمان نے کہا آپ یہاں سے ایک مسلح فوج لے کر اپنے شہر جائیے اور اس پر قبضہ کیجیئے۔

آزاد بخت کرمانی فوج کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب وہ اپنے شہر پہونچا تو سپہ سالار بھاگ کھڑا ہوا۔ رعایا نے بڑھ کر اپنے بادشاہ کا استقبال کیا اور جان کی امان چاہی۔

آزاد بخت نے دوبارہ تخت پر جلوس کیا اور کرمان کی فوج کو بہت سارا انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ اب بادشاہ اور ملکہ کو اپنے کھوئے ہوئے بچے کی فکر ہوئی۔ وہ سوچنے لگے کہ بچے کو یقیناً جنگلی جانور کھا گئے ہوں گے۔

ادھر یہ ہوا کہ اس کنویں پر ڈاکوؤں کا گذر ہوا۔ انھوں نے بچے کو اٹھالیا۔ ڈاکوؤں کے سردار فرخ سوار نے دیکھا کہ بچہ زربفت کی قبا میں لپٹا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ پر موتی کے دس دانے بندھے ہیں تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی شہزادہ ہے۔ چنانچہ فرخ سوار بچے کو گھر لے گیا۔ اور اس کا نام خداداد رکھا اور اس کی تربیت کے لئے ایک دایہ کو مقرر کیا۔

خداداد ذرا بڑا ہوا تو فرخ سوار نے اس کی تعلیم کا انتظام کیا۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کی شجاعت کا یہ عالم تھا کہ اکیلا پانسو آدمیوں کو ڈھیر کر دیتا تھا۔ فرخ سوار اسے اتنا چاہتا تھا کہ ایک لمحہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن خداداد کو ڈکیتی نہیں پسند تھی۔ وہ باپ کو بھی اس کام سے منع کرتا تھا۔ جب اس کے باپ کے آدمی کسی قافلہ کو لوٹتے تو خداداد کو رنج ہوتا اور موقع پاکر وہ اسیروں کو آزاد کر دیتا تھا۔

ایک دن فرخ سوار کے آدمیوں نے ایک قافلہ پر دھاوا بولا۔ قافلہ میں چند بہادر شخص تھے انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ فرخ سوار زخمی ہو گیا اور قافلہ والے اسے گرفتار کرنا ہی چاہتے تھے کہ خداداد ان پر جھپٹا اور ان میں سے کئی ایک کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا لیکن بدقسمتی سے اس کے گھوڑے کا پاؤں کسی سوراخ میں پھنس گیا اور وہ باپ سمیت

گرفتار ہوگیا۔

قافلہ والے ڈاکوؤں کو آزاد بخت کے پاس لے گئے۔ آزاد بخت کی نظر خداداد پر پڑی تو اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے پوچھا: تو اتنا خوبصورت اور سجیلا جوان ہے، پھر بھی ڈاکے ڈالتا ہے؟

خداداد رو پڑا اور بولا: خدا جانتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کرتا۔ آخر بادشاہ نے اسے معاف کر دیا اور اس کا نام بختیار رکھا اور اسے اپنا داروغۂ اصطبل بنالیا۔

بختیار نے بادشاہ کا بیحد شکریہ ادا کیا۔ اس نے شاہی گھوڑوں کی دیکھ ریکھ شروع کی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی توجہ سے گھوڑے چاق چوبند ہو گئے۔ آزاد بخت خوش ہوا اور ایک دن دربار میں بلاکر خزانے کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں۔ بختیار نے اس عہدہ پر بھی انتہائی امانت اور دیانت سے کام کیا۔ اور رفتہ رفتہ بادشاہ سے اتنا قریب ہو گیا کہ شاہ تمام معاملات میں اس سے صلاح مشورہ کرنے لگا۔

دوسرے وزیروں کو بختیار اور آزاد بخت کی اس قربت پر حسد ہونے لگا۔ انھوں نے سوچا کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ بختیار، بادشاہ کی نظروں سے گر جائے۔ اتفاق سے ایک روز بختیار خزانے میں بیٹھا تھا اور شراب کی چسکی لے رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ لگ گئی۔ دربان نے یہ سمجھ کر کہ بختیار چلا گیا ہے، خزانے کا دروازہ قفل کیا اور چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کے بعد بختیار کی آنکھ کھلی تو وہ گھر جانے کے لئے اٹھا۔ خزانہ میں کئی دروازے تھے۔ بختیار ایک دروازہ سے باہر نکلا مگر اس نے دیکھا وہ باہر نکلنے کے بجائے ایک کمرہ میں پہونچ گیا ہے، جہاں زنگار رنگ کے فرش بچھے ہیں اور بیچ میں ہاتھی دانت کا

ایک تخت رکھا ہے۔ تخت پر دیبا و حریر کی چادریں بچھی تھیں۔ کمرہ میں ہر طرف شمعیں جل رہی تھیں۔ بختیار مست تو تھا ہی، تخت پر پڑ کر سو رہا۔

آزاد بخت اپنے کمرہ میں آیا تو دیکھا بختیار اس کے تخت پر سو رہا ہے۔ وہ زور سے اس پر چیخا کم بخت، تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ بختیار نے نیند ہی میں بادشاہ کے سینہ پر ایک ہاتھ مارا اور تخت سے زمین پر لڑھک کر پھر سو رہا، بادشاہ نے غلاموں کو آواز دی انھوں نے آکر بختیار کو رسی میں جکڑ لیا۔ آزاد بخت اب غصہ میں ملکہ کے پاس گیا اور بولا: بغیر کسی کی رہنمائی کے بختیار یہاں تک نہیں آسکتا۔ سچ سچ بتا یہ کس کا کام ہے؟

ملکہ نے کہا: میں بے قصور ہوں۔ لیکن اگر غصہ میں تم نے مجھے جان سے مار دیا تو بعد میں پچھتاؤ گے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ملکہ کو بھی گرفتار کر لیا جائے۔ اس نے ساری رات بے چینی میں گذاری۔ صبح کو امرا نے دیکھا کہ بادشاہ چپ چپ اور فکر مند ہے۔ وزیر اعظم بادشاہ کے حضور میں ذرا گستاخ تھا۔ اس نے بڑھ کر پوچھا: جہاں پناہ کی کسالت کا کیا سبب ہے؟

بادشاہ نے رات کا واقعہ بتایا۔ وزیر نے کہا جس شخص نے چوری ڈکیتی میں زندگی گذاری اور جنگل بیابانوں میں لوگوں کا ناحق خون بہاتا رہا وہ بادشاہ کی ملازمت کے لائق نہیں ہے۔ اسے پھانسی دیدینی چاہیئے تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ بختیار کو اس کے حضور میں لایا جائے۔ جب وہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو آزاد بخت نے کہا: حرامزادے، میں نے تیری جان بخشی، تجھے دربار میں عہدہ مرتبہ دیا، کیا یہ سب میں نے اس لئے کیا کہ تو میرے ہی حرم میں گھس جائے؟

بختیار کی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ بولا: مجھے کچھ نہیں پتہ یہ سب کیسے ہوا۔

شاید شراب کی مستی اور میری بدبختی نے مجھے یہاں تک پہونچایا۔

ادھر بادشاہ نے ملکہ سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے وزیر کو حرم میں بھیجا۔ ملکہ بولی: میں بے گناہ ہوں لیکن یہ بتاؤ میں اس الزام سے کیسے بری ہو سکتی ہوں۔

وزیر نے کہا: آپ بادشاہ سے کہئے کہ بختیار نے حرم میں گھس کر مجھے ڈرایا دھمکایا اور انتہائی گستاخی کے ساتھ مجھے مجبور کیا کہ میں اس کی بات مان لوں۔ آپ کے ایسا کہنے سے بادشاہ بختیار کو سزا دے گا اور آپ تہمت سے بری ہو جائیں گی۔

ملکہ پہلے تو راضی نہیں ہوئی مگر مجبوراً اس نے وزیر کی بات مان لی۔ ملکہ وزیر کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس کے سامنے وزیر کی پڑھائی ہوئی بات دہرادی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بختیار کو ابھی لے جاؤ بعد میں اسے مناسب سزا دی جائے گی۔

اگلے روز دوسرا وزیر بادشاہ کے پاس آیا اور بڑے اصرار کے ساتھ یہ درخواست کی کہ بختیار کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بختیار کو یہاں لاؤ اور جلاد کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دو۔

بختیار مجبور تھا، کیا کرتا، بولا: میں اس تہمت سے بری ہوں لیکن میرا حال اس بدبخت سوداگر کا سا ہے جو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا، ناکامی کا منہ دیکھتا تھا۔ اس سوداگر کے پاس بہت دولت تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ میں اس کا سارا مال جاتا رہا۔ غلہ گراں تھا تو اس نے بہت سارا غلہ خرید لیا کہ اگلے سال مہنگے دام بیچوں گا مگر اگلے سال بہت غلہ ہوا۔ ادھر بارش کا پانی سوداگر کے گودام میں پہونچ گیا اور اس کا سارا غلہ سڑ گیا۔ آخر اس نے اپنا گھر بیچ کر تھوڑی پونجی اکٹھا کی اور کشتی میں بیٹھ کر پردیس چلا۔ بدقسمتی سے

کشتی ڈوب گئی۔ بے چارہ سوداگر ایک تختہ پر تیرتا تیرتا بھوکا ننگا ساحل پر پہونچا وہ
کچھ دن ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ آخر ایک آبادی میں پہونچا جہاں میوے کے باغ تھے۔
وہاں ایک شریف دہقان تھا۔ وہ سوداگر کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا اور جب اسے
سوداگر کی بپتا معلوم ہوئی تو اپنی زمین اس کے سپرد کر دی۔ سوداگر نے محنت سے کھیتی باڑی کی۔
کھلیان اکٹھا ہوا تو اس نے دہقان کو بتائے بغیر اپنا حصہ الگ کر لیا اور ایک غار میں
لے جا کر چھپا دیا۔

کچھ دن کے بعد دہقان نے سوداگر کو اس کا حصہ دینا چاہا۔ سوداگر نے کہا میں پہلے
ہی اپنا حصہ لے چکا ہوں۔ دہقان کو یہ بات بری لگی، اس نے سوداگر کو اپنے یہاں سے
نکال دیا، ستم بالائے ستم یہ کہ جب وہ غار میں پہونچا تو وہاں ایک دانہ بھی نہیں تھا۔

آخر سوداگر وہاں سے چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ سمندر کے کنارے پہونچا۔ وہاں کچھ
غوطہ خور موتی نکال رہے تھے، ایک غوطہ خور نے سوداگر کو پہچان لیا اور اس سے کہا میرے
پاس چند دانے موتی ہیں، اسے شہر میں لے جا کر بیچ آؤ۔

سوداگر موتی لے کر شہر پہونچا۔ بازار میں ایک جوہری نے سوداگر کے پاس قیمتی موتی
دیکھے تو اس کا گریبان پکڑ لیا کہ یہ موتی میرے ہیں، تو نے کہاں سے اڑائے ؟

جھگڑا بڑھا، دونوں بادشاہ کے دربار میں پہونچے۔ بادشاہ نے حکم دیا سوداگر
کو جیل میں ڈال دیں۔ اتفاق سے وہی غوطہ خور شہر میں گھوم رہا تھا۔ اس نے سوداگر کو
دیکھا اور اس کی کہانی سنی تو بادشاہ کو جا کر بتایا۔ بادشاہ نے جوہری کو سزا دی اور سوداگر کو
قید سے نکال کر اپنا خزانچی بنا دیا۔ لیکن وزیر لوگ سوداگر سے جلنے لگے اور انھوں نے یہ
الزام لگایا کہ سوداگر کے ملکہ سے تعلقات ہیں۔ بادشاہ نے ان کی باتوں میں آکر سوداگر کی

آنکھیں نکلوادیں لیکن بعد میں سوداگر کی بے گناہی ثابت ہوگئی، بادشاہ نے وزیر کو سزا دی اور سوداگر پر مہربانی شروع کی لیکن اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بختیار نے سوداگر کا قصہ سنا کر کہا: بادشاہ ابھی میرے قتل کا حکم نہ دے تو بہتر ہے، ممکن ہے بعد میں میری بیگناہی ثابت ہو جائے۔ ادھر شام ہو چلی تھی اس لئے بادشاہ نے حکم دیا بختیار کو پھر قید خانہ میں ڈال دیں۔

اگلے روز تیسرا وزیر آیا۔ اس نے بھی بادشاہ سے درخواست کی کہ بختیار کو جلد از جلد قتل کر دیا جائے تاکہ بادشاہ کی مزید بدنامی نہ ہو۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ بختیار کو حاضر کیا جائے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے مگر بختیار نے پھر امان چاہی اور کہا: جلد بازی سے افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جیسے حلب کا بادشاہ جلد بازی کر کے اپنا ہاتھ کٹا بیٹھا اور اس کے دشمنوں کی بن آئی۔

آزاد بخت نے پوچھا وہ کیسے ہوا؟

بختیار نے کہا: شاہ حلب کے ایک بیٹا تھا، اس کا نام بہزاد تھا۔ بہزاد دیا ادب لڑکا تھا لیکن بہت بے صبرا تھا۔ ایک بار اس نے وزیر سے سنا کہ قیصر روم کے ایک بیٹی ہے ایسی خوبصورت کہ اس کے رخساروں کی دمک شمع کو ماند کرتی ہے۔ بہزاد یہ سن کر بے چین ہو گیا۔ اس نے فوراً باپ سے درخواست کی کہ قیصر روم کے نگارین نام کی ایک لڑکی ہے، آپ قاصد بھیج کر میرے لئے رشتہ کی بات کیجئے۔

شاہ حلب نے بیٹے کی بات نہیں مانی۔ اس نے کہا: قیصر روم کا مذہب اور ہے اور میرا مذہب اور، یہ رشتہ نہیں ہو سکے گا۔ لیکن بادشاہ بہزاد سے بے پناہ محبت کرتا تھا اس لئے بیٹے کی محبت میں اس نے قیصر روم کے دربار میں ایلچی بھیجا اور بہزاد کے لئے

اس کی بیٹی کا ہاتھ مانگا۔ قیصر روم نے ایلچی سے کہا: میری بیٹی کا مہر ڈیڑھ لاکھ دینار ہے جو یہ رقم دے میری بیٹی کو بیاہ لے جائے۔

شاہ حلب کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے کہا میں اتنی رقم کہاں سے لاؤں؟ مگر شہزادے نے بیحد اصرار کیا۔ مجبوراً بادشاہ نے سارا خزانہ اکٹھا کیا، غلام اور کنیز فروخت کئے اور لوگوں سے زبردستی مال جمع کیا۔ پھر بھی رقم پوری نہیں ہوئی۔

بادشاہ نے شہزادے کو تسلی دی کہ صبر کر، کوئی سبیل نکلے گی مگر وہ کب ماننے والا تھا وہ دو غلام ساتھ لے کر محل سے چل پڑا۔ راستے میں اسے ایک قافلہ ملا۔ شہزادے نے اس پر چھاپہ مارا۔ اتفاق سے قافلہ میں مسلح اور بہادر لوگ تھے۔ انھوں نے بہزاد اور غلاموں کو گرفتار کر لیا اور ساتھ لے گئے۔ میر کارواں نے دیکھا کہ بہزاد شکل وصورت سے شاہی خاندان کا فرد معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا سچ بتا تو تجھے جان کی امان ملے گی۔ بہزاد نے سچ سچ بتا دیا۔ سوداگر کو اس کے حال پر رحم آیا۔ اس نے کہا بقیہ رقم میں دیتا ہوں، تو جا کر قیصر روم کی بیٹی کو بیاہ لے۔

خلاصہ یہ کہ بہزاد یہ رقم لے کر قیصر کے دربار میں پہونچا اور اس کی خدمت میں رقم پیش کی۔ قیصر نے حکم دیا کہ نگارین کو آراستہ پیراستہ کر کے بہزاد کے حوالے کر دیا جائے بہزاد کو چین کب تھا، اس نے ایک سوراخ سے نگارین کے کمرے میں تاک جھانک شروع کی۔ نگارین سمجھی کوئی غیر مرد ہے۔ اس نے کنیز کو حکم دیا لوہے کے دو شاخہ سے تاکنے والے کی آنکھ پھوڑ دی جائے۔ جیسے ہی بہزاد کی آنکھوں میں سلاخ لگی وہ چیخ مار کر بیہوش ہو گیا اور زمین پر آرہا۔ اس کی دونوں آنکھیں باہر نکل آئیں اور شادی کا یہ جشن ماتم میں بدل گیا۔

قیصر کو خبر ہوئی تو اس نے کہا : بہزاد نے بے صبری میں اپنی عاقبت خراب کی۔ اب وہ اندھا ہے اور میں اپنی بیٹی اندھے کو نہیں بیاہوں گا۔ اندھا بہزاد حلب واپس ہوا۔ اس کے شہر والوں کو شہزادہ کی نابینائی کا افسوس تو ہوا مگر انھوں نے حلب کا بادشاہ کسی اور کو بنایا۔

بختیار نے کہا اگر بہزاد ایک دن صبر کر لیتا تو اسے دلھن اور بادشاہت دونوں مل جاتی۔

اگلے روز چوتھا وزیر بادشاہ کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا! جہاں پناہ اگر ضرورت سے زیادہ تحمل کریں تو ملک و قوم کی بدنامی کا ڈر ہے۔ پانی لاکھ مفید سہی لیکن زیادہ پینے سے نقصان کرتا ہے۔

بادشاہ نے پھر بختیار کو طلب کیا اور اس کے قتل کا حکم صادر کیا لیکن بختیار نے عرض کیا اس کے قتل میں جلد بازی مناسب نہیں۔ جلد بازی سے پشیمانی ہوتی ہے اور صبر و تحمل سے دولت ملتی ہے۔ اس کے بعد بختیار نے ابو صابر کی داستان سنائی اور کہا ابو صابر کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا تھا، وہ اپنے بال بچوں سے بچھڑ گیا تھا۔ مگر قسمت نے یاوری کی اور ابو صابر قید سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا اور اسے بیوی بچے بھی مل گئے۔

آزاد بخت کو یہ داستان پسند آئی اس نے حکم دیا بختیار کو پھر قید خانہ واپس لے جائیں۔

پانچویں دن پانچواں وزیر آیا اور بادشاہ سے بولا : مجھے خدشہ ہے کہ اس طرح دیر کرنے سے فسادی چین کی بنسی بجائیں گے اور رفتہ رفتہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بادشاہ نے حکم دیا بختیار کو لا کر پھانسی پر چڑھا دیا جائے۔

لیکن بختیار نے اس دن ایک اور داستان سنائی اور کہا: شاہ یمن کے پاس ابرہہ نامی ایک غلام تھا۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ ابرہہ دراصل حبشیوں کے بادشاہ کا بیٹا ہے مگر اِسے غلام بنالیا گیا تھا۔ شاہ یمن ابرہہ کو بہت چاہتا تھا۔

ایک دن یمن کا بادشاہ ابرہہ کے ساتھ شکار کو چلا۔ ابرہہ بادشاہ کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے ایک ہرن دیکھا اور اس پر تیر چلایا۔ اتفاق سے تیر خطا ہو گیا اور بجائے ہرن کے بادشاہ کے کان میں لگا۔ کان سے خون بہنے لگا لیکن چونکہ ابرہہ بادشاہ کو بہت عزیز تھا، اس نے غلام کا قصور معاف کر دیا۔

ادھر شاہ حبش نے ابرہہ کی تلاش میں آدمی بھیجے۔ یہ لوگ تلاش کرتے کرتے یمن پہونچے اور ابرہہ کو لے کر چپکے سے چل دئے اور صحیح سلامت دربار حبش پہونچ گئے۔

شاہ یمن نے ابرہہ کو طلب کیا تو کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ بادشاہ خود اس کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں ایک کشتی پر سوار ہوا۔ بدقسمتی سے کشتی بھنور میں پڑ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ شاہ یمن ایک تختہ پر بہتا ہوا ساحل سے آن لگا۔ وہ بے ہوش تھا چند آدمیوں نے اسے دیکھا تو اس کے منہ میں لاکر گرم تیل ٹپکایا۔ بادشاہ کو ہوش آیا، اس نے پوچھا یہ کونسی جگہ ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حبشیوں کا ملک ہے۔

بادشاہ وہاں سے اٹھا، آہستہ آہستہ بازار پہونچا اور ایک سرائے میں مقیم ہوا۔ سرائے کے بالاخانہ میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اسی رات سوداگر کے یہاں چور آئے اور انھوں نے سوداگر اور اس کے غلام و کنیز کو جان سے مار ڈالا اور اس کا سارا مال لے کر چلتے بنے۔ صبح کو لوگوں نے دیکھا شاہ یمن کے لباس پر خون کے دھبے ہیں۔ وہ اسے پکڑ کر حبش کے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا قاتل کو ابھی قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔

اتفاقاً ایک دن ابرہہ اپنے باپ کے ساتھ قید خانہ کے پاس والے جنگل میں گھوم رہا تھا، قیدی پانی کے کنارے بیٹھے تھے۔ انھیں میں شاہ یمن بھی تھا، اتنے میں شاہ یمن کی نظر ایک کوے پر پڑی۔ شاہ نے فال لی اور بولا: اگر یہ ہڈی کوے کو جالگی تو میں قید سے رہا ہو جاؤں گا۔ اس نے ہڈی چلا کر کوے کو ماری مگر وہ کوے کے بجائے حبش کے بادشاہ کو جالگی۔ شاہ حبش چیخا اور بولا مجرم کو فوراً پیش کیا جائے۔ مجرم سامنے لایا گیا تو شاہ حبش کا غصہ اور زیادہ ہو گیا، اس نے حکم دیا فوراً اس کی گردن اڑادی جائے۔

شاہ یمن نے کہا: کان کے بدلے کان کاٹیے، گردن نہیں۔

شاہ حبش نے اس کی درخواست منظور کرلی مگر جب حبشی جلاد کان کاٹنے آگے بڑھے تو دیکھا کہ شاہ یمن کا ایک کان غائب ہے۔ شاہ حبش نے کہا اگر تو سچ سچ بتادے کہ تیرا ایک کان کیا ہوا تو تیری جان بخش دوں گا۔

شاہ یمن نے کہا میرے ایک غلام ابرہہ کے تیر سے یہ کان جاتا رہا اتفاقاً وہ غلام لاپتہ ہو گیا، چونکہ وہ مجھے بہت عزیز تھا، میں اس کی تلاش میں نکل پڑا اور یہاں آ کر قتل کے الزام میں پھنس گیا۔

یہ سن کر شاہ حبش کے آنسو نکل آئے۔ اس نے ابرہہ سے کہا: غور سے دیکھ، کیا تو اس شخص کو پہچانتا ہے، ابرہہ نے اپنے مالک کو فوراً پہچان لیا، دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور شاہ یمن ایک ماہ تک حبش کے دربار میں مہمان رہا۔

آزاد بخت نے یہ قصہ سن کر حکم دیا کہ بختیار کو واپس قید خانہ لے جاؤ۔

اگلے دن چھٹا وزیر بادشاہ کی خدمت میں آیا اور اس نے درخواست کی کہ بختیار کا قصہ جلد سے جلد پاک کیا جائے۔ بادشاہ نے پھر اس کے قتل کا حکم دیا۔ بختیار نے اب

کی بار بادشاہ کی تعریف و توصیف شروع کی اور پھر اسے ایک بادشاہ کا قصہ سنایا جس نے اپنے وزیر کو بے گناہ قتل کر دیا تھا مگر جب اسے اصل حقیقت کا علم ہوا تو وہ بیحد پشیمان ہوا۔

آزاد بخت نے بختیار کو پھر قید خانہ بھیج دیا۔

ساتویں دن ساتواں وزیر آیا اور اس نے بادشاہ سے کہا: ہم دشمنوں کے طعنوں سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہر محفل میں بختیار کا چرچا ہے۔

آزاد بخت نے اس دن ملکہ کو بلا کر پوچھا کہ اس سلسلہ میں تیری کیا رائے ہے؟ ملکہ نے کہا بختیار کا قتل واجب ہے۔ چنانچہ بختیار کو حاضر کیا گیا۔ آزاد بخت نے کہا: اب تو اپنی بے گناہی کیسے ثابت کرے گا؟ اب تو ملکہ بھی تیرے قتل کے حق میں ہے۔

بختیار نے کہا: عورتیں غرض کی بات کرتی ہیں۔ ان کے مکر و فریب کی داستانیں بہت ہیں، اجازت ہو تو ایک داستان عرض کروں۔ اس کے بعد بختیار نے یہ قصہ سنایا۔

ملک حبش میں ایک بادشاہ تھا، بڑی شان و شوکت والا، اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اور نہ اس کی کسی سے جنگ تھی، اس لئے اس کے ملک میں سپاہیوں کی کوئی پوچھ نہیں تھی، حبش کے وزیر نے سوچا کسی تدبیر سے جنگ ہونی چاہئے تاکہ سپاہیوں کی اہمیت معلوم ہو۔ چنانچہ وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے بولا: عراق کے بادشاہ کے ایک خوبصورت بیٹی ہے۔ وزیر نے عراقی شہزادی کی اس قدر تعریف کی کہ شاہ حبش نے شاہ عراق کے پاس اپنے رشتہ کی بات بھیجی۔ عراق کے بادشاہ کو اس تجویز پر بہت غصہ آیا، اس نے کہا میں اپنی بیٹی کا بیاہ اس کالے کلوٹے سے کروں گا؟ ایلچی نے واپس آکر عراقی بادشاہ کا جواب بتایا، شاہ حبش کو بہت غصہ آیا۔ اس نے

قسم کھائی کہ جب تک عراق کو تباہ و برباد نہ کروں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے لوگوں کو خوب انعام واکرام سے نوازا تاکہ جنگ کا سامان کریں۔ آخر کار عراق اور حبش میں لڑائی ہوئی، عراقی بادشاہ کو شکست کا منہہ دیکھنا پڑا۔ اس نے مجبوراً اپنی بیٹی شاہ حبش کو بیاہ دی۔

عراقی شہزادی اس سے پہلے شادی کر چکی تھی اور اس شادی سے اس کے ایک لڑکا بھی تھا، جسے وہ اپنے ساتھ لیتی آئی۔ بادشاہ کو اس لڑکے کا علم ہوا تو اس نے بچہ کو مروا دیا اور غصہ میں شہزادی سے بات چیت بند کر دی۔ شہزادی بہت پریشان ہوئی، آخر اس نے بادشاہ کی منہہ بولی ماں کو اپنی بپتا سنائی کہ شاہ نے میرے بچے کو جان سے مروا دیا مگر مجھے اس کی موت پر رونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

ماں کو شہزادی کی حالت پر رحم آیا۔ وہ بہو سے بولی: میں تجھ سے جو کہوں وہی کرنا تیری بھلائی اسی میں ہے۔ اس کے بعد کہنے لگی: رات کو تو بادشاہ سے پہلے سو جانا اور جب بادشاہ تیرے پاس آئے اور تیرے سینہ پر کوئی چیز رکھے تو بغیر جھجھک اس کو اپنی داستان سنا دینا۔

ماں ادھر بادشاہ سے جا کر بولی: کیا بات ہے، آج تو اداس بیٹھا ہے؟

بادشاہ نے کہا: میں نے اتنی رقم خرچ کر کے اس لڑکی کو حاصل کیا مگر معلوم ہوا وہ کھیلی کھائی ہے۔ میں نے اس کے لڑکے کو تو جان سے مروا دیا مگر میرے دل کو سکون نہیں ملا۔

بوڑھی ماں نے بادشاہ کو ایک تعویذ دیا کہ جب لڑکی سو رہی ہو یہ تعویذ اس کے سینہ پر رکھ دینا، وہ تجھے ساری بات بتا دے گی۔

بادشاہ نے ویسا ہی کیا۔ لڑکی نے اسے اپنی داستان سنائی اور کہا: میں بے قصور

ہوں، پھر بھی بادشاہ نے میرے بیٹے کو جان سے مروا دیا۔ لیکن اگر اب بھی آپ مجھ سے راضی ہوں تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔

یہ سن کر بادشاہ حبش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے شہزادی کو سینہ سے لگایا اور کہنے لگا: تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ تیرا بیٹا ہے اس کے بعد بادشاہ نے دربان کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے اس لڑکے کی قبر پر لے چلو تاکہ میں وہاں جا کر معافی مانگ سکوں۔

دربان نے کہا: میں نے لڑکے کو مارا نہیں تھا بلکہ کہیں چھپا دیا تھا، یہ آپ کا بچہ ہے۔ ماں نے بچے کو سینے سے لگایا اور میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگے۔

بختیار نے قصہ ختم کیا تو شام ہو چکی تھی چنانچہ اسے پھر واپس قید خانہ بھیج دیا گیا۔

اگلے دو دن بھی آٹھویں اور نویں وزیر بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا اگر بادشاہ بختیار کو سزا دینے میں مزید تاخیر کریں گے تو ملک کو خطرہ ہو گا۔ بادشاہ نے حکم دیا بختیار کو لا کر قتل کر دیا جائے۔ مگر بختیار نے ان دو دن بھی ایسی داستانیں سنائیں جو بادشاہ کو پسند آئیں اور اسے بدستور قید خانہ واپس کر دیا گیا۔

آخر کار دسواں وزیر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا: اجازت ہو تو میں ملکہ سے ملاقات کروں۔ بادشاہ نے اجازت دیدی۔ وزیر نے جا کر ملکہ کو بھڑکایا۔ چنانچہ ملکہ نے پھر واویلا مچایا کہ بادشاہ سلامت اس چور کے بچے کو کیوں نہیں قتل کرتے، اس نے مجھے بدنام کر دیا ہے۔

بادشاہ نے دسویں بار بختیار کے قتل کا حکم صادر کیا مگر بختیار نے پھر ایک نئی داستان چھیڑ دی۔ اس نے کہا حجاز میں ایک بادشاہ تھا، اس کا ملک آباد اور خزانہ معمور تھا لیکن اس کے کوئی اولاد نہیں تھی، بادشاہ دن رات نمازیں پڑھتا، روزے رکھتا اور

خدا سے دعا کرتا، آخر ایک کنیز اس سے حاملہ ہوئی، ایک رات بادشاہ نے خواب میں ایک پیر کو دیکھا، پیر کہہ رہا تھا، تیرے یہاں بیٹا ہوگا مگر سات سال کی عمر میں اس کو ایک شیر ہلاک کر دے گا اور اگر بیٹا شیر سے بچ گیا تو پھر وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

یہ کہہ کر پیر نے بادشاہ کے ہاتھ میں ایک رقعہ دیا اور خود غائب ہو گیا۔ بادشاہ بیدار ہوا تو رقعہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ رقعہ وزیر کو دکھلایا، وزیر بولا یہ قضائے آسمانی ہے، بدل نہیں سکتی۔ بادشاہ نے کہا اگر میں نے تقدیر بدل دی تو یاد رکھ تجھے جان سے مار دوں گا، وزیر نے اطاعت میں سر جھکایا۔

اسی دن بادشاہ نے حکم دیا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک کنواں کھودا جائے جو اوپر سے تنگ مگر نیچے سے کشادہ ہو، بچے کو ایک دایہ کے ساتھ کنویں میں رکھا گیا۔ اس طرح سات سال گذر گئے، بادشاہ ہفتہ میں ایک دن کنویں پر جاتا، دایہ لاکھ منت سماجت کرتی کہ خدارا ہمیں نکالئے، بچہ بڑا ہو گیا ہے، ہم بھی ذرا دنیا دیکھیں مگر بادشاہ اس کی بات نہیں مانتا۔

آخر ایک دن ایک شیر ایک لومڑی کو دوڑا رہا تھا۔ اتفاقاً شیر پتھر سے ٹکرایا اور کنویں میں آرہا۔ شیر نے غصہ میں لڑکے کو باہر اچھال دیا اور دایہ کو کھا گیا۔ لڑکا زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا کہ ادھر سے شاہی ڈاک کے داروغہ کا گذر ہوا۔ اس نے بچے کو اس حال میں دیکھا تو اٹھا کر گھر لے گیا اور علاج معالجہ کیا۔ داروغہ نے لڑکے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ رفتہ رفتہ وہ تیرہ سال کا ہو گیا۔

ادھر بادشاہ کنویں پر پہونچا تو اس نے دیکھا کہ کنواں خالی ہے۔ وہ سمجھا دایہ لڑکے کو لے کر فرار ہو گئی ہے۔ بادشاہ نے چاروں اور آدمی دوڑائے مگر بچہ اور دایہ کا کہیں

پتہ نہیں چلا۔ ادھر داروغۂ ڈاک اس لڑکے کو لے کر روزانہ دربار میں آتا، رفتہ رفتہ بادشاہ اسے چاہنے لگا۔ آخر کار اسے داروغہ سے مانگ کر اپنا سلاح دار بنا لیا۔ لڑکا بادشاہ کو بہت عزیز تھا۔

کچھ دن کے بعد اس ملک پر دشمن نے حملہ کیا۔ بادشاہ فوج لے کر نکلا، جنگ شروع ہوئی مگر شاہی فوج کا پلہ کمزور پڑنے لگا۔ بادشاہ نے یہ صورت حال دیکھی تو ایکا ایکی اس نے دشمن پر دھاوا بول دیا۔ اس افراتفری میں لڑکا یہ سمجھا کہ بادشاہ دشمن کا کوئی آدمی ہے۔ اس نے سونت کر تلوار ماری اور بادشاہ کا داہنا ہاتھ کندھے سے اتار لیا، بادشاہ نے لڑکے کو پہچان لیا اور خود کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا۔

خدا خدا کر کے دشمن کی فوج پسپا ہوئی، اگلے روز بادشاہ نے لڑکے کو طلب کیا اور اسے قید میں ڈال دیا، درد کے مارے خود اس کی جان ہونٹوں پر تھی، اب اس نے وزیر کو بلا کر کہا: دیکھ میں نے قضائے آسمانی کو بدل دیا ہے۔ کیونکہ نہ تو میرے لڑکے کو شیر نے کھایا اور نہ اس نے میری جان لی۔

وزیر نے کہا: لڑکے کو حاضر کیا جائے، وہ آیا وزیر نے اس سے پوچھا تیرا باپ کون ہے؟

لڑکا بولا: میں اپنے باپ کو نہیں پہچانتا، البتہ میری ایک ماں تھی جو کنوئیں میں مجھے پالتی تھی، وہ کہتی تھی کہ میرا باپ بادشاہ ہے۔ ایک روز ایک شیر کنوئیں میں آگرا۔ اس نے غصہ میں مجھے باہر اچھال دیا لیکن میری ماں کو کھا گیا۔ اتفاقاً وہاں سے داروغۂ ڈاک گذر رہا تھا، وہ مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور میری تربیت کی۔

یہ سن کر بادشاہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اس نے داروغۂ ڈاک کو بلوا کر مزید

سوالات پوچھے، آخر لڑکے کے جسم پر شیر کے پنجوں کے زخم دیکھے گئے تو سب کو یقین آگیا بادشاہ نے لڑکے کو تخت پر بٹھایا۔ سب نے مبارک سلامت پیش کی لیکن بادشاہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور تیسرے روز گذر گیا۔

آزاد بخت نے یہ داستان سن کر بختیار کو پھر قید خانہ واپس بھیجنا چاہا تو وزیروں نے اعتراض کیا اور کہا اگر یہ لڑکا دوبارہ قید خانہ بھیجا گیا تو ہم یہ ملک چھوڑ کہیں اور چلے جائیں گے۔

آزاد بخت کو وزیروں کے اصرار پر حیرت ہوئی اس نے کہا سچ تو یہ ہے کہ میں اس جوان کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ وزیروں نے بختیار کو وہاں سے نکال دیا اور سارے شہر میں منادی کرادی کہ چوک میں بختیار کو پھانسی دی جائے گی۔ لوگ جوق در جوق جمع ہوئے۔ اتفاقاً فرخ سوار۔ وہی چور جس نے بختیار کو بڑا کیا تھا، ادھر سے گذر رہا تھا، اسے صورت حال کا علم ہوا تو دوڑا دوڑا آزاد بخت کے پاس گیا اور بولا یہ لڑکا میرا نہیں ہے۔ میں نے اسے ایک کنویں پر پایا تھا، اور یہی قبا جو میں پہنے ہوئے ہوں اس کے جسم پر تھی۔

آزاد بخت کو بیحد تعجب ہوا۔ اس نے کہا اس کے علاوہ اور کیا نشانی ہے؟

فرخ سوار بولا: موتی کے یہ دس دانے جو میرے بازو پر بندھے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے موتیوں کو باہر نکالا اور بادشاہ کو پیش کیا۔

آزاد بخت یہ سن کر رو پڑا۔ اس نے کہا یہ تو میرا بیٹا ہے۔ لا یہ قبا دے، میں ملکہ کے پاس بھیجوں، دیکھوں پہچانتی ہے یا نہیں،

بادشاہ نے ملکہ کے پاس قبا بھیجی، ملکہ اسے دیکھ کر بولی: یہ تو میرے بیٹے

کی قبا ہے، بادشاہ نے کہا: تو اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ سن کر ملکہ بھی رو پڑی
بادشاہ نے حکم دیا کہ بختیار کو فوراً آزاد کیا جائے اور وزیروں کو گرفتار کر لیا جائے
بختیار ہکا بکا تھا کہ کیا ماجرا ہوا۔ آزاد بخت اسے اپنی ملکہ کے پاس لے گیا
اور بولا: دیکھ یہی تیرا بیٹا ہے جسے تو نے کنویں پر چھوڑا تھا۔

یہ سنتے ہی ملکہ کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا۔ اس نے بختیار کو آغوش میں بھینچ لیا، ماں بیٹے دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بختیار نے اپنی ماں سے پوچھا: تو نے مجھ پر یہ تہمت کیوں لگائی؟ ماں نے کہا مجھے وزیر نے یہ پٹی پڑھائی تھی۔

آخر آزاد بخت نے اپنے بیٹے بختیار کو تخت و تاج پیش کیا۔ تمام لوگوں نے مبارکباد پیش کی اور نئے بادشاہ کے اوپر سے اتنا روپیہ پیسہ نچھاور کیا کہ شہر کے تمام فقیر جھک گئے۔



خسرو و شیرین

برابر صفحه ۱۱۲

خسرو شیریں

ایران کے مثنوی گو شعرا میں نظامی گنجوی کا مرتبہ بہت اہم ہے ، نظامی ۵۳۵ ہجری کے لگ بھگ گنجہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ اپنے وطن میں گذرا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم حاصل کئے ، خصوصاً شعر و ادب میں استادی کے درجے پر فائز ہوئے۔

نظامی نے الگ الگ موضوع پر پانچ مثنوی لکھی، مخزن الاسرار، لیلیٰ و مجنوں، خسرو و شیریں، ہفت پیکر (یا ہفت گنبد) اور اسکندر نامہ انھیں مجموعی طور پر خمسہ کہتے ہیں، خمسہ سرائی میں نظامی کو اولیت اور اولویت حاصل ہے، بعد کے تمام خمسہ نگار شعرا مثلاً خواجو، جامی اور وحشی بافقی وغیرہ اس فن میں نظامی ہی کے نقش قدم پر گئے ہیں ذیل میں نظامی کی خسرو و شیریں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

○

دل بہ امید صدائی کہ بگرد تو رسد
نالہ ھا کرد درین کوہ کہ فرہاد نکرد
(حافظ)

دل نے اس امید میں کہ شاید اس کی صدا تجھ تک پہونچ جائے ان پہاڑوں میں اس طرح فریاد کی کہ فرہاد نے بھی نہ کی ہو گی۔

ہرمز بادشاہ تخت پر بیٹھا تو بڑے نیاز صدقوں سے اس کے یہاں ایک بیٹا ہوا جس کا نام پرویز رکھا گیا۔ ہرمز نے نوزاد کی تربیت کے لئے کئی ایک دایہ کو مقرر کیا۔ پرویز ہاتھوں ہاتھ پلا، عمر کے ساتھ ساتھ اس نے نئے نئے ہنر سیکھے۔ کشتی کا فن بھی سیکھا۔ دوسرے فنون میں بھی کمال حاصل کیا۔

جہاندار از جہانش دوستر داشت   جہان چہ بود ز جانش دوستر داشت

بادشاہ اسے ساری دنیا سے زیادہ عزیز رکھتا تھا بلکہ دنیا کیا ہے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا۔

ہرمز نے یہ سوچ کر کہ اس کا بیٹا صحیح سالم رہے اور لمبی عمر پائے، رعایا کے ساتھ عدل وانصاف شروع کیا، اس نے ملک میں منادی کرادی کہ جو شخص کسی دوسرے کو تکلیف پہونچائے گا یا اپنا گھوڑا دوسرے کے کھیت میں چرنے کو چھوڑے گا اسے ضرور سزا ملے گی۔

اتفاق سے ایک روز پرویز شکار کھیلنے گیا۔ وہ دن بھر شکار کرتا رہا، رات ہوئی تو اس تے اسی طرف ایک گھر میں محفل جمائی اور دوستوں کے ساتھ ناؤ و نوش میں لگ گیا۔ اتفاق سے اس کا گھوڑا کھل کر ایک کھیت میں جا پہونچا اور وہاں خاصا نقصان کیا۔ اس کے علاوہ ایک غلام کسی دہقان کے باغ میں گھس گیا اور وہاں اس نے خوب سارے انگور توڑ لئے۔

لوگوں نے بادشاہ کے پاس خبر پہونچائی کہ پرویز نے ظلم وستم شروع کر دیا ہے اس کے گھوڑے نے ایک کھیت میں جا کر وہاں کی ہری کھیتی چر ڈالی اور اس کے غلام نے ایک باغ میں گھس کر انگوروں کے خوشے چرا لئے۔ کل رات پرویز زبردستی ایک غریب کسان کے گھر میں گھس گیا اور اس کے دوست ساری رات شراب پی کر شور مچاتے رہے جس سے نامحرم عورتوں کو تکلیف ہوئی۔ لوگوں نے ہرمز سے کہا اگر پرویز کی حرکتیں یہی رہیں تو ہم اسے تیرا بیٹا ماننے کو تیار نہیں، خدا اسے غارت کرے۔

ہرمز نے حکم دیا پرویز کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دئے جائیں، اس کا غلام دہقان کے حوالے کیا جائے اور شہزادے کا تخت اس کسان کو دیدیا جائے جس کے گھر میں گھس کر اس نے رنگ رلیاں منائی تھیں۔ جس چنگ نواز نے پرویز کی محفل میں چنگ بجایا تھا اس کے ناخن کاٹ دئے جائیں اور اس کا چنگ توڑ پھوڑ دیا جائے

سیاست بین کہ می کردند زین پیش
نہ با بیگانہ، با در دانہٴ خویش

دیکھو اگلے وقتوں میں کسی جرم پر صرف بیگانوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کیسی سزا دیتے تھے۔

جہان ز آتش پرستی شد چنان گرم

که بادا زین مسلمانی ترا شرم

وہ آتش پرست تھے مگر ان کے کفر میں خلوص کی وہ گرمی تھی کہ ہمیں اپنے اسلام پر شرم کرنی چاہیئے۔

پرویز نے دیکھا باپ نے اسے جو سزا دی ہے، انصاف پر مبنی ہے، اسے اپنی بے عزتی پر افسوس ہوا۔ چنانچہ وہ ایک شخص کو سفارش کے لئے لے کر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں پہونچ کر اس نے زمین پر سجدہ کیا اپنی غلطی پر رویا اور باپ سے اپنے جرم کی معافی مانگی۔ ہرمز نے دیکھا بیٹے کو اپنے گناہ کا احساس ہے اور وہ سزا بھگتنے کے لئے حاضر ہے۔ چنانچہ اس نے شہزادے کو معاف کر دیا، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا۔

پرویز خوش خوش اپنے محل کو لوٹا۔ رات کو وہ سویا تو اس نے اپنے دادا کو خواب میں دیکھا جو اسے چار چیزوں کی بشارت دے رہے تھے۔

اول یہ کہ چونکہ وہ صبر و ضبط کے ساتھ سزا بھگتنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا، اسے شیریں نام کی معشوقہ ملے گی۔

دوسرے یہ کہ چونکہ اس کے گھوڑے کا پاؤں کاٹ دیا گیا اسے شبدیز نام کا مشکی گھوڑا ملے گا۔

تیسرے یہ کہ چونکہ اس کا اپنا تخت کسان کو دے دیا گیا اسے تخت طاقدیس نصیب ہو گا۔

چوتھے یہ کہ چونکہ اس کو ساز و مطرب سے محروم کر دیا گیا خدا اسے باربد جیسا

موسیقار عطا کرے گا۔

پرویز بیدار ہوا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے خواب کی تعبیر کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا ایک ندیم تھا شاپور نام، بڑا ماہر نقاش اور مصور تھا، ایک روز شاپور شہزادہ پرویز کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین ادب کو بوسہ دے کر بولا:

اجازت ہو تو کچھ دلچسپ باتیں سناؤں۔ شہزادے کی اجازت پا کر وہ یوں کہنے لگا:

پہاڑوں کے اس طرف ایک عورت کی حکومت ہے، وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا نام مہین بانو ہے۔ اران سے ارمنستان تک سارا علاقہ اس کے زیر نگیں ہے۔ اس کی ایک بھتیجی ہے، لڑکی کیا ہے چاند کا ٹکڑا ہے۔

شب افروزی چو مہتاب جوانی سیہ چشمی چو آب زندگانی

اس کے بدن کی چاندنی سے رات جگمگا اٹھتی ہے، اس کی آنکھوں کی سیاہی میں آب حیات موجزن ہے۔

دو شکر چون عقیق آب دادہ دو گیسو چون کمند تاب دادہ

اس کے لب شیریں ہیں یا رس بھرے عقیق، اس کی زلفیں ہیں یا بٹی ہوئی کمند۔

نمک دار دلبش در خندہ پیوست نمک شیرین نباشد، وان او ہست

اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھرتا ہے تو ان کی ملاحت اور نکھر آتی ہے، تعجب ہے کہ ان ہونٹوں میں شیرینی بھی ہے اور نمک بھی۔

رخش نسرین و بویش نیز نسرین لبش شیرین و نامش نیز شیرین

اس کے رخسار چمیلی جیسے گورے ہیں، اس کا بدن چمیلی کی طرح معطر

ہے، اس کے ہونٹ قند کی طرح شیریں ہیں اور خود اس کا نام شیریں ہے۔

شاپور نے کہا: شیریں مہین بانو کی ولیعہد ہے، اس کے پاس شبدیز نام کا ایک گھوڑا ہے جس کی ٹاپ فولاد کی طرح ہے اور جو وقت کی طرح تیز رفتار ہے آندھی ہو یا طوفان شبدیز کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔

شاپور نے شیریں اور شبدیز کی اتنی تعریف کی کہ پرویز کے لئے سونا جاگنا اور کھانا پینا حرام ہوگیا۔ کبھی کبھی وہ من ہی من میں شیریں کی باتیں سن کر کھل اٹھتا۔ آخر جب اسے اپنے اوپر قابو نہیں رہا تو اس نے ایک دن شاپور سے کہا جس کہانی کو تو نے شروع کیا ہے اس کو انجام تک لانا بھی تیرا ہی کام ہے۔ اگر شیریں کا دل واقعی موم کی طرح نرم ہے تو کسی طرح ہماری محبت کا نقش اس میں بٹھانے کی کوشش کر، لیکن اگر وہ فولاد کی طرح سنگ دل ہے تو ٹھنڈا لوہا کوٹنے سے کیا حاصل؟

شاپور نے زمین ادب کو بوسہ دیا اور شہزادے کو امید دلائی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آقا کو ضرور دلبر تک پہونچائے گا۔

نخسبم تا نخبانم سرت را　　　　نیایم تا نیارم دلبرت را

جب تک تیرا سر زانوئے یار پر نہ دیکھ لوں میں دم نہیں لوں گا اور اگر تیرے دلبر کو نہیں لا سکا تو خود پلٹ کر نہیں آؤں گا۔

چنانچہ شاپور نے سفر کی تیاریاں کیں اور پہاڑوں کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے وہ ایک سبزہ زار میں پہونچا جہاں شیریں اور اس کی کنیزیں گرمی کا موسم گذارنے آتی تھیں شاپور تھک کر چور ہو رہا تھا، اس نے قریب کے ایک ٹوٹے ہوئے معبد میں دم لیا۔

معبد میں رہنے والوں سے اس نے دریافت کیا کہ لڑکیاں کس جگہ ڈیرا جماتی ہیں ؟ ان لوگوں نے بتایا صبح کو وہ پہاڑ کے دامن میں آجاتی ہیں اور وہاں جشن مناتی ہیں۔

شاپور صبح سویرے اٹھا اور لڑکیوں سے پہلے اس سبزہ زار میں پہونچ گیا اس نے ایک کاغذ پر پرویز کی تصویر بنائی اور اسے ایک درخت کی ٹہنی سے لٹکا کر خود جن پری کی طرح غائب ہوگیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد لڑکیاں وہاں پہونچیں، انھوں نے ہری گھاس پر بساط عیش جمائی اور جشن و طرب میں مشغول ہوگئیں۔ لڑکیوں نے دیکھا وہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد تو لہک لہک کر ناچنے گانے لگیں۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔

انھیں لڑکیوں میں شیریں بھی تھی جو ستاروں میں چاند کی طرح چمک رہی تھی، شیریں مستی میں جام پر جام چڑھا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر پرویز کی تصویر پر پڑی۔ اس نے کنیزوں سے کہا تصویر اتار کر لاؤ۔ شیریں ایک گھنٹہ تک ٹکٹکی باندھ کر تصویر کو دیکھتی رہی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے نظر ہٹانے کو تیار نہیں تھی۔ گویا اس تصویر کا نظارہ اسے لمحہ بہ لمحہ مست کر رہا تھا، کنیزوں نے شیریں کا یہ حال دیکھا تو مذاق میں تصویر کہیں چھپا دی۔ شیریں پھر اسے ڈھونڈھ لائی۔ نگہبانوں نے دیکھا کہ اس طرح شیریں عشق کے چکر میں پھنس جائے گی تو انھوں نے تصویر پھاڑ کر پھینک دی اور بولے: یہ تصویر پریوں نے لاکر لگائی تھی، یہاں سے کہیں اور چلیں، یہ علاقہ آسیب زدہ معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ لڑکیوں نے جن پری کے سایہ سے بچنے کے لئے اسپند جلایا اور وہاں سے دوسرے جنگل میں پہونچیں۔ لیکن شاپور ان سے پہلے وہاں پہونچ چکا تھا، وہاں بھی اس نے ویسی ہی ایک اور تصویر بنا کر درخت سے آویزاں کر دی۔ لڑکیاں وہاں پہونچ

کر کھیل کود میں مصروف ہوگئیں کہ اتنے میں شیریں کی نظر تصویر پر پڑی۔ وہ اپنے من میں بولی یہ میرا وہم تو نہیں ہے۔

شیریں نے ایک کنیز سے کہا: جا تصویر اتار لا، کنیز نے چالاکی سے اس تصویر کو کہیں چھپا دیا اور آکر بولی: کیسی تصویر؟ وہاں تو کوئی تصویر نہیں ہے۔ یہ سب چھلاوا ہے، آؤ یہاں سے بھی کسی اور جنگل میں چلیں۔

لڑکیاں تیسرے جنگل میں پہونچیں، ذرا دم لیا اور پھر عیش و نشاط کا سامان پھیلایا۔ لیکن شاپور نے وہاں بھی پہونچ کر پرویز کی تصویر لگا دی تھی، شیریں کو پھر وہی تصویر نظر آئی تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اب کی بار اس نے خود جاکر تصو..یر اتاری اور سوچ میں ڈوب گئی۔

شیریں کی سہیلیاں سمجھ گئیں کہ یہ تصویر کسی جن پری کی نہیں بلکہ انسان کا کام ہے۔ چنانچہ وہ بولیں: ہم ہر طرح سے تیری مدد کریں گے۔ یہ کہہ کر وہ سب اصل حقیقت کا پتہ لگانے جنگل میں چل دیں

شیریں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس نے ایک کنیز کو جنگل کے چوکیدار کے پاس بھیجا کہ شاید وہ تصویر کے بارے میں بتا سکے مگر اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اتنے میں شاپور پیڑوں کی آڑ سے نکل کر شیریں کے سامنے آگیا۔ شیریں نے اس کا چہرہ دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ صورت آشنا ہے۔ اس نے کنیزوں سے کہا اس اجنبی سے تصویر کے بارے میں پوچھو۔

شاپور نے دیکھا شکار اس کے پنجے میں ہے تو بولا: میں اتنی آسانی سے یہ راز نہیں بتا سکتا۔

شیریں نے یہ سنا تو خود لپک کر شاپور کے پاس گئی اور بڑے ناز و ادا سے بولی:
بیگانگی چھوڑو اور اپنوں کی سی بات کرو۔

شاپور نے تنہائی میں لے جا کر شیریں کو بتایا کہ یہ تصویر شاہ ایران خسرو پرویز کی ہے جس پر تاج و تخت کو ناز ہے۔ شاپور پرویز کے بارے میں جیسے جیسے بتاتا جاتا تھا، شیریں اور کرید کرتی جاتی تھی۔ جب اس کے سارے سوال ختم ہو گئے تو شاپور نے اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ شیریں نے اپنے دل کا راز اگل دیا اور کہنے لگی میں اس تصویر والے کو اپنا دل دے بیٹھی ہوں اور اس سلسلہ میں تمھاری مدد چاہتی ہوں۔

یہ سن کر شاپور نے کہا: یہ تصویر میں نے ہی بنائی ہے۔ وہ دیر تک شیریں کو پرویز کے بارے میں بتاتا رہا۔ شیریں اپنے دلبر کی تعریف سن کر یوں محو ہو رہی تھی جیسے شاپور اسے کانوں کے ذریعہ شراب پلا رہا ہو۔ آخر اس نے شاپور سے پوچھا اب کیا کیا جائے؟

شاپور نے کہا: اول تو یہ راز کسی پر فاش نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ کل تو اپنے شبدیز پر بیٹھ کر یہاں سے فرار کر جا۔ میں جلد ہی تیرے پاس پہونچ جاؤں گا۔

یہ کہہ کر اس نے شیریں کو بطور نشانی پرویز کی انگوٹھی دی اور کہا: اگر اتفاقاً تجھے راستہ میں پرویز مل جائے تو یہ انگوٹھی اس کو دکھا دینا ورنہ سیدھے تو مدائن کی راہ لے اور وہاں قصر شاہی کے دربانوں کو یہ انگوٹھی دکھانا۔ وہ لوگ تجھے محل کے باغ میں پہونچا دیں گے۔ وہاں آزادی سے گھوم پھر، وہیں تیری ملاقات خسرو پرویز سے ہو گی۔

اگلی صبح شیریں نے شکاریوں کا لباس پہنا اور کنیزوں کے ہمراہ شکار کو چلی وہ بہت دیر تک ادھر ادھر شہسواری کرتی رہی اور ایک جنگل سے دوسرے

جنگل میں گھومتی رہی۔ اچانک اس نے شبدیز کو ایڑ لگائی اور دیکھتے دیکھتے سہیلیوں سے بہت دور چلی گئی۔ کنیزوں نے سایہ کی طرح اس کا تعاقب کیا مگر اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں۔ وہ سب رات گئے تک اسے تلاش کرتی رہیں آخر نا امید ہو کر مہین بانو کے پاس پہونچیں اور بڑے دکھ کے ساتھ اسے شیریں کا ماجرا سنایا۔ مہین بانو کو بیحد رنج ہوا۔ اس نے بھتیجی کے سوگ میں رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

ادھر شیریں گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی تھی، اور پوچھ پوچھ کر راستہ طے کر رہی تھی صبح کو وہ ایک مرغزار میں پہونچی جہاں بہشت کی سی تازگی تھی۔ مرغزار میں ایک چشمہ تھا جس کا پانی آب حیات کی طرح زندگی بخش تھا، شیریں تھک کر چور ہو رہی تھی، اس کا بدن گرد و خاک سے اٹا ہوا تھا، اس نے سوچا چشمہ میں نہا دھو کر آگے بڑھوں، چنانچہ اس نے کپڑے اتارے، کمر سے ریشم کا ایک نیلا ٹکڑا لپیٹا اور پانی میں اتر گئی۔

تن سیمینش می غلتید در آب — چو غلتد قاقمی بر روی سنجاب

اس کا نقرئی بدن روپہلے پانی میں یوں ڈولتا تھا۔ جیسے سنجاب پر قاقم پھسل رہی ہو۔

ادھر پرویز کا حال سنئے۔ اس نے چند دن شیریں کے انتظار میں گذارے آخر گھبرا کر شکار کو نکل پڑا۔ چلتے وقت اس نے محل کی کنیزوں کو ہدایت کی کہ اگر کوئی حسینہ آئے تو اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ محل میں اتاریں اور اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کریں۔

پرویز اپنے چند غلاموں کے ساتھ ارمنستان کی طرف جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ اسی مرغزار میں پہونچا جہاں شیریں نہا رہی تھی۔ وہاں پہونچ کر پرویز کا

گھوڑا رک گیا۔ پرویز غلاموں سے بولا: تم لوگ گھوڑوں کو چارہ کھلاؤ میں ذرا جنگل کا ایک چکر کاٹ کر آتا ہوں۔ چنانچہ وہ مرغزار میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اچانک اس کی نظر شیریں پر پڑی۔

در آب نیلگون چون گل نشستہ　　　پرند نیلگون تا ناف بستہ

جو ناف تک ریشم کا نیلا کپڑا لپیٹے چشمہ کے نیلگوں پانی میں ایسے بیٹھی تھی جیسے گلاب کا پھول رکھا ہو۔

شیریں پانی میں بیٹھی اپنی بھیگی لٹوں کو انگلیوں سے سلجھا رہی تھی۔ پرویز اسے دیکھتے ہی مچل اٹھا مگر شیریں نے ایک اجنبی کو دیکھا تو شرما کر زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پرویز نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔ اتنے میں شیریں پانی سے باہر آئی، کپڑے پہنے اور شبدیز پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا، وہ راستے میں سوچتی جا رہی تھی کہ شاید یہی وہ جوان ہے جسے وہ اپنا دل دے بیٹھی ہے مگر یہ جوان پرویز کیسے ہو سکتا ہے، اس میں تو بادشاہی کی کوئی نشانی نہیں تھی۔ شیریں کو معلوم نہیں تھا کہ جب بادشاہ لوگ سفر پر نکلتے ہیں تو عام انسانوں کا لباس پہن لیتے ہیں تاکہ کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ اسی شش و پنج میں شیریں بہت دور نکل گئی۔

ادھر پرویز نے دوبارہ چشمہ کی طرف دیکھا تو وہاں سناٹا تھا، اس نے ہر طرف گھوڑا دوڑایا مگر دلبر کا کہیں اتا پتا نہیں تھا، پرویز کے دل سے آہ نکل گئی، اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ افسوس شکار ہاتھ میں آ کر نکل گیا۔ اس نے سوچا میری قسمت ہی خراب ہے۔ اسی مایوسی میں وہ ارمنستان کی طرف چل پڑا۔

ادھر شیریں وہاں سے چلی تو سیدھی مدائن پہونچی اور جاکر شاہی محل میں اتری۔ پرویز کی کنیزوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خدمت میں اس طرح لگ گئیں جیسے وہ یہاں کی ملکہ ہو۔ شیریں کے گھوڑے کو شاہی اصطبل میں رکھا گیا۔ کنیزوں نے جب اسے بتایا کہ پرویز شکار کو گیا ہے اور وہاں سے ارمنستان جائے گا تو شیریں کو بہت افسوس ہوا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ جس سوار سے وہ راستہ میں ملی تھی وہ پرویز ہی تھا، چنانچہ شیریں خود کو لعن طعن کرنے لگی لیکن اب صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

محل میں شیریں کا جی نہیں لگا، وہاں پرویز تو تھا ہی نہیں، آخر اس نے کنیزوں سے کہا میرے لئے پہاڑ کے دامن میں محل کا انتظام کیا جائے کیونکہ میں پہاڑی آب و ہوا کی عادی ہوں اور یہاں کی گرمی میں میرا چہرہ پیلا پڑتا جا رہا ہے کنیزوں نے بظاہر حکم کی تعمیل کی لیکن حسد کے مارے وہ جلی جا رہی تھیں، آخر انھوں نے شاہی معمار کی مٹھی گرم کی کہ شیریں کا محل ایسی جگہ تعمیر کر جہاں کی آب و ہوا بیحد خراب ہو۔ معمار نے کرمانشاہ سے دس فرسخ کی دوری پر ایک محل بنایا وہاں کی آب و ہوا اتنی خراب تھی کہ ایک ہفتہ میں بچہ بوڑھا ہو جائے، محل تیار ہوا تو شیریں اس میں قیام پذیر ہوئی۔

ادھر پرویز ارمنستان پہونچ کر مہین بانو کا مہمان ہوا۔ بانو نے انتہائی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور باغ پستید میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ باغ کی آب و ہوا گرم تھی اور سردی کے موسم میں وہاں عجیب لطف تھا، خسرو پرویز نے وہاں عیش و طرب کے دن گذارنے شروع کئے، لیکن شیریں کا غم ارمنستان

کی شراب تلخ پر ہمیشہ غالب رہا۔

ایک روز پرویز کو پتہ چلا کہ اس کا نقاش شاپور وہاں آیا ہے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے حکم دیا، شاپور کو فوراً حاضر کیا جائے۔ شاپور آیا تو پرویز نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا اور اکیلے میں لے جاکر اس سے شیریں کا حال پوچھا۔ شاپور نے شروع سے آخر تک ساری بات بتائی کہ کیسے اس نے تصویریں بنا بنا کر شیریں کو لبھایا اور پھر ترکیب کر کے اسے یہاں سے فرار کرادیا۔ پرویز نے بھی چشمہ میں شیریں کے نہانے اور اس کے غائب ہونے کی بات بتائی، آخر یہ طے پایا کہ مہین بانو سے درخواست کی جائے کہ وہ شاپور کو شبدیز جیسا تیز رو گھوڑا مہیا کرے اور وہ مدائن جاکر شیریں کو لے آئے۔ شاپور مدائن پہونچا، اس نے دیکھا شیریں اداس اور افسردہ ہے، شاپور نے اسے پرویز کی بات بتائی اور دونوں فوراً ارمنستان کو چل دئے۔

ادھر پرویز شیریں کے انتظار میں گھلتا رہا۔ اتنے میں ایک روز مدائن سے قاصد آیا اور اس نے پرویز کو یہ افسوسناک خبر سنائی کہ اس کا باپ ہرمز چل بسا۔ پرویز کو بیحد صدمہ ہوا۔ مجبوراً اس نے مدائن کی راہ لی حالانکہ اس کا من شیریں میں اٹکا تھا، کچھ دن کے بعد شاپور شیریں کے ساتھ ارمنستان پہونچا، مہین بانو اپنی کھوئی ہوئی بھتیجی کو پاکر بہت خوش ہوئی، اس نے پچھلی باتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن اب بھی شیریں کو پرویز نہیں مل سکا۔

پرویز مدائن پہونچ کر ایران کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ لیکن بدبختی نے ابھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ہرمز کی سوگواری کا زمانہ ابھی مشکل سے ختم ہوا کہ مدائن پر بہرام چوبیں نے حملہ کر دیا۔ بہرام بڑا طاقتور دشمن تھا، اس نے مکروفریب سے

رعایا کو اپنے ساتھ کر لیا تھا، پرویز نے دیکھا وہ بے یار و مددگار ہے اور بہرام چوبین کا مقابلہ اس کے بس کا نہیں ہے۔ چنانچہ وہ بھاگ کر آذربائیجان چلا گیا اور وہاں موقان میں قیام کیا۔ اتفاقاً ایک دن وہ شکار کھیلنے جنگل گیا ہوا تھا، وہاں شیریں بھی آئی تھی، دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا، خوشی سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور سر سجدے میں گر پڑے۔

مہین بانو کو پرویز اور شیریں کی ملاقات کا علم ہوا تو اس نے پرویز کو اپنے یہاں محل میں مہمان رکھا، اس کی خدمت میں بہت سارے تحفے تحائف بھیجے اور اس کے اعزاز میں شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ لیکن وہ ان دونوں کی شیفتگی پر فکرمند ہوئی اور سوچنے لگی یہ آگ اور تیل کا خطرناک کھیل کب تک چلے گا۔ آخر اس نے شیریں کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگی:

تو گنجی سر بمہر نا بسودہ　　　بدو نیک جہان نا آزمودہ

تو ایسے خزانے کی طرح ہے جس کی مہر پر کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہے۔
تو نے زمانے کا بھلا برا ابھی نہیں دیکھا ہے۔

چنانم در دل آید کاین جہانگیر　　　بہ پیوند تو دارد رای و تدبیر

مجھے ایسا لگتا ہے کہ پرویز بادشاہ تجھ سے شادی کی بات سوچ رہا ہے

ولیکن گرچہ بینی ناشکیبش　　　نبینم گوش داری بر فریبش

لیکن یاد رکھ وہ لاکھ بے صبری دکھائے تو ہرگز اس کے چکمے میں نہیں آنا۔

نباید کز سر شیرین زبانی　　　خورد حلوای شیرین رایگانی

ایسا نہ ہو کہ وہ چکنی چپڑی باتیں کر کے تیرے حلوے کو مفت میں چٹ کر جائے۔

فرو ماند ترا آلودهٔ خویش　　ہوائے دیگری گیرد فرا پیش

اور تجھے جھوٹا کرکے چھوڑ دے اور پھر کسی اور کے پیچھے چل دے

بسا گل را کہ نغز و تر گرفتند　　بیفکندند چون بو بر گرفتند

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ لوگ نازک اور تر و تازہ پھول کی طرف لپکتے ہیں مگر جیسے ہی اس کی خوشبو سونگھی اسے دور پھینک دیتے ہیں۔

مہین بانو کی نصیحت آمیز باتیں سن کر شیریں بولی: میں خدا کی کتاب اور چاند تاروں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ پرویز کے عشق میں چاہے مجھے خون کے آنسو رونے پڑیں لیکن جب تک میں اس کی باقاعدہ بیوی نہیں بنوں گی، اپنے آپ کو سنبھال کر رکھوں گی۔ چنانچہ مہین بانو نے اجازت دے دی کہ شیریں چند لوگوں کی موجودگی میں پرویز سے مل سکتی ہے۔

ایک روز شیریں اپنی سہیلیوں اور پرویز کو لے کر چوگان کھیلنے نکلی۔ لڑکیوں نے خوب شور مچایا لیکن کھیل میں وہ مہارت دکھائی کہ پرویز بھی دنگ رہ گیا۔ اب پرویز اور شیریں کی باری تھی۔ دونوں نے کھیل شروع کیا۔ کبھی پرویز گیند لے بھاگتا اور کبھی شیریں، گویا چاند اور سورج تھے جو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

کھیل ختم ہوا تو یہ قافلہ صحرا میں جا کر شکار میں مصروف ہو گیا، رات ہوئی تو سب تھک کر وہیں سو رہے۔ اس طرح ان لوگوں نے ایک مہینہ جنگل میں گذار دیا۔ پرویز ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتا کہ کسی طرح شیریں کو اپنے دل کی بات بتا سکے مگر کنیزیں ہر وقت شیریں کو گھیرے رہتی تھیں اور پرویز کو موقع نہیں

ملتا تھا۔

ایک روز یہ لوگ کسی اور مرغزار میں پہونچے اور وہاں بساط طرب آمادہ کی چاروں طرف غلام اور کنیز حلقہ باندھے تھے اور بیچ میں شیریں اور پرویز جلوہ فرما تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا، اتنے میں جھاڑیوں سے ایک شیر نکل کر ان پر جھپٹا، سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے، صرف پرویز رہ گیا۔ شیر اس کی طرف بڑھا، پرویز اتفاق سے صرف ایک پیرہن پہنے تھا، نہ تن پر زرہ تھی اور نہ کمر میں تلوار، شراب کا نشہ الگ۔ لیکن وہ ہمت کر کے اٹھا اور شیر کے منھ پر اتنے زور کا مکا مارا کہ شیر چکرا کر گر گیا۔ اتنے میں غلاموں نے بڑھ کر شیر کو مار ڈالا اور اس کی کھال اتار کر رکھ لی۔

پرویز کی بہادری دیکھ کر شیریں دنگ رہ گئی، اس نے بڑھ کر پرویز کا ہاتھ چوم لیا لیکن جواب میں پرویز نے شیریں کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے اور گویا اسے یہ بتانا چاہا کہ بوسہ کی جگہ ہاتھ نہیں ہونٹ ہیں۔

نخستین پیک بود آں شکرین جام   کہ از خسرو بہ شیرین برد پیغام

شیریں کے ہونٹ کیا تھے شکر کے پیالے تھے اور خسرو نے پہلی بار ان کے ذریعہ اپنے دل کی بات محبوب سے کہی۔

اگرچہ کرد صد جام دگر نوش   نشد جام نخستینش فراموش

پرویز نے اس کے بعد سیکڑوں جام پئے مگر کبھی وہ پہلے جام کی لذت کو فراموش نہیں کر سکا۔

اس واقعہ کے بعد شیریں اور پرویز دن رات مگن رہتے، شراب پیتے اور جنگل میں پھول چنتے۔ کبھی کبھار خلوت ملتی تو ایک دوسرے کے ہونٹوں کا بوسہ

لے لیتے۔ لیکن شیریں فوراً شرما کر ہٹ جاتی، خسرو ہمیشہ اس تاک میں رہتا کہ شیریں کبھی خوب مست ہو تو شاید اس کی مقصد برآری ہو سکے۔

آخر بہار کی ایک رات محفل جمی تھی، شراب کا دور چل رہا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، تھوڑی دیر میں سب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چلیں اور وہ اٹھ اٹھ کر سونے چل دئے۔ خلوت ہوئی تو خسرو شیریں کے دامن سے لپٹ گیا کہ بس آج تو مان جاؤ۔ شیریں خود عشق میں بے قابو ہو رہی تھی، اس کی ایک آنکھ میں دعوت تھی اور دوسری میں جھجھک۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

خسرو اس انکار پر جھنجھلا اٹھا۔ اس نے کہا اگر تیری ضد کا یہی حال رہا تو ایک روز میں جان دے دوں گا اور پھر تو بیٹھ کر ماتم کرے گی۔ لیکن یاد رکھ میرا خون اکارت نہیں جائے گا۔ آ، کاہے کو ضد کرتی ہے، ایک بوسہ دے، دس بوسہ لے، جوانی ہے، اس کی قدر کر۔

لیکن شیریں اسے برابر ٹالتی رہی اور کہنے لگی مجھے کسی ایسے کام کے لئے نہ کہہ جس میں میری آبروریزی ہو۔ وہ خسرو کو سمجھانے لگی کہ تجھے اپنے تخت و تاج کی فکر نہیں، یہاں عیش میں پڑا ہے، یاد رکھ اگر تو مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے تو بادشاہی سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور اگر بادشاہت چاہتا ہے تو میں ہاتھ سے گئی۔

آخر کار جب خسرو شیریں سے بالکل نا امید ہو گیا تو ایک روز شبدیز پر بیٹھ کر چل دیا۔ وہ کئی منزلیں طے کرنے کے بعد قسطنطنیہ پہونچا۔ قیصر روم نے اس کا شایان شان استقبال کیا۔ اپنی لڑکی مریم سے اس کی شادی کی اور ایک بھاری فوج اس کے ہمراہ کی۔ خسرو رومی فوج لے کر مدائن پہونچا اور بہرام چوبیں کو شکست دے کر دوبارہ

تخت نشین ہوا۔ اب اسے دنیا کا سارا عیش میسر تھا، مگر شیریں کی یاد اسے برابر ستاتی تھی۔

ادھر شیریں بھی بچھڑے ہوئے محبوب کا ماتم کرتی اور خود ہی کو لعنت ملامت کرتی۔ مہین بانو اور شاپور اسے سمجھاتے اور صبر کی تلقین کرتے۔ کچھ عرصہ کے بعد مہین بانو بیمار پڑی۔ اس نے خزانے کی کنجیاں شیریں کے حوالے کیں اور اس دنیا سے چل بسی۔ شیریں ارمنستان کے تخت پر بیٹھی اس نے قیدیوں کو آزاد کردیا اور رعایا کے ساتھ عدل وانصاف شروع کیا مگر سلطنت کے کاموں میں اس کا جی کہاں لگتا تھا، وہ تو خسرو کے عشق میں دیوانی تھی، اور ہر آتے جاتے سے اس کا پتہ پوچھتی تھی۔ آخر اسے معلوم ہوا کہ خسرو دوبارہ تخت نشین ہوگیا ہے اور اس نے مریم نامی ایک عورت سے شادی کر لی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ مریم بڑی سنگدل عورت ہے، اس نے خسرو سے یہ قسم لے لی ہے کہ اس کے جیتے جی کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔

شیریں کو یہ سب باتیں سن کر بہت افسوس ہوا لیکن اس نے سوچا مدائن چل کر قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ اس نے ارمنستان کی حکومت ایک غلام کے حوالہ کرکے ایک کنیز اور بہت سارا خزانہ ساتھ لیا اور مدائن کو چل دی۔ وہاں پہونچ کر وہ اسی محل میں اتری جس میں وہ پہلے رہ چکی تھی۔

خسرو کو شیریں کے آنے کی خبر ملی تو اس کی خوشی کی حد نہ رہی مگر مریم کا ہوّا تھا، کیا کرتا۔ صرف نامہ و پیام تک بات محدود رہی، لیکن رفتہ رفتہ خسرو اتنا بے قرار ہوا کہ ایک دن مستی کے عالم میں وہ مریم کے پاس گیا اور بولا: اجازت ہو تو شیریں کو بھی اسی محل میں لے آؤں؟

مریم کب پسیجنے والی تھی، اس نے کہا یاد ہے تم نے مجھ سے کیا قسم کھائی تھی

اگر تم شیریں کو یہاں لائے تو باپ قسم میں اپنے کو پھانسی لگا لوں گی۔

خسرو اور شیریں کے بیچ شاپور پیغام رسانی کرتا تھا۔ ایک دن خسرو نے اس سے کہا: تو چپکے سے شیریں کو میرے پاس لا۔ میں اسے لعل کی طرح محل میں چھپا کر رکھوں گا۔ لیکن ملکی مصلحت اجازت نہیں دیتی کہ میں علی الاعلان اس سے عشق کروں۔ دوسری طرف اگر مریم کو پتہ چل گیا تو وہ عیسیٰ کی طرح پھانسی پر چڑھ جائے گی بہتر یہی ہے میں شیریں کے ساتھ خفیہ طور پر تعلقات رکھوں۔

شاپور شیریں سے جا کر بولا: خسرو تجھے پانے کے لئے بیتاب ہے لیکن مریم کو دیکھ کر اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ خسرو کی مجبوری یہ ہے کہ وہ مریم کے سلسلہ میں قیصر روم سے عہد کر چکا ہے، اب اگر تو مناسب سمجھے تو چپکے سے خسرو کے محل میں جا کر عیش کر۔

شاپور کی تجویز سن کر شیریں بھڑک اٹھی، اس نے چلا چلا کر شاپور کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ تجھے شرم نہیں آتی؟ کیا تو بالکل کافر ہو گیا ہے، کیا یہاں کا یہی دستور ہے کہ جو موتی ملے بیندھ دو اور جو بات زبان پر آئے، بک دو، میں ایک شریف و نجیب خاندان کی لڑکی ہوں، ایسی نیچی بات کیسے کروں، کیسے چھپ کر خسرو کے محل میں چلی جاؤں؟ سوچ تو سہی میں یہاں گھٹ گھٹ کر جان دے رہی ہوں اور وہ مریم کے ساتھ گل چھرے اڑا رہا ہے۔ ایسے سنگدل کو دل دینے سے کیا فائدہ ہوگا۔

نخواہم کردن این تلخی فراموش   کہ جان شیرین کند، مریم کند نوش

میں کبھی اس درد کو نہیں بھول سکتی کہ میں تو یہاں پردیس میں گھل گھل کر جان دے رہی ہوں اور مریم خسرو کے ساتھ عیش کر رہی ہے۔

اس کے بعد شیریں تنک کر شاپور سے بولی:

کہ گرشہ گوید او را دوست دارم — بگو کاین عشوہ ناید در شمارم

کہ اگر خسرو میرے عشق کا دعوی کرے تو اس سے کہنا شیریں ان بہلاووں میں نہیں آنے کی۔

وگر گوید بداں صبحم نیاز است — بگو بیدار منشین شب دراز است

اور اگر وہ یہ کہے کہ میں صبح وصال کا متمنی ہوں تو اس سے کہنا سو جا، رات لمبی ہے۔

وگر گوید کشم تنگش در آغوش — بگو کاین آرزو بادت فراموش

اور اگر وہ یہ کہے میں شیریں کو سینہ سے لگانا چاہتا ہوں تو کہنا اس آرزو کو دل سے نکال دے۔

وگر گوید نہم رخ بر رخ ماہ — بگو بارخ برابر کی شود شاہ

اور اگر خسرو یہ کہے کہ میں شیریں کے چاند جیسے رخسار پر رخسار رکھ کر سو جانا چاہتا ہوں تو کہنا رخ اور شاہ کا کیا میل ؟

شیریں نے ابتک خسرو کے عشق میں جو مشکلیں اٹھائی تھیں، یہ سوچ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے آپ سے بولی ایا یہ آگ میرے خرمن وجود کو جلا کر رہے گی، اس عشق میں رات کی نیند گئی اور دن کا چین گیا مگر خسرو سے ذرہ بھر آسائش نہیں ملی، میرے آنسوؤں نے سمندر کو اور میری آہوں نے جہنم کو مات کر دیا ہے۔

شاپور نے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور کہا تیری رائے ہماری رائے سے زیادہ صائب ہے اور پھر وہ خسرو کو شیریں کا پیغام دینے چل دیا۔

شیریں کا دل اس جنگلی محل میں نہیں لگتا تھا،اس کے سامنے کھانے کی بے شمار چیزیں لائی جاتیں مگر وہ صرف گھوڑی کا دودھ پیتی تھی، دقت یہ تھی کہ شیریں کا محل جس جنگل میں تھا وہاں کے گھاس پودے کڑوے تھے اس لئے گوالے دوسرے جنگل میں لے جاکر گائے وغیرہ چراتے تھے اور کنیزوں کو وہاں سے دودھ لانے میں بہت پریشانی ہوتی تھی،شیریں نے شاپور سے یہ مشکل بیان کی،شاپور نے کہا میرا ایک دوست ہے فرہاد، وہ ضرور اس کی ترکیب نکالے گا۔ دراصل شاپور اور فرہاد دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے مگر تعلیم کے بعد شاپور نے موقلم کا سہارا لیا اور فرہاد نے تیشہ کا۔

شیریں نے شاپور کو حکم دیا کہ فوراً فرہاد کا پتہ لگاؤ، چنانچہ شاپور اسے تلاش کر کے شیریں کے پاس لے آیا۔ فرہاد چٹان کی طرح مضبوط اور چوڑا چکلا تھا اور دل سے ہر خدمت کے لئے کمربستہ۔

شیریں نے اپنے مخصوص انداز میں فرہاد سے گفتگو شروع کی۔ فرہاد اس کے دلکش انداز تکلم پر مرمٹا۔ کہتے ہیں شیریں کو شیریں اس لئے کہتے تھے کہ اس کی باتوں میں شہد بھرا تھا۔ شیریں کی باتیں سن کر فرہاد صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھا، وہ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔

شیریں نے کہا کوئی ایسی ترکیب کر کہ میرے محل تک آسانی سے دودھ پہونچ جائے یہاں سے جانوروں کا گلہ خاصا دور ہے، دودھ کے لئے کنیزوں کو دور جانا پڑتا ہے، کوئی نہر بنا کہ گوالے وہاں جنگل سے دودھ ڈالیں تو سیدھا میرے محل تک پہونچ جائے۔

فرہاد شیریں کو دیکھ کر عقل و ہوش کھو بیٹھا تھا، اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ شیریں

کیا کہہ رہی ہے، جب دوسروں نے اسے شیریں کی بات بتائی تو اس نے بطور اطاعت آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد فرہاد اپنے کام میں مشغول ہو گیا، اس نے محل سے جنگل تک نہر کا راستہ کھود ڈالا اور موم کی طرح چٹانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

فرہاد نے ایک مہینہ میں نہر کا کام مکمل کر لیا۔ نہر جنگل سے شروع ہو کر محل تک آتی اور وہاں ایک حوض پر ختم ہوتی تھی، گوالے اپنی چراگاہ سے نہر میں دودھ ڈال دیتے تھے اور وہ سیدھا محل کے حوض میں پہونچ جاتا تھا۔

جب شیریں کو معلوم ہوا کہ نہر کا کام فرہاد نے مکمل کر لیا ہے تو وہ اسے دیکھنے کے لئے جنگل میں گئی، اسے فرہاد کی مہارت پر واقعی حیرت ہوئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ کسی آدمی کا کام ہے۔ اس نے سب سے فرہاد کے ہنر کی بیحد تعریف کی، اپنی محفل میں اسے سب سے برتر جگہ پر بٹھایا اور اپنے گوشوارے سے چند قیمتی جواہر نکال کر اسے پیش کئے فرہاد نے وہ جواہرات شیریں کے قدموں میں نچھاور کر دئے اور خود جنگل کی طرف چل دیا کیا کرے وہ دل کے ہاتھوں بے بس تھا۔

فرہاد اب جن پری کی طرح آدمیوں سے بھاگتا اور کوہ و صحرا میں بھٹکتا رہتا تھا عشق نے اس کے دل کا چین اور تن کا سکون چھین لیا تھا۔ اس کی آنکھیں اشکبار اور دل و جگر فریاد کناں تھے، اسے خود نہیں معلوم تھا کہ اس کے درد کی دوا کیا ہے۔ فرہاد دوستوں سے دور جنگل جنگل تنہا گھوما کرتا، ہرن اور چیتل اس کے ساتھی تھے۔ رات کو وہ چپکے سے شیریں کے محل کے پاس آتا، حوض سے دودھ کا ایک گھونٹ پیتا اور پھر جنگل کو واپس چل دیتا۔ ہفتہ میں ایک دن شیریں اسے اپنے یہاں بلاتی تھی، فرہاد وہاں بیٹھا بس اس کو دیکھتا رہتا اور پھر واپس صحرا چلا جاتا اور دلبر کے فراق میں گھڑیاں گنتا رہتا۔

بہت جلد فرہاد کے عشق کی بات ہر جگہ پھیل گئی، شدہ شدہ خسرو پرویز کے کانوں تک بھی یہ بات پہونچی۔ اسے فرہاد کی اس گستاخی پر بیحد غصہ آیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس دیوانہ کا کیا کرے۔ فرہاد کو نہ تیر و شمشیر کا خوف تھا اور نہ کسی جوان و پیر کا۔ البتہ اس کی رقابت نے خسرو کی آتش عشق کو یکایک بھڑکا دیا۔ آخر اس نے اپنے رازداروں سے مشورہ کیا کہ اس دیوانے کا کیا کریں۔ اسے کیسے فریب دیں، اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں تو میری بات بگڑتی ہے اور اگر اسے جان سے مار دیں تو ناحق ایک بیگناہ کا خون ہوتا ہے۔

دربار کے تجربہ کار لوگوں نے کہا: اس مشکل کا حل پیسہ ہے، پیسہ دیکھ کر آنکھ والا اندھا ہو جاتا ہے اور لوہا موم۔ چنانچہ خسرو نے فرہاد کو دربار میں بلایا۔ فرہاد حاضر ہوا۔ اس کی نظر نیچی تھی، اس نے خسرو پرویز کے شاہانہ تخت و تاج کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز تھا، خسرو پرویز نے اشارہ کیا تو غلاموں نے زر و جواہر لا کر فرہاد کے قدموں میں ڈھیر کر دیا مگر فرہاد کے دل میں جو گوہر تھا اس کے مقابلے میں یہ زر و جواہر مٹی تھے۔

خسرو پرویز نے دیکھا کہ فرہاد زر و جواہر کی طرف کوئی التفات نہیں کر رہا ہے تو اس نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ خسرو جو کہتا فرہاد ترکی بہ ترکی جواب دیتا۔ آخر خسرو اس کی حاضر جوابی سے زچ ہو کر چپ ہو گیا اور اپنے ندیموں سے بولا: میں نے آج تک کسی کو اتنا حاضر جواب نہیں دیکھا ہے۔

اس کے بعد خسرو پرویز نے فرہاد سے کہا: کیا بہتر ہو اگر تو بیستون پہاڑ کے بیچ سے لوگوں کے آنے جانے کے لئے ایک راستہ بنا دے۔ فرہاد ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خسرو نے

اسے شیریں کی قسم دی، فرہاد نے بسر و چشم یہ زحمت قبول کر لی مگر اس نے یہ شرط رکھی کہ خسرو شیریں کے عشق کو اپنے دل سے نکال دے، خسرو کو اس گستاخی پر غصہ تو بہت آیا مگر اس نے یہ سوچ کر وعدہ کر لیا کہ یہ کام مکمل کرتے کرتے فرہاد خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

فرہاد ایک عجیب حوصلہ کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ اس نے پہاڑ کھودنے کا کام شروع کیا لیکن سب سے پہلے اس نے ایک چٹان کو کاٹ کر شیریں کا مجسمہ بنایا اور دوسرے پتھر پر خسرو اور شبدیز کا نقش ابھارا ان دونوں مجسموں کو بنا کر فرہاد پہاڑ کاٹنے میں لگ گیا۔

فرہاد مجسمۂ محبوب کو سامنے رکھ کر صبح سے شام تک کام کرتا۔ کبھی اس کے پاؤں پر بوسہ دیتا اور کبھی شیریں کو یاد کر کے نالہ و فریاد کرتا، وہ پتھروں سے اپنا درد دل کہتا اور کبھی کبھی گھبرا کر موت کی آرزو کرنے لگتا،

طمع در زندگانی بستہ بودم	امید اندر جوانی بستہ بودم
از آن ہر دو کنون نومید گشتم	بلا را خانۂ جاوید گشتم

فرہاد کہتا میں نے زندگی میں کچھ خواب دیکھے تھے، میں نے جوانی سے کچھ امید لگائی تھی، لیکن اب میں زندگی اور جوانی دونوں سے مایوس ہو چلا ہوں کیونکہ میرے سر پر بلاؤں کا وہ ہجوم ہے کہ امید ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی ہے۔

مرا آن کس کہ این پیکار فرمود	طلبگار ہلاک جان من بود

جس نے مجھے اس کشاکش میں ڈالا ہے وہ درحقیقت میری موت کا خواہاں ہے،

درین سختی مرا شد مردن آسان   کہ جان در غصہ دارم ، غصہ در جان

روح میں درد اس طرح بس گیا ہے کہ اب موت کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے

اپنی بے بسی کو سوچ کر فرہاد کا دل بھر آیا۔ وہ اپنی قسمت کا گلہ کرتے ہوئے بولا: اگر میں کنویں میں قید کر دیا جاؤں تو وہاں آکر احوال پرسی کرنے والا میری آہوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ دنیا کتوں کے رہنے کی جگہ ہے ، پہاڑوں میں شیر اور دریاؤں میں نہنگ رہتے ہیں ، اس روے زمین پر گھاس پھوس کے لئے بھی جگہ ہے مگر مجھ بدبخت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مجھ بدبخت کو نہ کھیتوں میں آرام ہے اور نہ پہاڑوں میں۔

رفتہ رفتہ فرہاد کے عشق اور کوہ کنی کا چرچا چاروں طرف پھیل گیا۔ ایک دن شیریں نے بھی طے کیا کہ وہ بیستوں جاکر فرہاد کے کام کو دیکھے۔ فرہاد کو جب معلوم ہوا کہ آج اس کے پاس شیریں آرہی ہے تو اس کے آہنی بازوؤں میں بے پناہ قوت آگئی۔ وہ لوہے کو موم کی طرح موڑ دیتا اور پتھر کو ڈھیلے کی طرح توڑ دیتا۔ شیریں وہاں پہونچی تو اس نے فرہاد کو دودھ کا ایک پیالہ بھر کر دیا اور بولی: لے میری خاطر اسے پی لے اور دل سے رنج و ملال دھو ڈال۔

شیریں گھر لوٹنے لگی تو اس کا گھوڑا ٹھوکر کھاکر گر پڑا۔ فرہاد نے فوراً آگے بڑھ کر شیریں کو گھوڑے سمیت اپنے ہاتھ پر اٹھالیا اور انھیں صحیح سلامت محل تک پہونچا دیا

ادھر خسرو پرویز کے پاس یہ خبر پہونچی کہ جب سے شیریں فرہاد سے ملنے گئی ہے فرہاد اتنا مگن اور مست ہے کہ ایک ضرب میں چٹان کی چٹان اڑا دیتا ہے۔ اگر وہ اسی رفتار سے کام کرتا رہا تو ایک مہینہ میں راستہ کا کام مکمل کرلے گا۔ خسرو نے دربار کے تجربہ کار بوڑھوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ انھوں نے کہا فرہاد کے پاس ایک قاصد بھیج کر اطلاع

دی جائے کہ شیریں مرگئی۔ یہ خبر سن کر فرہاد سارا کام کاج تیاگ دے گا۔

آخر کار ایک کڑوا کسیلا قاصد فرہاد کے پاس روانہ کیا گیا۔ اس نے جاکر فرہاد کو بتایا کہ جس شیریں کے لئے تو پہاڑ کاٹ رہا ہے وہ اس دنیا سے چل بسی۔ یہ سنتے ہی فرہاد ایک چٹان کی طرح پہاڑ سے نیچے آرہا۔

به زاری گفت کادخ رنج بردم ندیده راحتی در رنج مردم

فرہاد نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا افسوس میں زندگی بھر دکھ جھیلتا رہا اور آج سکھ دیکھے بنا اس دنیا سے جا رہا ہوں۔

صلای عشق شیرین درجهان داد زمین بریاد او بوسید و جان داد

اس نے شیریں کے عشق میں ایک نعرہ مارا، اس کی یاد میں زمین کو بوسہ دیا اور دم توڑ بیٹھا۔

شیریں کو فرہاد کی موت کی خبر ملی تو وہ ساون بھادوں کی طرح روئی۔ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور اس کی قبر پر ایک اونچا سا گنبد بنوایا۔ خسرو کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو اپنے فعل پر نادم ہوا اور یہ سوچنے لگا کہ اگر کسی نے فرہاد کے خون کا انتقام لیا تو کیا ہوگا۔ پھر وہ شیریں کو تعزیت کا خط لکھنے بیٹھا مگر طنز وتعریض سے باز نہ رہ سکا خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا: میں نے سنا ہے کہ ایک بوالہوس عاشق کی خاطر تو نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہے، اور احباب کو اپنے نالہ وفریاد سے پریشان کر دیا ہے لیکن کبھی تجھے یہ بھی خیال ہوا کہ ہمارا دل تیرے لئے تڑپتا ہے اور تو کبھی التفات نہیں کرتی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس فرہاد کو تو نے خود مارا اب اس کا ماتم رچا رہی ہے ٹھیک ہے تو نے اس کا خون کیا ہے تو ہی اس کا ماتم کر، تو نے اسے رسوا کیا ہے اب تو ہی اس

کی عزت بڑھا لیکن اب رونے دھونے سے کیا فائدہ ؟

اگر فرہاد شد شیرین بماناد　　　　چہ باک از زرد گل نسرین بماناد

اگر فرہاد رخصت ہوا تو کیا غم ، خدا شیریں کو سلامت رکھے ، اس زرد پھول کے مرجھانے کا ماتم کیوں کریں نسرین کی شگفتگی تو باقی ہے۔

شیریں کو خسرو کا خط ملا تو خوش ہوئی۔ لفافے کو بوسہ دیا۔ لیکن جب خط کھول کر پڑھا تو وہ بجھ گئی ، اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ عبارت شیریں ہے مگر طنز و تعریض کے زہر میں بجھی ہے الفاظ پھول جیسے ہیں مگر طعنہ و تشنیع کے کانٹے ساتھ ساتھ ہیں۔ بہر حال شیریں نے ضبط کیا اور سوچنے لگی دیکھیں تقدیر اور کیا کیا دکھاتی ہے۔

کچھ دن کے بعد ایک نیا حادثہ پیش آیا۔ خسرو پرویز کی بیوی مریم چل بسی شیریں کو ایک گونہ سکون ہوا۔ خسرو بھی من ہی من میں مطمئن ہوا کہ اب مریم سے اسے نجات ملی۔ مگر اسے کچھ ڈھونگ تو رچانا تھا ، اس نے ملکہ کے سوگ میں سیاہ عبا پہنی اور سوگواری کی تمام رسمیں بجا لایا۔ خسرو کی خاطر سے شیریں نے بھی ایک ماہ تک کوئی تقریب نہیں منائی۔ اس کے بعد شیریں نے خسرو کے خط کا جواب لکھا۔ شیریں بھی طنز و تعریض سے باز نہ رہ سکی :

عروس شاہ اگر در زیر خاک است　　　　عروسان دگر دارد چہ باک است

اگر شاہ کی ملکہ فوت ہو گئی تو کیا غم ، اس کے حرم میں اور کتنی ہی خواتین ہیں۔

از و بہ گرچہ شہ را ہمدمی نیست　　　　شہنشہ زود سیر آید غمی نیست

مانا شاہی حرم میں ملکہ مرحومہ سے بہتر کوئی اور رفیق نہیں ہے ، لیکن جلد ہی بادشاہ سب کچھ بھول جائے گا۔

نظر بر گلستانی دیگر آرد　　　　وز و بہ دلستانی در بر آرد

اور پھر کسی اور پھول کو تاک لے گا اور اس سے خوبصورت دلبر کی آغوش میں جا بیٹھے گا۔

مرنج ای شاہ نازک دل برین رنج　　　　کہ گنج است آن صنم، در خاک بہ گنج

اے شاہ نازک دل، اس حادثہ کا زیادہ ماتم نہ کر، تیری ملکہ ایک خزانہ تھی، اور خزانے کو خاک میں گاڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

گر آہوئی ز صحرا رفت بگذار　　　　کہ در صحرا بود زین جنس بسیار

اگر تیرے صحرا سے ایک آہو رم کر گیا تو غم نہ کر، وہاں اور بہت سے آہو ہیں۔

خسرو نے شیریں کا خط پڑھ کر کہا میری طنزیہ باتوں کا جواب یہی ہونا چاہئے تھا، سچ ہے کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔

مریم کی سوگواری کا زمانہ ختم ہوا تو خسرو کے دل میں شیریں کے عشق نے پھر چٹکیاں لینا شروع کیا۔ اس نے سوچا چکنی چپڑی باتیں کر کے اس سنگدل کو رام کرنا چاہئے ادھر شیریں کو یقین تھا کہ خسرو ایک نہ ایک روز اسے باقاعدہ اپنی دلھن بنائے گا اس لئے اس کا ناز و عشوہ بدستور برقرار رہا۔ خسرو مکمل سپردگی کا خواہاں تھا اور شیریں برابر پہلو تہی کرتی تھی، آخر بادشاہ نے تنگ آکر یہ سوچا کہ کسی اور سے دل لگائیں، ممکن ہے شیریں رقابت کی آگ میں پگھل جائے۔

ایک روز خسرو پرویز کی محفل آراستہ تھی، دربار کے امرا اور ادھر ادھر کے بادشاہ محفل میں موجود تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور پینے والوں کی آنکھوں میں اب بے حجابی سی آچلی تھی، خسرو پرویز نے حاضرین سے پوچھا دنیا کے کس علاقہ میں سب سے

زیادہ حسن ہے؟

ہر شخص نے کسی نہ کسی جگہ کا نام لیا۔ آخر ایک شخص بولا: اصفہان میں شکر نامی ایک حسینہ ہے اس کے خوبصورت جسم کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک رات کے لئے اس سے ہم آغوشی میسر ہو تو ساری زندگی اسے بھولنا مشکل ہے۔

خسرو نے سوچا شکر سے رابطہ بڑھاؤں، ممکن ہے اس سے شیریں کا جذبۂ رقابت بھڑک اٹھے اور وہ مجبور ہو کر میرے پاس آجائے۔ لیکن اسی شش و پنج میں ایک سال گذر گیا۔ آخر ایک روز خسرو اصفہان گیا اور شکر کو بیاہ کر مدائن لایا۔ کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول رہا لیکن اس سے بھی خسرو کا دل بھر گیا اور اس کے سر میں پھر شیریں کا سودا جاگ اٹھا۔

خسرو کو ایسا لگا جیسے اب وہ شیریں سے زیادہ روز جدا نہیں رہ سکتا، وہ لاکھ صبر و ضبط سے کام لیتا مگر دل سے آہ نکل ہی پڑتی۔ آخر اس نے ایک ترکیب سوچی شاپور تنہا اب شیریں کا رفیق اور غمگسار رہ گیا تھا، خسرو نے شاپور کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ شیریں تنہا رہ جائے اور پھر تنہائی سے گھبرا کر وہ خسرو کے پاس آجائے۔ شاپور کے جانے کے بعد شیریں بہت جلد تنگ آگئی، ایک روز اس کا دل بھر آیا اور وہ ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور میں مناجات کرنے لگی:

به آب دیدۂ طفلان محروم   به سوز سینۂ پیران مظلوم

خدایا تجھے یتیم بچوں کے آنسوؤں اور مظلوم بوڑھوں کے سوز دل کا واسطہ

به بالین غریبان بر سر راه   به تسلیم اسیران در بن چاه

تجھے ان پردیسیوں کا واسطہ جو تھک کر راہ میں پڑ رہتے ہیں، تجھے ان

دی جائے کہ شیریں مرگئی۔ یہ خبر سن کر فرہاد سارا کام کاج تیاگ دے گا۔

آخر کار ایک کڑوا کسیلا قاصد فرہاد کے پاس روانہ کیا گیا۔ اس نے جاکر فرہاد کو بتایا کہ جس شیریں کے لئے تو پہاڑ کاٹ رہا ہے وہ اس دنیا سے چل بسی۔ یہ سنتے ہی فرہاد ایک چٹان کی طرح پہاڑ سے نیچے آرہا۔

بہ زاری گفت کادخ رنج بردم　　　ندیدہ راحتی در رنج مردم

فرہاد نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا افسوس میں زندگی بھر دکھ جھیلتا رہا اور آج سکھ دیکھے بنا اس دنیا سے جا رہا ہوں۔

صلای عشق شیرین درجہان داد　　　زمین بر یاد او بوسید و جان داد

اس نے شیریں کے عشق میں ایک نعرہ مارا، اس کی یاد میں زمین کو بوسہ دیا اور دم توڑ بیٹھا۔

شیریں کو فرہاد کی موت کی خبر ملی تو وہ ساون بھادوں کی طرح روئی۔ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور اس کی قبر پر ایک اونچا سا گنبد بنوایا۔ خسرو کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو اپنے فعل پر نادم ہوا اور یہ سوچنے لگا کہ اگر کسی نے فرہاد کے خون کا انتقام لیا تو کیا ہوگا۔ پھر وہ شیریں کو تعزیت کا خط لکھنے بیٹھا مگر طنز و تعریض سے باز نہ رہ سکا خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا: میں نے سنا ہے کہ ایک بوالہوس عاشق کی خاطر تو نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہے، اور احباب کو اپنے نالہ و فریاد سے پریشان کر دیا ہے لیکن کبھی تجھے یہ بھی خیال ہوا کہ ہمارا دل تیرے لئے تڑپتا ہے اور تو کبھی التفات نہیں کرتی۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس فرہاد کو تو نے خود مارا اب اس کا ماتم رچا رہی ہے ٹھیک ہے تو نے اس کا خون کیا ہے تو ہی اس کا ماتم کر، تو نے اسے رسوا کیا ہے اب تو ہی اسا

کی عزت بڑھا لیکن اب رونے دھونے سے کیا فائدہ ؟

اگر فرہاد شد شیرین بماناد چہ باک از زرد گل ، نسرین بماناد

اگر فرہاد رخصت ہوا تو کیا غم ، خدا شیریں کو سلامت رکھے ، اس زرد پھول کے مرجھانے کا ماتم کیوں کریں نسرین کی شگفتگی تو باقی ہے ۔

شیریں کو خسرو کا خط ملا تو خوش ہوئی ۔ لفافے کو بوسہ دیا ۔ لیکن جب خط کھول کر پڑھا تو وہ بجھ گئی ، اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ عبارت شیریں ہے مگر طنز و تعریض کے زہر میں بجھی ہے الفاظ پھول جیسے ہیں مگر طعنہ و تشنیع کے کانٹے ساتھ ساتھ ہیں ۔ بہر حال شیریں نے ضبط کیا اور سوچنے لگی دیکھیں تقدیر اور کیا کیا دکھاتی ہے ۔

کچھ دن کے بعد ایک نیا حادثہ پیش آیا ۔ خسرو پرویز کی بیوی مریم چل بسی ۔ شیریں کو ایک گونہ سکون ہوا ۔ خسرو بھی من ہی من میں مطمئن ہوا کہ اب مریم سے اسے نجات ملی ۔ مگر اسے کچھ ڈھونگ تو رچانا تھا ، اس نے ملکہ کے سوگ میں سیاہ عبا پہنی اور سوگواری کی تمام رسمیں بجا لایا ۔ خسرو کی خاطر سے شیریں نے بھی ایک ماہ تک کوئی تقریب نہیں منائی ۔ اس کے بعد شیریں نے خسرو کے خط کا جواب لکھا ۔ شیریں بھی طنز و تعریض سے باز نہ رہ سکی :

عروس شاہ اگر در زیر خاک است عروسان دگر دارد چہ باک است

اگر شاہ کی ملکہ فوت ہو گئی تو کیا غم ، اس کے حرم میں اور کتنی ہی خواتین ہیں ۔

از و بہ گرچہ شہ را ہمدمی نیست شہنشہ زود سیر آید غمی نیست

مانا شاہی حرم میں ملکہ مرحومہ سے بہتر کوئی اور رفیق نہیں ہے ، لیکن جلد ہی بادشاہ سب کچھ بھول جائے گا ۔

نظر بر گلستانی دیگر آرد　　　　وزو بہ دلستانی در بر آرد

اور پھر کسی اور پھول کو تاک لے گا اور اس سے خوبصورت دلبر کی آغوش میں جا بیٹھے گا۔

مرنج ای شاہ نازک دل برین رنج　　　　کہ گنج است آن صنم، در خاک بہ گنج

اے شاہ نازک دل، اس حادثہ کا زیادہ ماتم نہ کر، تیری ملکہ ایک خزانہ تھی، اور خزانے کو خاک میں گاڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

گر آہوئی ز صحرا رفت بگذار　　　　کہ در صحرا بود زین جنس بسیار

اگر تیرے صحرا سے ایک آہو رم کر گیا تو غم نہ کر، وہاں اور بہت سے آہو ہیں۔

خسرو نے شیریں کا خط پڑھ کر کہا میری طنزیہ باتوں کا جواب یہی ہونا چاہئے تھا، سچ ہے کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔

مریم کی سوگواری کا زمانہ ختم ہوا تو خسرو کے دل میں شیریں کے عشق نے پھر چٹکیاں لینا شروع کیا۔ اس نے سوچا چکنی چپڑی باتیں کر کے اس سنگدل کو رام کرنا چاہئے ادھر شیریں کو یقین تھا کہ خسرو ایک نہ ایک روز اسے باقاعدہ اپنی دلھن بنائے گا اس لئے اس کا نازو عشوہ بدستور برقرار رہا۔ خسرو مکمل سپردگی کا خواہاں تھا اور شیریں برابر پہلو تہی کرتی تھی، آخر بادشاہ نے تنگ آ کر یہ سوچا کہ کسی اور سے دل لگائیں، ممکن ہے شیریں رقابت کی آگ میں پگھل جائے۔

ایک روز خسرو پرویز کی محفل آراستہ تھی، دربار کے امرا اور ادھر ادھر کے بادشاہ محفل میں موجود تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا اور پینے والوں کی آنکھوں میں ایسا بے حجابی سی آ چلی تھی، خسرو پرویز نے حاضرین سے پوچھا دنیا کے کس علاقہ میں سب سے

زیادہ حسن ہے ؟

ہر شخص نے کسی نہ کسی جگہ کا نام لیا۔ آخر ایک شخص بولا: اصفہان میں شکر نامی ایک حسینہ ہے اس کے خوبصورت جسم کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک رات کے لئے اس سے ہم آغوشی میسر ہو تو ساری زندگی اسے بھولنا مشکل ہے۔

خسرو نے سوچا شکر سے رابطہ بڑھاؤں، ممکن ہے اس سے شیریں کا جذبۂ رقابت بھڑک اٹھے اور وہ مجبور ہو کر میرے پاس آجائے۔ لیکن اسی شش و پنج میں ایک سال گذر گیا۔ آخر ایک روز خسرو اصفہان گیا اور شکر کو بیاہ کر مدائن لایا۔ کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول رہا لیکن اس سے بھی خسرو کا دل بھر گیا اور اس کے سر میں پھر شیریں کا سودا جاگ اٹھا۔

خسرو کو ایسا لگا جیسے اب وہ شیریں سے زیادہ روز جدا نہیں رہ سکتا، وہ لاکھ صبر و ضبط سے کام لیتا مگر دل سے آہ نکل ہی پڑتی۔ آخر اس نے ایک ترکیب سوچی شاپور تنہا اب شیریں کا رفیق اور غمگسار رہ گیا تھا، خسرو نے شاپور کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ شیریں تنہا رہ جائے اور پھر تنہائی سے گھبرا کر وہ خسرو کے پاس آجائے۔ شاپور کے جانے کے بعد شیریں بہت جلد تنگ آگئی، ایک روز اس کا دل بھر آیا اور وہ ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور میں مناجات کرنے لگی:

بہ آب دیدۂ طفلان محروم　　　بہ سوز سینۂ پیران منظلوم

خدایا تجھے یتیم بچوں کے آنسوؤں اور مظلوم بوڑھوں کے سوز دل کا واسطہ

بہ بالین غریبان بر سر راہ　　　بہ تسلیم اسیران در بن چاہ

تجھے ان پردیسیوں کا واسطہ جو تھک کر راہ میں پڑ رہتے ہیں، تجھے ان

قیدیوں کا واسطہ جو اندھے کنویں میں تن بہ تقدیر جی رہے ہیں ۔

بہ یارب یارب صاحب گناہان بہ داور داور فریاد خواہان

تجھے ان فریادیوں کا واسطہ جو انصاف پکارتے ہیں ، تجھے ان گناہگاروں کا واسطہ جو تیرے حضور میں توبہ وزاری کرتے ہیں ۔

بہ واپس ماندگان از کار وانہا بہ دور افتادگان از خان و مانہا

تجھے ان بیچاروں کا واسطہ جو گھر بار سے دور ہیں ، تجھے ان مجبوروں کا واسطہ جو قافلہ سے بچھڑ گئے ہیں ۔

بہ ہر دعوت کہ پیشت مستجاب است بہ ہر طاعت کہ نزدیکت صواب است

تجھے ہر اس عبادت کا واسطہ جو تیرے نزدیک مقبول ہے ، تجھے ہر اس دعا کا واسطہ جو تیری بارگاہ میں مستجاب ہے ۔

وزین غرقاب غم بیرون آور کہ رحمی بر دل پر خون آور

خدایا ، میرے دل خونیں پر رحم کر اور مجھے غم کے اس بھنور سے باہر نکال ۔

یہ مناجات شیریں کے دل سے نکلی تھی ، چنانچہ خسرو کو ایک نامعلوم سی بیقراری ہونے لگی ۔ وہ گھبرا کر شکار کے لئے نکل پڑا اور ایک ہفتہ تک شکار کھیلتا رہا آخر شیریں کے محل سے ایک فرسنگ دور اس نے پڑاؤ کیا ، رات سرد تھی ، الاؤ جلایا گیا ، آگ کی گرمی اور شکار کی تھکن ، خسرو پڑ کر سو گیا ۔ صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو پہلے چند پیالہ شراب نوش کی اور پھر شبدیز پر بیٹھ کر شیریں کے محل کی طرف چل دیا ۔

شیریں کو جب معلوم ہوا کہ خسرو اس سے ملنے آ رہا ہے تو اس نے حکم دیا کہ

محل کے سارے دروازے بند کردئیے جائیں لیکن باہر کے راستے پر قالین بچھا دئے جائیں۔ اتنے میں شیریں محل کی چھت پر گئی تو کیا دیکھا خسرو شبدیز پر جھومتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ وہ سوچنے لگی خدایا، کیا کروں؟ خسرو کو یونہی چلتا کردوں تو اب اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی، اور اگر اسے محل میں بلاکر اپنے آپ کو اس کے سپرد کردوں، تو ویس کی طرح ساری دنیا میں بدنام ہوجاؤں گی۔

خسرو محل کے نزدیک آیا تو اس نے دیکھا سارے دروازے بند ہیں لیکن بساط پذیرائی بچھی ہوئی ہے۔ اسے شیریں کی اس سرد مہری پر افسوس ہوا۔ اس نے ایک غلام کو بلاکر کہا: جا اپنی ملکہ سے کہنا کہ ان سے ملنے خسرو بادشاہ نہیں بلکہ ایک ادنیٰ غلام آیا ہے ملکہ اپنے مہمان کے لئے کیا حکم دیتی ہیں، وہ باہر ہی کھڑا رہے یا اسے اندر آنے کی اجازت ہے۔

ادھر شیریں خسرو کے دیدار کے لئے چھت پر آئی۔ عجب ناز و حیا سے اس کا گورا چہرہ کالی زلفوں میں چھپا ہوا تھا، اس نے وہیں سے سینکڑوں موتی خسرو کے اوپر سے نچھاور کئے، خسرو نے تعجب سے پوچھا:

تو کاندر لب نمک پیوستہ داری　　　　بہ مہمان بر چرا در بستہ داری

اے کہ تیرے ہونٹوں میں ملاحت ہی ملاحت ہے تونے اپنے مہمان کے لئے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟

درم بگشای کاخر پادشاہم　　　　بہ پای خویشتن عذر تو خواہم

دروازہ کھول آخر میں بادشاہ ہوں، دیکھ میں یہاں کھڑا تجھ سے عذر خواہی کررہا ہوں۔

بباید بامنت دمساز گشتن ترا نادیدہ نتوان باز گشتن

آ تھوڑی دیر مجھ سے گھل مل کر باتیں کر، تجھ سے ملے بغیر میں یہاں
سے کیسے چلا جاؤں۔

نہ مہمان توام، بر روی مہمان چرا در باید بستن بدینسان

کیا میں تیرا مہمان نہیں ہوں؟ پھر سوچ تو سہی اپنے مہمان کے لئے اس
طرح دروازہ بند کر دیتے ہیں؟

شیریں بڑے ناز و ادا سے اپنے بال جھٹک کر بولی: میں تجھ سے عشق ضرور کرتی ہوں مگر بدنامی مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔ میں ملکہ بن کر تیرے محل میں آنا چاہتی ہوں اس طرح چھپ چھپ کر تجھ سے نہیں ملنا چاہتی۔ میں اس محل میں تنہا ہوں اور تو اس طرح شراب میں دھت یہاں آیا ہے۔ ذرا سوچ ہم لوگوں کی زبان سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ اگر تو واقعی مجھے چاہتا ہے تو چند معمر اور دانا لوگوں کے ساتھ آ اور مجھے بیاہ کر بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں لے جا۔ لیکن افسوس تو یہ چاہتا ہے کہ یونہی باتوں میں لگا کر مزہ اڑا لے اور میرے پھول کی خوشبو سونگھ کر مجھے دور پھینک دے۔

اس کے بعد شیریں نے خسرو کی نئی ملکہ شکر کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ دو معشوقوں سے بیک وقت دل لگانا کہاں کا آئین عشق ہے۔ بس اب تو شیریں شیریں کہنا چھوڑ دے ایسا نہ ہو کہ حد سے بڑھی ہوئی شیرینی سے تیری زبان میں چھالے پڑ جائیں کبھی تو نے یہ بھی سوچا کہ میرے لئے صرف تیری ذات ہے لیکن میرے سوا تیرے پاس دل بہلانے کے ہزار وسیلے ہیں۔

کہ این ساعت از من یاد کردی کہ این روزم از خود شاد کردی

وہ کونسی مبارک گھڑی تھی جب تو نے مجھے یاد کیا، وہ کونسا خوش قسمت دن تھا جب تو نے میرے دل کو خوش کیا۔

کدامین جامہ بریادم دریدی　　　کدامین خواری از بہرم کشیدی

تو نے کب میری خاطر جامہ چاک کیا، تو نے کس گھڑی میرے لئے رسوائی جھیلی۔

تو ساغر می زدی با دوستان شاد　　　قلم شاپور می زد تیشہ فرہاد

تو فقط اپنے دوستوں کے ساتھ جام بہ جام لنڈھاتا رہا، البتہ بیچارہ شاپور قلم گھستا رہا اور غریب فرہاد تیشہ چلاتا رہا۔

خسرو پرویز نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا اور بڑی معافی تلافی چاہی:

وگر دارم گناہ آن دل رحیم است　　　گناہ آدمی رسم قدیم است

مانا میں نے خطا کی مگر تو میری خطا کا نہیں اپنی رحمت کا خیال کر، اور یوں بھی انسان ازل سے گناہ کرتا آیا ہے۔

بہ تن با دیگری خرسند بودم　　　زدل تا جان ترا دربند بودم

میرا جسم ضرور دوسروں کے ساتھ لطف اندوز ہوتا تھا لیکن دل و روح تیرے عشق میں تڑپتے تھے۔

اگر گامی زدم در کامرانی　　　جوان بودم چنین باشد جوانی

اگر میں نے عیش و مسرت کی چند گھڑیاں بتائیں تو کیا قصور کیا، آخر جوان ہوں اور جوانی میں یہ سب ہوتا ہے۔

لیکن شیریں خسرو کی چالوں میں نہیں آئی، اور اس نے قسم کھا کر کہا تو لاکھ بادشاہ سہی لیکن میں باقاعدہ شادی کے بغیر تیری خواہش پوری نہیں کر سکتی۔

خسرو بالکل مایوس ہو گیا تو مجبوراً اپنے لشکر کی طرف لوٹ پڑا۔ اس نے شاپور سے اپنا غم دل بیان کیا، شیریں کی بے مہری کا گلہ کیا اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر شیریں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ کوئی سخت اقدام کرے گا۔ لیکن شاپور نے امید افزا باتیں کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اور اسے یقین دلایا کہ شیریں ضرور ایک نہ ایک دن پگھلے گی۔ البتہ اس نے جو باتیں کیں اس کی وجہ سرد مہری نہیں بلکہ ناز و ادا ہے۔ شیریں جیسی حسینہ ستم کرے تو اس سے ناتہ نہیں توڑتے اس کی ناز برداری کرتے ہیں۔

ادھر شیریں بھی اپنے دل میں پشیمان ہوئی کہ اس نے خسرو کو اس بے رخی سے واپس کر دیا اور اس کے ساتھ ایسی سخت کلامی سے پیش آئی۔ چنانچہ وہ گھوڑے پر بیٹھی اور خسرو کے خیمہ کی طرف چلی۔ شاپور نے دور سے دیکھا شیریں آرہی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے خسرو کو سلایا تھا، باہر آ کر اس نے شیریں سے پوچھا کیا بات ہے؟

شیریں اپنے طرز عمل سے شرمندہ تھی۔ اس نے شاپور سے کہا میری ایک خواہش ہے۔ تو کہے تو ٹھہروں ورنہ اپنی راہ لوں، میں کسی گوشہ میں چھپ کر خسرو کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بغیر شادی کے اپنے آپ کو خسرو کے سپرد کرنے کو تیار ہوں۔

شاپور نے شیریں کو شاہی سراپردہ کے ایک محفوظ گوشہ میں ٹھہرا دیا۔ صبح کو خسرو پرویز کی آنکھ کھلی تو اس نے شاپور سے کہا: میں نے ایک اچھا سا خواب دیکھا ہے شاپور نے کہا خدا نے چاہا تو غم کی تاریکی جلد ہی چھٹ جائے گی اور شیریں آپ کے آغوش کی زینت ہو گی۔ چنانچہ خسرو نے حکم دیا کہ شاہانہ اہتمام کے ساتھ

محفل آراستہ کی جائے۔ دربار کے خاص مغنی نکیسا اور باربد حاضر ہوئے۔ غلام خلوت کر کے باہر چلے گئے۔ محفل میں صرف خسرو، شاپور اور دونوں موسیقار تھے بربط اور چنگ کے تار چھیڑے گئے اور پوری فضا موسیقی سے جھوم اٹھی۔

شاپور نے نکیسا کو اس سراپردہ کے پاس بٹھایا جہاں شیریں چھپی بیٹھی تھی، اور اس نے اشارہ سے کہا کہ وہی دھن چھیڑ جو شیریں کے سوز دل کی ترجمان ہو، چنانچہ نکیسا نے وہی دھن چھیڑی جو شیریں کے جذبات کی حامل تھی، لیکن دوسرا مغنی باربد خسرو کے احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ دونوں موسیقاروں نے وہ سماں باندھا کہ شیریں تڑپ اٹھی اور بے اختیار اس کے منہہ سے ہائے نکل پڑی۔ خسرو نے فریاد کا جواب فریاد سے دیا۔ سننے والے یہ سمجھے کہ دونوں کراہ ایک ہی آواز کی صدائے بازگشت ہے۔

خسرو نے یہ آواز سن کر موسیقاروں کو فوراً باہر بھیجا اور رازدارانہ انداز میں شاپور سے پوچھا یہ فریاد کس کی ہے؟ ابھی شاپور کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ شیریں پردہ سے باہر نکل آئی اور بے اختیار خسرو کے قدموں پر بوسہ دینے لگی۔ شیریں نے جی بھر کر محبوب کے پاؤں کا بوسہ لیا۔ اب خسرو نے کہا، پاؤں کے بعد ہونٹوں کا بوسہ بھی عنایت کرو۔

شیریں کے ماتھے پر شکن آ گئی۔ شاپور نے بڑھ کر خسرو سے کہا کہ شیریں پاکدامنی اور عفت کی بنا پر انکار کر رہی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ اگر بادشاہ کو اپنے اوپر قابو نہ رہا تو مجھے بدنامی اور رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

خسرو کو اب یقین کامل ہو گیا کہ شیریں بغیر شادی کے راضی نہیں ہو گی۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ وہ بہت جلد بزرگوں کے ساتھ آئے گا اور اسے بیاہ کر لے جائے گا شیریں یہ بات سن کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس نے بے اختیار خسرو کے ہونٹوں پر

اپنے ہونٹ ثبت کر دئے ۔ دونوں نے عجیب عالم کیف میں ایک ہفتہ گذارا لیکن ساتویں رات کو عاشق و معشوق بے قابو سے ہو گئے، خسرو نے یہ حال دیکھا تو حکم دیا کہ شیریں اپنے محل کو لوٹ جائے اور خود بھی لاؤ لشکر کے ساتھ شہر واپس ہو گیا۔

محل میں پہونچ کر خسرو پرویز نے نجومیوں کو بلایا اور انھیں حکم دیا کہ شیریں کو بیاہ کر لانے کی ایک مبارک ساعت متعین کریں۔ جب اس گھڑی کا تعین ہو گیا تو بادشاہ نے شیریں کو لانے کے لئے ایک ہزار اونٹ، گھوڑے اور خچر روانہ کئے۔ ان کے ساتھ ایک ہزار کنیزیں تھیں۔ شیریں کی سواری کے لئے ایک سنہرا تخت تھا اور بے شمار زر و جواہر اور اطلس و دیبا تھے۔

ہمہ رہ موکب خوبان چون شہد عماری در عماری، مہد در مہد

سارے راستے میں پالکی ہی پالکی اور عماری ہی عماری تھی، جن میں شیریں ادا کنیزیں بیٹھی تھیں۔

پری چہرہ بتان شوخ و دلبند زخال و لب سرشتہ مشک با قند

ہر پری چہرہ شوخ و شنگ تھی، ہر حسینہ دلربا و دلفریب تھی، ان کے ہونٹوں کے پاس تل ایسا لگتا تھا جیسے قند میں مشک گھول دی ہو۔

یکایک در نشاط و ناز رفتند بہ استقبال شیرین باز رفتند

یہ لڑکیاں اس نشاط و انداز سے شیریں کو لینے جا رہی تھیں۔

ہمہ رہ گنج ریز و گوہر انداز بیاوردند شیرین را بہ صد ناز

وہ سارے راستے موتی ہیرے لٹاتی ہوئی شیریں کو خسرو کے محل میں لے آئیں۔

شیریں نے محل میں قدم رکھا تو خسرو نے اس کے قدموں میں ڈھیر سا سونا نچھاور کیا۔ اس کے بعد موبدوں کو بلا کر مذہبی آئین کے مطابق شیریں سے عقد کیا۔

خسرو نے شیریں کو ایک مخصوص محل میں اتارا تھا۔ عقد کے بعد وہ احباب کے ساتھ ناؤ ونوش میں مصروف رہا۔ اس کے بعد نشہ میں دھت حجلۂ عروسی میں پہونچا۔ شیریں کو مذاق سوجھا۔ اس نے سوچا خسرو کی مستی کا امتحان کیا جائے، اس کے پاس ایک کھوسٹ بڑھیا دایہ تھی جو اس کی ماں چھوڑ گئی تھی، نہ منہہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت! شیریں نے اسے بنا سجا کر خسرو کے پاس بھیج دیا۔

خسرو لاکھ مست تھا مگر اس بڑھیا کو دیکھ کر اس نے من میں سوچا طاؤس کے بجائے یہ کوا کہاں سے آن ٹپکا۔ لیکن چونکہ اسے اپنے ہوش وحواس پر قابو نہیں تھا وہ اسی بڑھیا پر پل پڑا۔ بڑھیا زور سے چیخی، اتنے میں شیریں پردہ سے باہر نکل آئی وہ سولہ سنگار کئے ہوئی تھی۔ خسرو اسے دیکھ کر بے قابو ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا چاند کو دیکھ کر دیوانے کی دیوانگی اور چمک گئی ہے۔ لیکن مستی میں اسے نیند آ گئی۔

صبح کو خسرو پرویز بیدار ہوا تو اس نے اپنے پہلو میں ایک خوبصورت دلھن کو پایا بس پھر کیا تھا اب خسرو و شیریں تھے اور جی بھر کر داد عیش۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔

شیریں کی رفاقت نے خسرو کو نہ صرف سعادت اور مسرت بخشی بلکہ اسے رعایا کی فلاح وبہبود اور عدل وانصاف کی طرف مائل کر دیا اس نے اس قدر داد ودہش کی کہ رعایا چھک گئی۔ لیکن خسرو کی بیوی مریم ایک کپوت چھوڑ گئی تھی شیرویہ۔ جب خسرو اور شیریں کی شادی ہوئی تو شیرویہ کی عمر صرف نو سال تھی مگر شیریں کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی اور وہ یہ سوچنے لگا کاش شیریں میری بیوی ہوتی، شیرویہ کی ان باتوں کا

خسرو کو علم ہوا تو وہ پیچ وتاب کھاکر رہ گیا مگر اسے گھر سے نہ نکال سکا، آخر اپنی اولاد تھی۔

اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ ایک رات خسرو شیریں کے ساتھ محل میں سو رہا تھا، شیرویہ چوروں کی طرح محل میں گھسا اور تلوار سے باپ کا کلیجہ چیر دیا۔ ساری خوابگاہ خون سے لت پت ہوگئی، خسرو نے اس عالم کرب میں چاہا کہ شیریں کو جگائے مگر اس نے سوچا شیریں اس دردناک منظر کی تاب نہیں لا سکے گی۔ آخر اس نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا مگر شیریں کو بیدار نہیں کیا۔

ادھر شیریں کے جسم تک گرم گرم خون پہونچا تو وہ گھبرا کر اٹھی اور یہ منظر دیکھ کر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔ اس نے خسرو کے جسم سے چادر ہٹائی تو وہاں خون ہی خون تھا۔ بے اختیار شیریں کے آنسو امنڈ پڑے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پھر اس نے مشک اور گلاب منگوائے اور خسرو کے زخم کو اس سے صاف کیا۔

شیریں نے سیاہ لباس پہنا اور ماتم میں بیٹھ گئی مگر شیرویہ نے اس کو یہ پیغام دیا کہ سوگواری کا ہفتہ ختم ہو جائے تو میں تجھے اپنے چمن کا پھول بنا لوں گا۔ یہ سارا خزانہ تیرے حوالے کر دوں گا اور تجھے خسرو پرویز سے زیادہ شان کے ساتھ رکھوں گا شیریں کو اس بدتمیز کی بات پر غصہ تو بہت آیا مگر اس نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ راضی ہے۔ وہ دراصل شیرویہ کو بھرم میں رکھنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن شاہان ایران کے آئین کے مطابق خسرو پرویز کی نعش کو تابوت میں رکھا گیا۔ بادشاہوں نے اسے کاندھا دیا اور بڑے بڑے سردار اور حاکم جنازہ کے پیچھے پیچھے چلے۔ شیریں بھی کنیزوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے کانوں میں بندے پہن رکھے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا، سر پر پیلی اوڑھنی اور جسم میں سرخ ریشم کا جوڑا تھا

ہر شخص شیریں کو دیکھ کر یہ سمجھتا کہ اسے پرویز کی موت کا ذرا غم نہیں ہے۔ شیرویہ کو بھی یہ دھوکا ہوا کہ شیریں نے اس کی بات مان لی ہے۔

خسرو کا تابوت مقبرہ میں اتارا گیا تو شیریں نے اندر سے مقبرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ اس نے کفن ہٹا کر خسرو کے زخم کو بوسہ دیا اور پھر خنجر نکال کر اپنے سینہ میں پیوست کر لیا۔

بہ خون گرم شست آن خوابگہ را جراحت تازہ کرد اندام شہ را

شیریں نے اپنے گرم خون سے سارے مقبرہ کو دھو ڈالا اور اس نے اپنے سینہ میں خنجر مار کر گویا خسرو کے جسم پر ایک تازہ زخم اور لگا دیا۔

پس آورد آنگھی شہ را در آغوش لبش بر لب نہاد و دوش بر دوش

اس کے بعد اس نے خسرو کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے اور سینہ پر سینہ، اور اس طرح اپنے محبوب کی آغوش میں وہ ابدی نیند سو گئی۔

بہرام گور اور سیاہ گنبد

نظامی گنجوی نے جو پانچ مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے ایک ہفت پیکر یا ہفت گنبد ہے۔ اس مثنوی میں بہرام گور کی رزم و بزم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر اس مثنوی کو بہرام نامہ بھی کہا جاتا ہے۔

بہرام گور نے جب اپنے تمام دشمنوں کو زیر کر لیا اور ملک میں کوئی باغی نہ رہا تو اس نے حکم دیا ایک سربفلک قلعہ میں سات گنبد بنائے جائیں۔ یہ سات گنبد گویا سبعۂ سیارہ کا نمونہ تھے۔ ہر گنبد ایک سیارہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ اور سیارہ کا جو رنگ تھا گنبد بھی اسی رنگ کا بنایا گیا تھا۔ مثلاً زحل سے متعلق گنبد مشک کی طرح سیاہ تھا، مشتری کا گنبد صندل کے رنگ کا تھا، مریخ کا گنبد سرخ تھا، سورج کا گنبد زرد تھا، زہرہ کا گنبد سفید تھا، عطارد کا گنبد فیروزی تھا اور چاند کا گنبد سبز تھا۔

گنبدوں کی تعمیر کے بعد بہرام گور نے ساتوں اقلیم کی حسین لڑکیوں کو جمع کیا اور ان کے اپنے اپنے رنگ کے مطابق انھیں ایک ایک گنبد میں جگہ دی۔ بہرام ہفتہ کا ہر دن ایک مخصوص گنبد میں گذارتا تھا اور جس رنگ کا گنبد ہوتا تھا اسی رنگ کا لباس پہنتا تھا۔ اس گنبد کی ملکہ ہزار ناز و کرشمہ کرتی اور عشقیہ داستانوں سے بہرام کی آتش شوق کو تیز کرتی تاکہ اس کے من کی مراد پوری ہو۔



بهرام درگنبد سیاه

گنبدی کو زقسم کیوان بود — درسیاہی چو مشک پنہان بود

جو گنبد زحل سے متعلق تھا اس کا رنگ مشک کی طرح سیاہ تھا۔

بہرام گور کو شراب و شباب کی ہوس ہوئی تو سنیچر کے روز کالا لباس پہن کر سیاہ گنبد میں ہندوستانی خاتون کے پاس پہونچا تاکہ رات بھر اس کے ساتھ عیش و نشاط کرے اور عطر و عود کی خوشبو سے لطف اندوز ہو۔ جب شام کی ریشمی چادر پر رات کی سیاہ مشک بکھری تو بہرام نے کشمیری حسینہ سے فرمائش کی کہ کوئی ایسی کہانی سنا جس کو سن کر منھ میں پانی آجائے اور جسے سنتے سنتے میں سو جاؤں۔

کشمیری حسینہ نے پہلے بہرام گور کی حمد و ثنا کی اس کے بعد کہنے لگی:

میں نے اپنے گھر والوں سے سنا ہے کہ شاہی حرم کی خواتین میں ایک پرہیزگار اور پاکیزہ صفت خاتون تھی، وہ مہینہ میں ایک بار ہمارے گھر آتی تھی، یہ خاتون ہمیشہ کالا لباس پہنتی تھی، دراصل میرے گھر والوں نے کبھی اسے دوسرے رنگ کا لباس پہنے نہیں دیکھا۔ وہ لوگ اس بات پر تعجب کرتے تھے، آخر ایک دن وہ اس خاتون کے پیچھے پڑ گئے کہ بتا تیرے سیاہ لباس کا راز کیا ہے؟ آج تجھے بتانا ہی ہوگا۔

خاتون نے دیکھا آج وہ کوئی بہانہ نہیں کر سکتی تو یوں بولی:

میں دراصل بادشاہ کی کنیز تھی اور اپنے آقا کی موت کے بعد بھی اسی کی یاد میں جی رہی ہوں۔ میرا آقا بہت سخی اور مہمان نواز تھا۔ اس کا مہمان خانہ ہمیشہ سجا بھرا رہتا تھا، جو مسافر بھی سفر سے آتا وہاں اس کی پذیرائی ہوتی، اس کے شایان شان دسترخوان لگایا جاتا۔ بادشاہ خود مسافر سے اس کا حال پوچھتا اور اگر کبھی وہ کوئی دلچسپ کہانی سناتا تو بڑے غور سے سنتا۔

ایک روز بادشاہ اچانک غائب ہوگیا۔ وہ کچھ دن روپوش رہا، جب وہ واپس آیا تو اس کے جسم پر سیاہ لباس تھا، کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ بادشاہ سے اس سیاہ لباس کی وجہ پوچھے۔

ایک روز میں بادشاہ کی خدمت کر رہی تھی، اس روز وہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان تھا، بادشاہ میری آغوش میں لیٹا ہوا تھا، اچانک وہ قسمت کی شکایت کرنے لگا اور بولا دیکھ آسمان نے مجھ جیسے بادشاہ کے ساتھ کیا مذاق کیا ہے اور مجھے کس طرح پلٹا دیا ہے؟

میں بادشاہ کے قدموں میں گر پڑی اور اسے خدا کا واسطہ دیکر پوچھنے لگی کہ آپ کے سیاہ لباس کا راز کیا ہے؟ بادشاہ نے مجھے محرم پایا تو یہ کہانی سنائی:

ایک روز شاہی مہمان خانہ میں ایک مسافر آیا۔ اس کا لباس، پگڑی اور جوتا سبھی سیاہ تھا، میں نے اس سے اس مخصوص رنگ کی وجہ پوچھی تو مسافر بولا: جانے دے، اس راز کو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود سیاہ لباس میں ملبوس ہو۔

میں نے خوشامد درآمد کی لیکن وہ ذرا نہ پسیجا۔ راز راز ہی رہا مگر میں برابر اصرار کرتا رہا آخر کار وہ مسافر ذرا پگھلا اور کہنے لگا کہ ملک چین میں بہشت جیسا ایک شہر ہے، لوگ اسے شہر مدہوشاں کہتے ہیں۔ وہاں کے سبھی لوگ سیاہ لباس پہنتے ہیں۔

مسافر اتنا کہہ کر رک گیا اور بولا: اگر تو میری گردن بھی اڑا دے تو میں اس سے زیادہ نہیں بتاؤں گا۔ اس کے بعد مسافر نے رخت سفر باندھا اور یہاں سے رخصت ہوگیا

مسافر کے جانے کے بعد میری بیقراری بڑھتی گئی، ایسا لگتا تھا میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میں دنیا کی ہر چیز سے یہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا مگر اس کا کچھ اور چھور نہ ملا۔ آخر میں نے اپنے پایہ تخت کو ترک کیا اور اپنے ساتھ جو کچھ زر و جواہر لے جا سکتا تھا لے کر چل دیا۔ پوچھتے پوچھتے اتفاق

سے میں اسی شہر میں پہونچ گیا۔ میں نے دیکھا سجا سجایا اور بھرا پرا شہر ہے لیکن شہر میں جتنے لوگ ہیں سب کا رنگ گورا اور لباس کالا ہے۔

میں اس شہر میں ایک سال رہا۔ ہر شخص سے اس شہر کے بارے میں پوچھتا تھا مگر کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ آخر ایک جواں مرد قصائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے کچھ راہ و رسم بڑھی وہ شریف اور سمجھ دار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کو اتنی ساری دولت دی کہ وہ گھبرا گیا۔ ہم دونوں کی دوستی بڑھتی رہی۔ آخر ایک دن قصائی نے میری دعوت کی۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے گئے۔ کھانا کھا چکے تو قصائی نے مجھ سے پوچھا: تو نے یہ سب زر و جواہر مجھے کس لئے دیا ہے؟ میرے لئے تھوڑی دولت کافی ہے۔ میں بھلا اس احسان کا بدلہ کیسے چکاؤں گا اس کے پیچھے اگر تیرا کوئی مقصد ہے تو بتا ورنہ اپنی دولت واپس لے لے۔

قصائی کی گفتگو سے میری ہمت بڑھی۔ میں نے اسے اپنی بادشاہی اور ترکِ وطن کا قصہ سنایا اور پھر اس سے یہ پوچھا کہ آخر اس شہر کے سبھی لوگ سیاہ پوش کیوں ہیں؟

میرا سوال سن کر قصائی یوں ایک کونے میں سمٹ گیا جیسے بھیڑیئے کو دیکھ کر بھیڑ دبک جاتی ہے۔

شرم سے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کہنے لگا اگرچہ تیرا سوال بالکل نامناسب ہے مگر میں جواب دینے پر مجبور ہوں۔

چاروں طرف رات کی سیاہی پھیل چکی تھی، قصائی نے کہا: آ یہاں سے باہر چلیں تاکہ میں اس راز سے پردہ اٹھاؤں اور جو شکل تو نے کبھی نہیں دیکھی ہے اسے دکھاؤں۔

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے۔ وہ قصائی مجھے شہر سے باہر لے گیا۔ جب ہم بستی سے ذرا دور ہوئے تو ایک ویرانہ میں پہونچے۔ قصائی میرے سامنے ایک ٹوکری لایا، ٹوکری میں

چاروں طرف سے رسی بندھی تھی، وہ مجھ سے بولا: اس ٹوکری میں بیٹھ کر ذرا آسمان وزمین کا نظارہ کرتا کہ تجھے یہ پتہ چل جائے کہ اس شہر کے لوگ کیوں سیاہ لباس پہنتے ہیں۔

میں جیسے ہی ٹوکری میں بیٹھا وہ پرندے کی طرح اڑی اور آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگی۔ میری گردن میں جو رسی بندھی تھی وہ اتنی کسی ہوئی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری جان اسی رسی میں ہے۔

آخر اڑتے اڑتے میں ایک لوہے کی سلاخ کے پاس پہونچا۔ میری گردن کی رسی خود بخود اس سلاخ میں پھنس گئی اور ٹوکری الگ ہو گئی۔ اب میں زمین و آسمان کے درمیان بیچ فضا میں معلق تھا۔ نیچے اوپر دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ مارے ڈر کے میں نے آنکھیں میچ لیں اور یہ آرزو کرنے لگا کاش میں اپنا محل چھوڑ کر نہ نکلتا۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اس سلاخ پر پہاڑ جیسا ایک پرندہ آکر بیٹھا۔ پرندہ کیا تھا دیو تھا دیو، اس کی چونچ ستون کی طرح بڑی تھی، منہ غار جیسا گہرا تھا، پاؤں تخت کے پائے کی طرح بھاری تھے اور پر و بال درخت کی شاخوں کی طرح لمبے تھے۔

میں نے من میں سوچا اگر اس پرندے کا پاؤں پکڑ لوں تو وہ مجھے ایک لقمہ میں چٹ کر جائے گا اور اگر صبر سے کام لوں تو عقل کام نہیں کرتی۔ نیچے اوپر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔

آخر میں نے خدا کا نام لے کر اس پرندے کا پاؤں پکڑ لیا، اچانک وہ اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اڑا اور آسمان کی بلندیوں میں چلا۔ دوپہر تک وہ پرندہ مجھے لے کر اسی طرح اڑتا رہا، لیکن دوپہر کو جب ہوا گرم ہوئی تو پرندے نے زمین کا رخ کیا۔ ابھی زمین سے وہ ایک نیزہ اوپر ہی تھا کہ میں نے اس کا پاؤں چھوڑ دیا اور زمین پر آ رہا۔

تھکن کا یہ حال تھا کہ میں ایک گھنٹہ تک آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کے بعد

میں نے اردگرد نظر ڈالی تو میں نے دیکھا میں ایک ہرے بھرے باغ میں ہوں۔ ایسا لگتا تھا اس باغ میں ابھی تک کسی انسان کے پیر نہیں پڑے ہیں۔ ہر طرف رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے اور ان کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی، چاروں طرف صاف شفاف چشمے تھے اور ان میں نقرئی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ باغ کے چاروں طرف زمرد کے پہاڑ تھے اور ان میں سرخ یاقوت چمک رہے تھے۔

میں اس ماحول کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ درخت سے توڑ کر چند میوے کھائے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ آخر ایک سرو کے نیچے پڑ کر سو گیا

رات ہوئی تو ہوا ہلکی ہلکی چلنے لگی۔ فضا کا گرد و غبار چھٹنے لگا۔ اتنے میں بارش ہو گئی اور ساری فضا دھل کر نکھر آئی۔ اس کے بعد دور سے ہزاروں حوریں آتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ راستے پر آکر کھڑی ہوئیں تو سارا راستہ گلزار معلوم ہونے لگا۔ ہر حور بہار کی طرح تر و تازہ تھی، ان کے ہونٹ لعل کی طرح سرخ اور ان کا جسم گہنے سے لدا ہوا تھا۔

حوریں اپنے ہاتھوں میں شمع اور سر پر فرش اور تخت اٹھائے ہوئے تھیں، ان کی چال میں کیا رعنائی تھی، نہ پوچھو۔ حوروں نے باغ میں آکر فرش بچھایا اور اس پر تخت کو سجایا تھوڑی دیر کے بعد آسمان سے ایک ماہ پیکر اتری اور اس تخت پر جلوہ افروز ہوئی۔ اس کے چاروں طرف حوروں اور پریوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔

حسینہ نے تخت پر بیٹھ کر اپنے چہرہ سے نقاب ہٹائی، پاؤں سے جوتی نکالی اور تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے بعد وہ قریب کی ایک حور سے بولی: ایسا لگتا ہے باغ میں عالم خاکی کا کوئی نامحرم چھپا ہوا ہے، جا اسے ڈھونڈھ کر میرے پاس لے آ۔

وہ حور وہاں سے اٹھی، ادھر ادھر نظر دوڑائی اور مجھے وہاں دیکھ کر چونک پڑی۔ میرا

ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، میں خود ہی مشتاق تھا، فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور حسینہ کی خدمت میں پہونچا۔ وہاں پہونچ کر سجدہ میں گر پڑا۔ حسینہ نے کہا: اے آدمی، اٹھ اور تخت پر آن کر میرے پہلو میں بیٹھ۔

میں نے کہا: اے حور بہشتی، مجھ سے یہ نہ کہہ، بلقیس کے تخت پر جنگل کا بھوت نہیں بلکہ صرف سلیمان بیٹھ سکتے ہیں۔

حسینہ بولی: بہانے مت بنا۔ آگے آ اور تھوڑی دیر میری آغوش میں عشق و زندگی کا مزہ لے۔

اتنے میں ایک کنیز نے میرا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا۔ حسینہ بیحد خوش ہوئی، اس نے حکم دیا دسترخوان بچھایا جائے، تھوڑی دیر میں دسترخوان پر گویا جنت کے تمام کھانے چن دیئے گئے۔ کھانا ختم ہوا تو ساقی و مطرب آئے اور شراب و رباب کی محفل گرم ہوئی۔

میرے سینہ میں عشق کا طوفان امنڈ رہا تھا، رگ و پے میں شراب کی مستی تھی، حسینہ کی نوازشیں میری آتش شوق کو تیز کر رہی تھیں، آخر میں اس کے قدموں میں گر پڑا۔ اور اس کے خوبصورت پاؤں کا بوسہ لینے لگا، حسینہ نے اور التفات کیا اور اب میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر تھے، میں ایک بار بڑھتا، وہ ہزار بار مجھے آغوش میں بھینچتی تھی۔

میں اس ماہرو کی آغوش میں اتنا محو ہوا کہ میرا سارا بدن عشق کی آگ سے تپنے لگا۔ اس حسینہ نے میری یہ حالت دیکھی تو کہا: آج رات بوسہ پر قناعت کر، میرا سارا بدن بوسہ کے لئے حاضر ہے۔ لیکن اگر تیری کچھ اور خواہش ہو تو میری خوبصورت سے خوبصورت کنیز تیری آغوش کی زینت بن سکتی ہے۔ وہ تیری خدمت بھی کرے گی اور تسکین شوق کا سامان بھی فراہم کرے گی۔ اگلی رات اگر پھر تیری خواہش ہوئی تو دوسری کنیزیں موجود ہیں۔

یہ کہہ کر اس حسینہ نے ایک خوبصورت کنیز کو آواز دی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ

میں تھما دیا۔ کنیز میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلی۔ ہم ایک خوابگاہ میں پہونچے جس میں پرنیاں کے پردے پڑے ہوئے تھے اور ہر طرف شمع روشن تھی۔ میں رات بھر اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ دادِ عیش دیتا رہا۔ صبح کو حمام کیا۔ پانی کیا تھا گلاب تھا، غسل کے بعد نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں وہ ساری خوبصورت لڑکیاں غائب ہیں اور وہاں سناٹا ہی سناٹا ہے۔ آخر میں وہیں سبزہ پر پڑ کر سو رہا، اور شام تک سوتا رہا۔

جب رات کی سیاہی پھیلنے لگی تو میری آنکھ کھلی میں نے دیکھا پھر بادل اٹھ رہے ہیں اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ پچھلی رات کی طرح سارا ماحول دھل دھلا کر صاف ہو گیا۔ لڑکیوں کا پرا پھر آیا، انھوں نے باغ میں سونے کا تخت لگایا اور محفل آراستہ کی، تھوڑی دیر میں وہی ملکۂ حسن نمودار ہوئی اور تخت پر جلوہ افروز ہوئی۔ اس نے کنیزوں کو بھیج کر مجھے بلوایا اور تخت پر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ پچھلی رات کی طرح پھر دستر خوان بچھا، کھانے چنے گئے۔ کھانا ختم ہوا تو شراب و موسیقی کا دور چلا۔ تھوڑی ہی دیر میں سبھی کی آنکھوں سے مستی چھلکنے لگی۔ اس حسینہ نے پھر اپنی نوازشیں شروع کیں۔ کنیزوں کو حکم دیا کہ خلوت کریں۔ جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو میں بے تابی سے آگے بڑھا کہ اس جانِ جہاں کو آغوش میں لے کر بھینچ لوں مگر وہ ڈانٹ کر بولی: رات اپنی ہے پھر بے چینی کیا ہے البتہ مزہ چاہتے ہو تو بس پیار بوسہ پر قناعت کرو۔

میں نے لاکھ منت سماجت کی مگر حسینہ نہیں پسیجی، بس مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتی رہی اور یہ کہہ کر تسلی دیتی رہی کہ ایک دن تیری مراد ضرور بر آئے گی۔ سر دست تو ان کنیزوں سے لطف اندوز ہو۔

میں نے دیکھا وہ کسی طرح راضی نہیں ہے تو صرف بوسوں پر قناعت کی۔ مگر جب میں بے قابو ہو چلا تو اس نے اپنی ایک کنیز میرے حوالے کر دی اور اس رات میں نے جی بھر کر اس سے

اپنے تن کی آگ بجھائی۔

صبح کو جب رات کا خمار ٹوٹا تو میں نے دیکھا وہ قافلۂ حسن پھر غائب ہے۔ میں نے اس امید پر سارا دن کاٹا کہ پھر وہی رات ہوگی اور حسینان چین کی محفل، شراب کا دور چلے گا اور اس حسینہ کی زلفوں کا سایہ ہوگا۔

رات آئی تو پھر اسی طرح محفل آراستہ ہوئی اور میں نے پھر ایک نئی کنیز سے زندگی کا لطف لیا۔ ایک عرصہ تک اسی طرح میں عیش و عشرت میں کھویا رہا۔ دن کو باغ میں رہتا اور رات کو گویا جنت میں۔

اول شب نظارہ گاہم نور   و آخر شب ہم آشیانم حور

اول شب میں نور و سرور کی محفل میں ہوتا اور آخر شب کسی حور کی آغوش میں

بودم اقلیم خوشدلی را شاہ   روز با آفتاب و شب با ماہ

میں کشور عیش و مسرت کا بادشاہ تھا، دن کو سورج کا سایہ تھا اور رات کو چاند جیسی حسینوں کی محفل۔

اس حسینہ کے امروز و فردا پر میں نے نہ جانے کتنی راتیں کاٹیں۔ ایک شام حسب دستور ہوا چلی، بارش ہوئی، فضا دھل کر نکھر آئی، کنیزوں نے لاکر تخت سجایا اور وہ حسینہ اپنے گورے چہرے پر سیاہ زلفیں بکھرائے نمودار ہوئی۔ مطربوں نے ساز چھیڑا، کنیزوں نے ساغر چھلکایا، حسینہ اللہ آمین کے ساتھ تختِ زریں پر تشریف فرما ہوئی۔

جب محفل شباب پر آئی اور شراب نے رگ و پے میں مستی دوڑائی تو میری بیقراری کی حد نہ رہی۔ ایسا لگتا تھا دیوانے نے چاند دیکھ لیا ہے۔ میں نے پہلے اس حسینہ کی زلفوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کی، اس کے بعد اس کی کمر تک ہاتھ بڑھایا۔ حسینہ نے میرا ہاتھ

روک لیا اسے پیار سے بوسہ دیا اور مجھے اپنے سے الگ کرتی ہوئی بولی، صبر و ضبط سے کام لو، سربمہر خزانہ پر دست درازی مناسب نہیں۔

میں نے کہا: جان من، میں نے جب سے تجھے دیکھا ہے، عقل کھو بیٹھا ہوں۔ اب کچھ تو مان جا، ایسا لگتا ہے یہ بیقراری جان لے کر چھوڑے گی۔ تو کہتی ہے میں ہوں تو کیا غم، لیکن اس بے وفا دنیا کا کیا بھروسا، مصیبت کسی گھڑی بھی آن دبوچے گی اور میری ساری آرزوئیں دل کی دل میں رہ جائیں گی۔

لیکن میری بے تابی بدستور باقی رہی۔ تب وہ حسینہ بولی:

لیکن این آرزو کہ می گوئی　　دیر یابی و زود می جوئی

میں جانتی ہوں تیری صرف ایک خواہش ہے لیکن اس کے حصول میں بہت زمانہ لگے گا۔

وگر از بید بوی عود آید　　از من این کار در وجود آید

جس طرح بید کی لکڑی سے عود کی خوشبو نہیں آسکتی اسی طرح مجھ سے اس خواہش کی تکمیل ناممکن ہے۔

یہ کہہ کر حسینہ نے پھر ایک نئی کنیز میرے حوالے کی تاکہ میں اس سے اپنی خواہش پوری کروں اور حسینہ سے دست بردار ہو جاؤں۔ لیکن اس بار میں اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں نہیں آنے والا تھا، ضبط کی حدیں ٹوٹ چکی تھیں، ایسا لگتا میرے سارے جسم میں آگ سی لگی ہے۔ میں نے کہا: خزانے تک پہونچ کر کیسے ہاتھ کھینچ لوں، یا میری خواہش پوری کر ورنہ مجھے کیلوں میں چنوا دے یا میرا خون کر ڈال کیونکہ رگ رگ میں ایک طوفان برپا ہے۔

حسینہ نے دیکھا کہ میں کسی قیمت پر دست بردار ہونے والا نہیں ہوں تو اس نے

خوشامد درآمد شروع کی۔ قسمیں کھائیں کہ آج رات اور انتظار کر لے۔ کل تیری مراد پوری ہو گی۔ لیکن میں نے ایک نہیں سنی اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر وہ بولی: ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کر، اس کے بعد مجھ سے ہم آغوش ہونا۔

میں نے آنکھیں بند کیں۔ ایک لمحہ کے بعد حسینہ کی آواز آئی: آنکھیں کھول۔ میں نے یہ سوچ کر آنکھ کھولی کہ اب میں ہوں گا اور اس حسینہ کی آغوش۔ لیکن جب آنکھ کھلی تو میں اسی ٹوکری میں تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا، تھوڑی دیر کے بعد وہی قصائی مجھے ڈھونڈھتا ہوا آیا اور ٹوکری سے رسی کھولتے ہوئے بولا: اگر سو سال تک میں تجھے یہ راز بتاتا رہتا تو تجھے یقین نہیں آتا۔ اب تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ میری سیاہ پوشی کا راز کیا ہے۔

میں نے کہا میرے لئے بھی سیاہ لباس لا دے۔ چنانچہ میں نے بھی سیاہ لباس پہنا اور اپنے محل کو لوٹ گیا۔

وہ عورت بولی جب میرے آقا نے یہ بات بتائی تو میں نے بھی اسی روز سے سیاہ لباس پہننا شروع کر دیا کیونکہ میں ان کی زرخرید کنیز تھی۔

ہندوستانی ملکہ نے بہرام گور کو یہ کہانی سنائی تو وہ جھوم اٹھا، اس نے ملکہ کو آغوش میں بھینچ لیا اور اس کی باہوں میں باہیں ڈال کر سو رہا۔

بهرام و بانوی چین

(داستان خیر و شر)



بہرام گوراور چینی خاتون
یا
داستان خیر و شر

مندرجہ ذیل داستان بھی نظامی گنجوی کی مثنوی ہفت پیکر سے ماخوذ ہے۔

آمد از گنبد کبود برون شد بہ گنبد سرای صندل گون

بہرام گور نیلے گنبد سے نکلا اور صندلی رنگ کے گنبد میں داخل ہوا۔

پنجشنبہ کو بہرام گور نے صندلی رنگ کا لباس زیب تن کیا اور مشتری سے متعلق صندلی گنبد میں چینی خاتون کے پاس پہونچا۔ دن بھر چینی خاتون اسے شراب پلاتی رہی اور اس کا دل بہلاتی رہی۔ رات ہوئی تو بہرام گور نے اس چھوٹی چھوٹی آنکھ والی چینی خاتون سے کہا کہ کوئی ایسی کہانی سنا جس سے میری طبیعت شگفتہ ہو۔ چینی خاتون نے بہرام گور کے ہاتھ اور سر کو بوسہ دیا، اور یہ کہانی کہنی شروع کی:

کسی شہر میں دو جوان رہتے تھے، ایک کا نام خیر تھا اور دوسرے کا شر۔ ایک بار خیر اور شر دونوں سفر پر چلے۔ دونوں نے اپنا اپنا زاد راہ لے لیا۔ خیر اپنے توشہ میں سے کھاتا جاتا تھا مگر شر

بچا بچا کر رکھتا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایسے صحرا میں پہونچے جہاں کی ہوا تنور کی طرح گرم تھی۔ شر کو ایسے پہلے سے معلوم تھا کہ اس صحرا میں پانی نہیں ہے چنانچہ اس نے چپکے سے ایک مشک پانی بھر لیا تھا اور اس میں سے گھونٹ دو گھونٹ پی لئے تھے۔

خیر کو یہ معلوم نہیں تھا کہ راستے میں پانی نہیں ملے گا۔ اس کے پاس جو کچھ پانی تھا سب کا سب پی گیا۔ ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑا۔ آخر خیر کو زوروں کی پیاس لگی۔ اس کا حلق سوکھنے لگا۔ اس کو معلوم تھا کہ شر کے پاس پانی ہے مگر وہ شرم اور غیرت کے مارے مانگنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن جب پیاس سے اس کی جان نکلنے لگی، جگر تپنے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تو خیر نے سوچا کہ اس کے پاس لعل کے جو دو دانے ہیں انھیں دے کر ایک گھونٹ پانی لے لے۔ اس نے شر سے کہا: میں پیاس سے مر رہا ہوں، مجھے تھوڑا سا پانی پلا دے، خواہ سخیوں کی طرح مفت دے خواہ اس کے بدلے یہ دو لعل لے لے۔

لیکن شر پر خدا کی مار، بولا: میں تیرے چکموں میں نہیں آنے کا۔ اس تپتے صحرا میں تو مجھے لعل دے کر پانی لینا چاہتا ہے۔ لیکن شہر پہونچ کر انھیں واپس مانگ لے گا اور اس طرح مجھے بے عزت کرے گا۔ نا، بابا، نا، میں ان باتوں میں نہیں آنے کا۔ تو گوہر دینا چاہتا ہے تو مجھے ایسا گوہر دے جو پھر کبھی واپس نہ لے سکے۔

خیر نے پوچھا: وہ کونسا گوہر ہے؟

شر نے کہا: وہ تیری آنکھوں کا گوہر ہے۔ اگر تو پانی چاہتا ہے تو اپنی آنکھیں دے ورنہ میرے پانی پر نظر نہ لگا۔

خیر بولا: تجھے ذرا بھی خدا کا خوف نہیں ہے کہ ایک گھونٹ پانی کے لئے میری آنکھیں مانگتا ہے۔ میں آنکھیں دیدوں تو اس پانی سے کیا فائدہ؟ ایسی جلی کٹی باتیں کیوں کرتا ہے۔ میرے

پاس جو زر و جواہر ہے اسے لے کر تھوڑا سا پانی دیدے۔ تو کہے تو میں لکھ کر دیدوں۔

شر نے کہا: یہ سب بہلاوے کی باتیں ہیں۔ مجھے آنکھ چاہیئے آنکھ، لعل وگہر سے کام نہیں چلے گا۔

خیر یہ باتیں سن کر دنگ رہ گیا۔ لیکن پیاس کے مارے اس کی طاقت جواب دے چکی تھی، اور اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی جان نہیں بچے گی۔ آخر کار وہ راضی ہو گیا اور شر سے بولا: جا خنجر یا تلوار لا کر میری آنکھیں نکال لے مگر خدا کے لئے میری پیاس بجھا دے۔

شر نے خنجر سے خیر کی آنکھیں نکال لیں لیکن پانی پلائے بغیر اس کا سارا سامان سمیٹ کر چلتا بنا۔ خیر اکیلا بے بس خاک و خون میں لوٹتا رہا۔ آنکھیں نہیں تھیں جو اپنی بے بسی کا منظر دیکھتا۔

اتفاقاً وہاں سے ایک کُرد کا گذر ہوا۔ کرد خاصا مالدار تھا، اس کے پاس بہت سارے مویشی تھے۔ وہ جنگل جنگل پھرتا تھا اور جہاں سبزہ یا پانی ہوتا، ہفتہ دو ہفتہ کے لئے رک جاتا تھا۔

اس کرد کے ایک گڑیا سی خوبصورت لڑکی تھی، ترکوں جیسی آنکھ، چہرے پر کالا تل اور لمبے لمبے بال جنھیں وہ اپنی گردن میں لپیٹ لیتی تھی۔

ایک روز یہ لڑکی پانی لینے گئی، کافی دور جا کر اسے پانی کا ایک چشمہ ملا۔ اس نے اپنی صراحی بھری اور لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ اسے ایک فریاد سنائی دی۔ لڑکی فریاد پر چل دی، وہاں پہونچی تو دیکھا ایک نوجوان خاک وخون میں تڑپ رہا ہے اور درد کے مارے خدا خدا کر رہا ہے۔

لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا: تم کون ہو اور کیوں اس بے بسی کے عالم میں تڑپ رہے ہو؟

خیر بولا: تو کوئی آسمانی فرشتہ معلوم ہوتی ہے۔ میری داستان لمبی ہے، اگر تیرے پاس پانی ہے تو پہلے مجھے ایک گھونٹ پلا دے ورنہ جا اپنی راہ لے۔ میری آخری گھڑی آن پہونچی ہے۔

لڑکی کے پاس گویا نجات کی کنجی تھی، اس نے خیر کو خوب پانی پلایا۔ جب خیر کے بدن میں

ذرا جان آئی تو لڑکی نے اس کی پڑی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور خدا کا نام لے کر اپنی جگہ لگا دیا۔ اس کے بعد لڑکی نے خیر کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے اٹھایا اور سہارا دیتے ہوئے اپنے پڑاؤ تک لائی۔ وہاں خیر کو اپنے ایک نوکر کے حوالے کرکے دوڑی دوڑی ماں کے پاس گئی اور اسے سارا قصہ سنایا۔ ماں بیٹی نے فوراً مل کر جوان کے لیے ایک مناسب جگہ تیار کی، اس کے بعد اسے کھانا کھلایا۔ کھانا کھاتے ہی خیر کی آنکھ لگ گئی۔

رات کو کرد گھر لوٹا تو کیا دیکھا ایک زخمی جوان بے سدھ پڑا سو رہا ہے۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نوجوان کی آنکھیں نکال دی گئیں تھیں، اب دوبارہ لگا کر پٹی باندھ دی گئی ہے۔

کرد بولا: یہیں قریب ہی ایک درخت ہوتا ہے جس کا تنا زمین سے اوپر آتے ہی دو شاخ میں بٹ جاتا ہے۔ ایک شاخ کی پتی سے آنکھوں کی بینائی واپس آجاتی ہے اور دوسری شاخ کی پتی سے بیہوش آدمی ہوش میں آجاتا ہے۔

لڑکی نے باپ سے کہا: خدارا، فوراً جاکر اس درخت کی پتیاں لائیے۔

باپ جاکر چند پتیاں لے آیا۔ لڑکی نے اسے خوب کوٹ چھان کر جوان کی آنکھوں میں لگایا۔ خیر تھوڑی دیر تو درد سے بے چین رہا، اس کے بعد سو گیا۔

اس طرح پانچ روز تک خیر کی آنکھیں بند رہیں، چھٹے دن اس نے آنکھ کھولی تو ایسا لگتا تھا اس کی آنکھوں کو کچھ ہوا ہی نہیں۔ خیر نے یہ دیکھا کہ اس کی آنکھوں کا نور واپس آگیا ہے تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کرد اور اس کے خاندان کو بھی خیر کی صحت یابی پر بیحد خوشی ہوئی۔ ادھر لڑکی ایسا سجیلا جوان دیکھ کر پہلے ہی دل دے بیٹھی تھی۔ خیر بھی اس کی دلچسپ باتیں سن کر اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

خیر اس کرد کے ساتھ روزانہ جنگل جاتا مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا، اور جی جان سے

اپنے مالک کی خدمت کرتا۔ خیر کی خدمت گذاری سے اس کا مالک بہت خوش تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے گھر کا سارا انتظام خیر کے حوالے کر دیا

ایک روز کرد نے خیر سے پوچھا کہ آخر اس پر کیا بیتی ہے ؟ خیر نے اپنی ساری داستان سنائی کہ کس طرح وہ شر کے ساتھ سفر پر چلا، صحرا میں اسے پیاس لگی، شر نے پانی کا لالچ دے کر اس کی آنکھیں نکال لیں اور پانی پلائے بغیر اسے چھوڑ کر چلتا بنا۔ کرد نے خدا کا شکر ادا کیا اور پہلے سے زیادہ خیر کو چاہنے لگا۔

کرد کی لڑکی بھی دل و جان سے خیر کی خدمت میں لگی رہتی اور اس کے آرام و آسایش کا ہر طرح خیال رکھتی، خیر نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بقیہ زندگی اسی لڑکی کے ساتھ گذارے گا کیونکہ اسی کی بدولت اسے نئی زندگی ملی تھی۔ خیر اور جی جان سے مویشیوں اور گھر والوں کی خدمت کرنے لگا مگر کبھی کبھی یہ بات اسے کھٹکتی تھی کہ شاید یہ کرد حسینہ مجھ جیسے ننگے بھوکے سے شادی کرنے پر راضی نہ ہو۔ لیکن کیا ترکیب ہو کہ خیر خوب دولت حاصل کرلے اور پھر اپنی من کی رانی کو بیاہ کر لے جائے۔

چنانچہ خیر نے فیصلہ کیا کہ اب میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔ جس خزانے تک اس کی رسائی نہ ہو اس سے لو لگانے سے کیا فائدہ اور جس دریا کے پانی سے پیاس نہ بجھے اس کے کنارے انتظار کرنے سے کیا حاصل۔ اس نے رات کو کرد سے اپنے دل کی بات کہی : میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تیری بدولت ہے۔ میں نے اتنی مدت تیرا نمک کھایا اور تیری مہمان نوازی کا سکھ دیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے خون سے تیرے کھانوں کی مہک آتی ہے۔ بس اب اس سے زیادہ زحمت نہیں دینا چاہتا۔ تو نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں کما حقہ اس کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ خدا تجھے اس کا اجر دے۔ مجھے تیری جدائی کا ملال ہے مگر کیا کروں مجھے بھی وطن سے نکلے عرصہ ہو گیا ہے، اس

لئے کل یہاں سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔

خیر کی باتیں سن کر وہ کرد رونے لگا۔ گھر کے دوسرے افراد کو بھی بیحد افسوس ہوا۔ آخر کرد نے کہا: میں نے مانا تو اپنے وطن کو واپس جارہا ہے لیکن اگر وہاں پہونچ کر پھر تجھے کوئی مصیبت پیش آئی تو کیا ہوگا۔ یہاں تجھے ساری نعمتیں اور آسایشیں میسر ہیں۔

جز یکی دختر عزیز مرا نیست و بسیار ہست چیز مرا

میرے پاس ایک خوبصورت بیٹی اور دنیا کی بہت ساری نعمتیں ہیں۔

میری بیٹی مہربان اور خدمت گزار ہے، شریف اور نجیب ہے، اگر تجھے وہ پسند ہو تو میں تجھے دل و جان سے دامادی میں قبول کرتا ہوں اور یہ سارے مویشی تیری نذر کرتا ہوں۔

خیر یہ سن کر سجدہ میں گر پڑا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس رات چین کی نیند سویا۔ اگلے روز وہ بہت خوش و خرم تھا۔ کرد نے نکاح کا انتظام کیا اور نکاح کے بعد اپنی بیٹی خیر کے حوالے کر دی۔

دختر خویش را سپرد بہ خیر زہرہ را داد با عطارد سیر
تشنۂ مردہ آب حیوان یافت نور خورشید بر شگوفہ بتافت

خیر کو کرد کی بیٹی یوں ملی گویا عطارد کو زہرہ مل گئی، وہ شخص جو کل تک پیاس سے دم توڑ رہا تھا، آب حیات پاکر جی اٹھا اور وہ کلی جس نے اب تک سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی، دھوپ میں نہا اٹھی۔

اس کے بعد خیر اور اس کی بیوی خوشی خوشی زندگی گذارنے لگے۔ ان کی زندگی کامیاب اور خوشحال تھی، خیر اکثر اپنی بیتی زندگی یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا، اب کرد کا سارا اثاثہ اس کے پاس تھا، میاں بیوی چین کی بنسی بجاتے تھے۔

کچھ دن کے بعد خیر اور اس کی بیوی نے طے کیا کہ وہاں سے کہیں اور چلیں۔ چلنے سے

پہلے خیر صندل کے اس درخت کے پاس گیا جس کی پتی سے اس کی آنکھ اچھی ہوئی تھی، اس نے دو تھیلیوں میں اس کی پتیاں بھر لیں۔ ایک شاخ کی پتی سے جن آسیب دور ہوتا تھا اور دوسری شاخ کی پتی میں آنکھ کا علاج تھا، لیکن خیر نے یہ بات کسی کو بتائی نہیں کہ اس نے ان تھیلوں میں درخت کی پتیاں بھر لی ہیں۔

چلتے چلتے یہ لوگ ایک شہر میں پہونچے۔ وہاں کے حاکم کی بیٹی پر کسی چیز کا سایہ تھا، بہتیرے طبیب آئے مگر کوئی بھی اس پریزاد سے بھوت کو نہیں چھڑا سکا۔ حاکم نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو اس کی بیٹی کا علاج کرے گا بادشاہ اسے اپنا داماد بنالے گا۔ لیکن اگر کوئی لڑکی کو دیکھنے کے بعد اس کا علاج نہیں کر پایا تو وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

شاہی داماد ہونے کی لالچ میں کتنے ہی طبیب اب تک سر کٹوا چکے تھے اور ہزاروں مقامی اور بیرونی حضرات جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ خیر نے یہ سنا تو ایک شخص کو بھیج کر بادشاہ کو اطلاع دی کہ شہزادی کا علاج میرے ہاتھ میں ہے لیکن میں کوئی انعام نہیں چاہتا۔

بادشاہ نے بڑے اشتیاق سے خیر کو بلوایا اور اس سے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ خیر نے کہا: خیر۔ بادشاہ نے کہا خدا کرے عاقبت بخیر ہو۔

بادشاہ نے ایک محرم کے ساتھ خیر کو شہزادی کے محل میں بھیجا۔ خیر نے دیکھا وہ سرو ناز بید کی طرح لرز رہی ہے۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو نیند۔ اس نے درخت کی چند پتی لے کر پیسی اور شربت سا بنا کر شہزادی کو پلا دیا۔ شربت پیتے ہی اس لڑکی کی بے چینی اور بیقراری جاتی رہی۔ تھوڑی دیر میں اسے نیند آگئی، خیر نے دیکھا کہ شہزادی آرام سے سو رہی ہے تو وہ گھر لوٹ آیا۔

شہزادی تین دن تک سوتی رہی۔ چوتھے دن جاگی تو پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو وہ ننگے پاؤں بیٹی کے محل میں دوڑا۔ دیکھا شہزادی صحیح سالم مسہری پر آرام سے بیٹھی ہے۔

بادشاہ نے پوچھا کیا حال ہے ؟ شہزادی نے شرما کر سر جھکا لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ بادشاہ خوش خوش اپنے محل کو لوٹ گیا۔

اب بیٹی نے باپ کو یہ پیغام بھجوایا کہ بادشاہ لوگ جو قول دیتے ہیں اسے وفا کرتے ہیں۔ آپ نے میرا علاج نہ کرنے پر سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اب وقت آگیا ہے کہ اپنا دوسرا وعدہ وفا کریں یعنی جس شخص نے میرا علاج کیا ہے اس سے میری شادی کر دیں اور اس کے سر پر بادشاہی کا تاج رکھیں کیونکہ میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔

بادشاہ نے بیٹی کی رائے سے اتفاق کیا اور حکم دیا کہ خیر کو فوراً حاضر کیا جائے۔ خیر بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا: تو خوش قسمتی سے کیوں منہ موڑ رہا ہے؟ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ خیر کو شاہی خلعت، سنہرا پٹکا اور مرصع حمائل عطا کیا جائے اور اس خوشی میں سارے شہر کو دلھن کی طرح سجایا جائے۔ اس کے بعد خیر اور شہزادی کی شادی رچائی گئی اور دونوں نے عیش و مسرت کی زندگی گذارنی شروع کی۔

اتفاقاً وزیر کے بھی ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کی آنکھ چیچک سے جاتی رہی تھی۔ وزیر نے خیر سے درخواست کی کہ اس کی بیٹی کی آنکھوں کا بھی علاج کرے اور شہزادی کی طرح اسے بھی اپنے حرم میں داخل کرلے۔ خیر نے اسی درخت کی پتی سے وزیر زادی کی آنکھ کا علاج کیا اور اسے بھی اپنی بیوی بنالیا۔ اب خیر کے حرم میں تین خواتین تھیں۔ کبھی وہ وزیر زادی سے اپنے دل کی مراد پوری کرتا، کبھی شہزادی کے جمال سے محظوظ ہوتا اور کبھی کرد لڑکی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتا۔

رفتہ رفتہ خیر کو اس علاقے کا بادشاہ بنا دیا گیا اور سب لوگ اس کی رعایا بن گئے۔

ایک دن خیر اپنے محل سے باہر نکلا اور شاہی باغ کو چلا۔ اچانک اس نے دیکھا شر ایک یہودی سے سودے بازی کر رہا ہے۔ خیر نے اسے فوراً پہچان لیا اور ملازموں کو حکم دیا کہ جب وہ

سوداگر چکے تو اسے میرے حضور میں پیش کرو۔ جب اسے خیر کے سامنے لایا گیا تو اس نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ شر نے کہا: میرا نام شر ہے۔ خیر نے کہا: اپنا اصلی نام کیوں نہیں بتاتا۔ شر بولا: میرا اور کوئی نام نہیں ہے۔

خیر نے کہا: تو وہی شر ہے جس نے ایک پیاسے کو پانی کا لالچ دے کر اس کی آنکھیں نکال لیں، اس کے لعل و گہر چھین لئے اور اسے پانی پلائے بغیر چل دیا۔ غور سے دیکھ میں وہی بیچارہ پیاسا ہوں، مگر آج میرا اقبال عروج پر ہے اور تیرے سر پر بدبختی کا سایہ منڈلا رہا ہے۔

شر نے غور سے دیکھا تو خیر کو پہچان لیا۔ وہ فوراً زمین پر گر پڑا اور معافی مانگتے ہوئے بولا: میں نے یقیناً بُرا کیا مگر تو میرے اعمال بد کو نہ دیکھ، اپنے کرم پر نظر کر۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ میرا نام شر ہو اور تیرا خیر، چنانچہ میں اپنے نام کی مناسبت سے بدی کرتا ہوں، تو اپنے نام کا پاس کر کے نیکی کر۔

یہ سن کر خیر نے شر کو رہا کر دیا۔ وہ خوش خوش وہاں سے نکلا اور جھومتا جھامتا چلا جا رہا تھا کہ کرد اس کے سر پر آن پہونچا اور تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔

گفت اگر خیر ہست خیر اندیش　　　　تو شری جز شرت نباید پیش

کرد نے کہا: مانا، خیر تیرا بھلا چاہتا ہے، مگر تو تو شر ہے، تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے

کرد نے شر کو مار کر اس کے جسم کی تلاشی لی تو اس کے پاس دو قیمتی پتھر نکلے۔ وہ انھیں خیر کے پاس لے گیا۔ خیر نے انھیں بوسہ دیا اور دونوں گوہر کرد کو واپس دیدئے اور کہنے لگا: میری آنکھوں کے گوہر تیری بدولت قائم ہیں، ان جواہر کو تو رکھ لے، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

خیر نے اپنی حکومت کے زمانے میں عدل و انصاف کو فروغ دیا، ملک کو استحکام بخشا۔ کبھی کبھی وہ صندل کے اس درخت کے پاس جاتا اور اس سرزمین پر سلام و درود بھیجتا۔

اسی درخت کی مناسبت سے اس نے صندلی رنگ کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

صندل سودہ دردِ سر ببرد تپ زدل، تابش از جگر ببرد

صندل کو گھس کر لگانے سے نہ صرف دردِ سر جاتا رہتا ہے، بلکہ دل اور جگر کی سوزش بھی کم ہو جاتی ہے۔

چینی خاتون نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں یہ دلکش کہانی سنائی تو بہرام گور نے والہانہ اسے اپنی آغوش میں چھپا لیا، مبادا اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔



ہمای و ہمایوں

آٹھویں صدی ہجری کے فارسی شعرا میں خواجو کرمانی کا اہم مقام ہے۔ وہ کرمان میں پیدا ہوا، وہیں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد قسمت آزمائی کے لئے ایران کے مختلف شہروں میں گھومتا رہا۔ خواجو عرصہ تک شیراز میں بھی رہا، یہیں اس کی ملاقات خواجہ حافظ سے ہوئی۔ شیراز کے علما اور فضلا سے بھی خواجو کے تعلقات تھے۔

خواجو کی تصانیف میں اس کا دیوان اور چند مثنویاں ہیں۔ دیوان خواجو قصائد اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ہمارے شاعر نے نظامی گنجوی کے تتبع میں چند مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ جن میں مثنوی ہمای و ہمایوں ۴۳۰۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ خواجو سے پہلے ہما اور ہمایوں کی داستان کا پتہ نہیں چلتا اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ شاعر نے خود اپنے دماغ سے یہ داستان اختراع کی ہے یا فارسی کی اور داستانوں کی طرح یہ کہانی بھی سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھی۔

مثنوی ہمای و ہمایوں ۱۳۲۰ ہجری میں بمبئ سے شائع ہوئی تھی۔

گذر کن ز دل تا بہ دلبر رسی ز سر بر گذر تا بہ سر در رسی

دلبر تک پہونچنا ہے تو دل و جگر قربان کر دے ، اس کے در تک پہونچنا ہے تو سر دھڑ کی بازی لگا دے ۔

ملک شام میں کیانی خاندان کا ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس کا نام منوشنگ تھا، بادشاہ کو صرف یہ غم تھا کہ اب تک اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی. وہ دن رات اسی فکر میں گھلتا رہتا تھا. نہ جانے کب اس کے یہاں تخت و تاج کا وارث پیدا ہو گا. خوش قسمتی سے منوشنگ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا. نوزاد کی صورت منوچہر کی طرح اور اس کی آن بان کیقباد جیسی تھی. منوشنگ نے اپنے بیٹے کا نام ہما رکھا اور اس کی تربیت کے لئے ایک دایہ کو مقرر کیا جو اسے سونے کی کٹوری میں دودھ پلاتی اور زر و سیم کے پالنے میں سلاتی تھی۔

دایہ نے بڑی لگن سے بچہ کی تربیت کی. ہما ذرا بڑا ہوا تو اسے معلم کے سپرد کیا گیا. اس نے جلد ہی بہت سے علوم و فنون سیکھ لئے اور ایسی مہارت بہم پہونچائی کہ دربار کے دانشمند بھی اس کی برتری ماننے لگے. ادھر شہزادہ کی شجاعت اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ سبھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کی فیاضیوں کا گن گاتے تھے. پندرہ سال کی عمر میں اس کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ کسی میں اس کے مقابل آنے کی ہمت نہیں تھی ۔

ایک دن ہما بادشاہ کے حضور میں گیا اور بولا : شاہی محلوں اور باغوں سے میری طبیعت اوب گئی ہے، اجازت ہو تو جنگل میں جاکر شکار سے دل بہلاؤں ۔

بادشاہ نے کہا : بیٹے، تیرے دم سے میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے. میں گھڑی بھر کے لئے بھی تجھے آنکھوں سے دور کرنا نہیں چاہتا، لیکن اگر شکار کے لئے جانا ہی چاہتا ہے تو

جا مگر آج ہی لوٹ آنا۔

باپ کی اجازت پاکر ہما بہت خوش ہوا۔ صبح کو وہ اپنے مرصع سازوالے گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگل کی طرف چل دیا۔ بادشاہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ اردی بہشت (اپریل۔مئی) کا زمانہ تھا اور سارا جنگل بہشت کی طرح لہلہا رہا تھا۔ اچانک دور سے گرد اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ شہزادے نے دیکھا کہ گرد میں ایک گورخر ہے۔ اس نے تاک کر کمند پھینکی مگر گورخر پھندے سے نکل بھاگا۔ شہزادے نے تیر چلایا مگر وہ بھی خطا گیا۔ آخر اس نے گورخر کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا اور اس کا پیچھا کرتے ہوئے ایسے سنسان گھنے جنگل میں پہونچ گیا جہاں کوئی شکار تو دکھتا نہیں تھا، البتہ شاید وہاں جن بھوت رہتے ہوں۔

شہزادہ ہمارات بھر گھوڑا بھگاتا رہا۔ صبح کو وہ ایک مرغزار میں پہونچا۔ چاروں طرف گلاب اور بیلا کھلا ہوا تھا اور پرندے چہک رہے تھے۔ دور مرغزار میں ایک محل نظر آیا۔ ہما گھوڑے سے اترا اور محل کی طرف چل دیا۔ نزدیک پہونچا تو کیا دیکھتا ہے محل کی دیواریں سونے اور عقیق کی ہیں اتنے میں کسی طرف سے ایک حسین لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے ہما کے قریب آکر زمین ادب کو بوسہ دیا اور کہنے لگی:

که شاہا به اینجای چون آمدی　　　شب اینجا بدی یا کنون آمدی

اے شہزادے، آپ یہاں کیسے آئے؟ رات یہیں کہیں گذاری یا ابھی آئے ہیں۔

چو مهمان ما آمدی مرحبا　　　قدح گیر و بند قبا برگشا

خوش آمدید، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آرام سے بیٹھئے اور شراب نوش کیجئے۔

به عزم تفرج درین بارگاه　　　بگرد و برآسای از رنج راه

اس محل میں دل بہلایئے اور راستے کی تھکن دور کیجئے۔

حسینہ نے ہما کو اشارہ کیا کہ میرے پیچھے پیچھے آئیے۔ شہزادے کو کیا معلوم کہ وہ لڑکی انسان نہیں بلکہ پری ہے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ محل کے اندر پہونچا تو دیکھا وہاں ایک تخت بچھا ہے اور اس کے پاس ایک تصویر رکھی ہے۔ جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا ہے۔ تصویر کے اوپر یہ لکھا ہوا ہے: اے شاہ روشن رواں ذرا غور سے دیکھ، یہ تصویر چین کی شہزادی ہمایوں کی ہے۔ اگر تو اس تصویر کو چشم عقل اور دیدۂ باطن سے دیکھے گا تو یہاں تجھے ایک دنیا نظر آئے گی۔

ہما نے تصویر پر نظر ڈالی تو حیرت میں رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے اس کے رگ وپے میں عشق کی مستی دوڑ گئی ہے۔ اتنے میں غیب سے یہ آواز آئی، شہزادہ ہما تو صاحب تصویر کو دل دے بیٹھا ہے، بس اب سفر کی کڑیاں جھیل اور معشوق تک پہونچنے کی سعی کر۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

گذر کن ز دل تا بہ دلبر رسی   ز سر در گذر تا بہ سر در رسی

دلبر تک پہونچنا ہے تو دل وجگر قربان کر دے، اس کے در تک پہونچنا ہے تو سر دھڑ کی بازی لگا دے۔

اگر مرد راہی ز خود در گذر   بہ منزلگہ بیخودی بر گذر

مرد میدان ہے تو اپنی ذات سے بے نیاز ہو جا بلکہ عشق کی بیخودی میں ہر چیز سے گذر جا۔

صواب است راہ ختا رفتنت   ولی خون خود باد بر گردنت

اس وقت تیرے لئے شہر ختا کا سفر عین ثواب ہے، البتہ اس مہم میں اگر تیری جان گئی تو تو خود اس کا ذمہ دار ہے۔

تھوڑی دیر میں ہما کو نیند آگئی، آنکھ کھلی تو دیکھا نہ محل ہے نہ چمن، البتہ اس کا گھوڑا برابر میں کھڑا ہے۔ رات والی تصویر کا خیال آیا تو اس کا دل بھر گیا، لیکن کیا کرتا، مجبوری تھی، آخر ملک شام کو واپس ہوا مگر من ہی من میں یہ سوچتا جاتا تھا، یہ جدائی کیسے برداشت ہوگی، عشق سے کس طرح جان بچے گی، کاش اس تصویر کو دیکھتے ہی اس کے قدموں میں جان نثار کر دیتا۔ اب کہاں تک لوگوں کو اپنی داستان غم سناؤں، عاشق کہیں اپنی بات بھی کرتا ہے؟

سورج کی روشنی پھیلی تو شہزادے کو ملک شام کے سوار نظر آئے۔ انھوں نے دیکھا شہزادہ دکھی سا ہے۔ شہزادے کی تعظیم میں وہ سب زمین پر سجدے میں گر پڑے اور اس کے بعد پوچھا شہزادے کا مزاج کیسا ہے؟

ہما پر رات جو بیتی تھی، اس نے اپنے سواروں کو بتا دیا۔ انھیں بیحد حیرت ہوئی، وہ سب سوچنے لگے دیکھیں اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے اور زمانہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے۔ آخر سواروں نے کہا: شہزادۂ عالم، ایک خیالی تصویر کے پیچھے کیوں دیوانہ ہو رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ رات کا واقعہ جادو ٹونا ہے۔ بھوت پریت آپ کو بہکانا چاہتے ہیں۔ مگر آپ عقل سے کام لیں اور بادشاہ سلامت کا خیال کریں۔ وہ آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے بغیر انھیں دن کی روشنی رات کی طرح تاریک معلوم ہوتی ہے۔ آپ گھر چلیں، بادشاہ آپ کے لئے کیانی خاندان کی کوئی لڑکی پسند کر دیں گے، وہ آپ کی ہمراز و غمگسار ہوگی۔

سواروں کی بات سن کر ہما کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا: مجھ سے دنیا کی حسین لڑکیوں کی بات نہ کرو۔ تمھیں کیا پتہ میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ بس جا کر میری ماں سے یہ کہہ دینا کہ جس لخت جگر کو تو نے خون سے پالا تھا وہ ایک معشوق کو دل دے بیٹھا ہے اور اس سے ملنے شہر ختا کی طرف چل دیا ہے۔ بادشاہ سلامت سے کہنا کہ غیب سے ایک پری نمودار ہوئی اور شہزادے

کا دل اچک لے گئی۔ ممکن ہے آپ کا بیٹا اس کے عشق میں دم توڑ دے، مگر خدا شہنشاہ کا سایہ باقی رکھے۔

ہما نے یہ کہہ کر گھوڑے کی لگام موڑی اور ختنا کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ صرف اس کا ساتھی بہزاد تھا جس نے ہما کے ساتھ دودھ پیا تھا۔ وہی اس کے دکھ درد کا شریک تھا۔ ہما اور بہزاد چینی شہزادی کا پتہ پوچھتے آگے بڑھتے رہے۔

ہما کا عجیب حال تھا۔ وہ سورج کو نکلتے دیکھتا تو بے اختیار آہ بھر کر کہتا: یہ سورج ہے یا میری چاند سی محبوبہ کا عکس، جب رات کی تاریکی بکھرتی تو ہما سوچنے لگتا کہیں میری معشوق نے زلفیں تو نہیں پھیلادی ہیں؟

کئی دن کی راہ طے کرنے کے بعد ہما اور بہزاد ایک دریا کے کنارے پہونچے۔ وہاں سمنا روی نام کا ایک خونخوار حبشی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات میں بیٹھا تھا کہ ادھر سے کوئی قافلہ گذرے تو اسے غارت کرے۔ حبشیوں نے ہما اور بہزاد کو آتے دیکھا تو حملہ کر کے انھیں گرفتار کر لیا اور کشتی میں بٹھا کر اپنی منزل کی طرف چل دیے۔ اتنے میں زوروں کا طوفان آیا، دریا میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں اور اچانک کشتی ڈوب گئی۔ ہما اور بہزاد ایک تختہ پر جا پڑے اور موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہونچ گئے۔

ہما کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا وہ ساحل پر پڑا ہے۔ اردگرد ایک ہرا بھرا مرغزار ہے۔ اس نے سجدہ میں سر جھکایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ہما اور بہزاد اس دن وہیں رہے۔ اگلی صبح وہ اپنی قسمت کا ماتم کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

ابھی وہ ذرا دور گئے تھے کہ گرد اٹھتی ہوئی نظر آئی۔ اتنے میں چند سوار دکھائی پڑے۔ شہزادے نے سوچا یہ لوگ بھی ڈاکو ہیں اور ان کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سواروں نے ہما کے پاس

پہونچ کر زمین ادب کو بوسہ دیا اور عرض کیا: ہم شہنشاہ مشرق کے ملازم ہیں۔ ہمارا بادشاہ اس طرف شکار کھیلنے آیا تھا، بدقسمتی سے گھوڑے سے گر کر مرگیا۔ ہمارے ملک میں رسم یہ ہے کہ جب بادشاہ فوت ہوجاتا ہے تو ہم جنگل میں جاتے ہیں اور جو مسافر پہلے ملتا ہے اسے مشرق کا تاج وتخت پیش کرتے ہیں۔ چونکہ آپ پہلے مسافر ہیں اس لئے آپ کو ہم یہاں کا بادشاہ بناتے ہیں اور ہم سب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

ہما کے دل میں چینی معشوقہ کی یاد مچل رہی تھی، مگر وہ اپنے دل کی بات کس سے کہتا مجبوراً وہ ملک مشرق کی طرف چل دیا۔ راجدھانی کے قریب پہونچا تو فوج کے اعلیٰ افسروں نے اس کا استقبال کیا۔ اس کی تعریف وتوصیف کی۔ اس کے سر پر بادشاہت کا تاج رکھا اور اس کے اوپر سے لعل و گہر نچھاور کئے۔ چنانچہ شہزادہ ہما ملک مشرق کا بادشاہ ہوگیا اور اس نے بہزاد کو اپنا وزیر بنالیا۔

لیکن قصر شاہی کی نعمتیں ہما کے بیتاب دل کو سکون نہ بخش سکیں۔ اسے برابر ہمایوں کی یاد ستاتی رہی۔ کبھی وہ اس کے لئے نوحہ کرتا اور کبھی گریہ وزاری۔ اسے سلطنت کے امور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ہما کے غم کا راز کسی کو معلوم نہیں تھا، غم عشق سے اس کا دل اتنا بوجھل تھا کہ دربار میں وہ نظر اٹھا کر کسی کو دیکھتا بھی نہیں تھا البتہ اگر کوئی شخص چین سے آتا تو ہما اس سے ضرور باتیں کرتا اور شاہ چین کے بارے میں دریافت کرتا۔

ایک رات چاروں اور چاندنی چھٹکی تھی اور فضا مشک وعنبر سے مہک رہی تھی۔ ہما گھبرا کر محل سے باہر نکل آیا۔ ٹہلتے ہوئے وہ باغ میں پہونچا اور وہاں ہمایوں کی یاد میں شراب پینے لگا۔ غم سے اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ بے اختیار وہ نالہ وزاری کرنے لگا۔ اس کے بعد تھکا تھکا سا محل میں آکر سوگیا۔ لیکن پیاسے کو تو خواب میں بھی پانی نظر آتا ہے۔ ہما نے خواب دیکھا کہ ایک ہرا بھرا باغ ہے۔ ہر طرف لالہ وگل کی کیاریاں ہیں۔ اور ایک پری چہرہ سرو ناز کی طرح لہراتی اور

بال کھولے چلی آرہی ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو کنیزیں ہیں جن کی کمر میں سنہری پیٹی چمک رہی ہے۔ کنیزیں آواز لگا رہی ہیں: با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار، شہزادی ہمایوں تشریف لا رہی ہیں۔

ہما نے جیسے ہی ہمایوں کا نام سنا، اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اس نے زمین ادب کو بوسہ دیکر کہا:

که ای مرہم ریش و آرام دل　　　دلم را لب دلکشت کام دل

اے آرام جاں تو میرے زخموں کا مرہم ہے اور تیرے شیریں ہونٹوں میں میرے دل کی مراد پنہاں ہے۔

من از شام در چین زلف تو قید　　　تو در چین و از شام آوردہ صید

میں ملک شام سے تیری زلف گرہ گیر کا اسیر ہو کر آیا ہوں۔ دیکھ تو سہی تو چین میں ہے اور تیرا شکار شام سے یہاں آیا ہے۔

غم کار ما خور کہ غمخوارہ ایم　　　بکن چارۂ ما کہ بیچارہ ایم

میں تیرے غم عشق میں مبتلا ہوں، کچھ تو میرے غم کا مداوا کر، میں تیری خاطر بیچارہ ہوں، بڑھ کر مجھے سہارا دے۔

ہما کی بات سن کر وہ ماہرو بولی: تو آرام سے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے اور عشق کا دعویٰ کر رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم عشق کیا ہے۔ اگر تیرے سینہ میں ایک دردمند عاشق کا دل ہے تو تخت و تاج کو تج دے، عشق کرنا ہے تو سر دھڑ کی بازی لگا دے، ورنہ جا اپنی راہ لے۔

ہما نے یہ سن کر ایک نعرہ مارا۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر محل سے باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہما گھوڑے پر بیٹھا اور اسی درد و کرب کے عالم میں چین کی طرف چل دیا۔

صبح کو وہ ایک سبز و شاداب جگہ پر رکا۔ ہر طرف سبزہ و گل تھا۔ وہیں ایک تالاب بھی تھا

جس کے کنارے ایک قافلہ آن کر اترا تھا۔ میر کارواں ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے شہزادہ کو دیکھا تو استقبال کے لئے اٹھا اور عزت کے ساتھ لاکر اپنے پاس بٹھایا۔ بوڑھے نے شہزادے سے پوچھا: تم کون ہو اور کہاں کا ارادہ ہے؟

ہما بولا: اے پیر جہاں دیدہ، میں مسافر ہوں۔ ملک شام سے آرہا ہوں اور تجارت کی غرض سے چین جارہا ہوں۔ راستے میں ڈاکوؤں نے چھاپہ مار کر میرے تمام آدمیوں کو مار ڈالا اور سارا مال واسباب لوٹ لیا۔ میں تنہا اس تیز رفتار گھوڑے پر بھاگ نکلا اور مرتے کھپتے یہاں پہونچا ہوں۔

یہ کہہ کر ہما نے اس بوڑھے سے کہا: اب تو بھی تو اپنی داستان سنا۔

بوڑھا سوداگر بولا: میرا نام سعد ہے۔ میں فغفور چین کی بیٹی کے لئے مال خرید تا ہوں یہاں زرینہ دژ نام کا ایک قلعہ ہے جس میں ژند جادوگر رہتا ہے۔ اس نے جادو کے زور سے آنے جانے کا راستہ بند کر رکھا ہے۔ چھوڑان باتوں کو، اگر تو راضی ہو تو میں تجھے اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔

ہما نے ادب سے بوڑھے سوداگر کا ہاتھ چوما اور کہا: تو مخدوم ہے، میں تیرا ادنی خادم ہوں، تو حاکم ہے، میں فرمانبردار ہوں۔ میں کسی جادوگر سے نہیں ڈرتا، اگر وہ سامری ہے تو میں موسیٰ ہوں۔

یہ کہہ کر ہما اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوا اور قلعہ کی طرف چلا۔ دروازہ پر پہونچا تو دیکھا وہاں بہت زیادہ آگ جل رہی ہے اور شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ شہزادہ نے اسم اعظم کا ورد کیا اور گھوڑا سمیت آگ میں داخل ہوگیا۔ قلعہ کے اندر پہونچ کر اس نے ژند جادوگر کو جان سے مار دیا۔ جادوگر کے مرتے ہی ایک مہیب آواز بلند ہوئی اور قلعہ کا اندرونی دروازہ کھل گیا۔ ہما نے دیکھا اندر ایک آراستہ محل ہے، محل میں ایک سنہرا تخت بچھا ہے اس پر ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہے مگر اس کی زلفیں تخت سے بندھی ہوئی ہیں۔

ہمانے آگے بڑھ کر لڑکی کا نام پوچھا۔ اس نے کہا میں خاقان چین کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن پریزاد ہوں۔ مجھے ژندجادوگر نے یہاں قید کر رکھا ہے۔ ہمانے اسے قید سے آزاد کیا اور اس سے کہا: میں تیری بہن ہمایوں کا عاشق ہوں۔ پریزاد نے وعدہ کیا کہ وہ اسے ضرور ہمایوں تک پہونچائے گی۔

پریزاد کی رہائی کے بعد قافلہ والے قلعہ میں آگئے۔ قلعہ میں بند خزانے کھولے گئے اور ہزاروں اونٹوں پر زروسیم بار کیا گیا۔ ہما اور پریزاد کے ساتھ یہ قافلہ دربار چین کو روانہ ہوا۔ خاقان چین کو خبر ملی کہ پریزاد جادوگر کی قید سے رہا ہو گئی ہے تو اس نے حکم دیا شہزادی کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ لایا جائے اور اسے باغ والے محل میں اتارا جائے۔

ادھر پریزاد نے اپنی بہن ہمایوں کو اپنی قید اور ہما کے ہاتھوں رہائی کا واقعہ سنایا اور باتوں باتوں میں بتایا کہ ہما تجھے دل دے بیٹھا ہے۔ کہیں سے تیری ایک تصویر اس نے دیکھ لی ہے، جبھی سے بس صرف تیرا دم بھرتا ہے اور تیرے نام پر جیتا ہے۔

پریزاد کی باتیں سن کر ہمایوں کے دل میں بھی ذرا گدگدی ہوئی۔ اسے ایسا لگا وہ پہلے سے ہما سے آشنا ہے۔

اگلے روز میر کارواں سعد شہزادہ ہما کو لے کر دربار چین میں حاضر ہوا۔ اس نے ہما کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرا چھوٹا بھائی ہما ہے اور ملک شام میں رہتا ہے۔ خاقان چین ہما کے ہاتھوں پریزاد کی رہائی سے پہلے ہی بہت خوش تھا۔ اس نے شہزادے کو اپنے پاس بلایا، اس کے سر پر تاج رکھا اور اس کے لئے گنج وجاگیر کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد جشن کا اہتمام ہوا اور دیر تک شراب کا دور چلتا رہا۔

دعوت کے بعد ہما محل سے باہر آیا تو ایک غرفہ میں اسے ایک لڑکی نظر آئی۔ ایسی

خوبصورت کہ ہما اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے برابر میں پریزاد بھی بیٹھی تھی۔ ہما سمجھ گیا کہ یہ ماہرو ہمایوں ہے۔ یہ سوچ کر وہ غش کھا گیا۔ ذرا سنبھلا تو غرفہ خالی تھا، دونوں لڑکیاں اندر چلی گئی تھیں۔ ہما سعد سوداگر کے پاس آیا اور اس کو سارا ماجرا بتایا۔

سعد نے شہزادے کو تسلی دینے کی کوشش کی مگر اس کی بیقراری کا عجیب عالم تھا آنکھوں سے آنسو امڈے آرہے تھے۔

ادھر پریزاد کی باتوں سے ہمایوں کے دل میں بھی عشق کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی، جب اسے یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ ہما محل ہی میں مقیم ہے تو وہ پریزاد کو لے کر محل کی چھت پر گئی۔ پریزاد نے اسے دور سے بتایا کہ وہ ہما ہے۔ ہمایوں پریزاد سے بولی:

پریزاد را گفت کای پُر فریب　　　چہ کردی کہ بردی زجانم شکیب

اری بہن، تو نے یہ کیا چھل کیا کہ میرے دل کا صبر و سکون جاتا رہا۔

بہ یکدم بر آتش نہادی مرا　　　بہ افسوس برباد دادی مرا

ایسا لگتا ہے تو نے مجھے آگ میں جھونک دیا، ہائے تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

بفرما کہ کوی حبیبم کجاست　　　چو بیمار گشتم، طبیبم کجاست

اب یہ بتا محبوب تک کیسے پہونچوں، اس مسیحا سے کیسے ملوں جو میرے درد کا مداوا کر سکے۔

پریزاد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: صبر سے کام لے۔ اگر ہما یہاں سے کہیں اور کبھی چلا جائے تو میں صبح و شام میں اسے تیرے پاس پکڑ لاؤں گی۔

ہمایوں اس رات بالکل نہیں سو سکی۔ ساری رات شمع سے راز و نیاز کرتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ صبح کو اسے معلوم ہوا کہ خاقان شکار کے لئے باہر جا رہا ہے اور چند روز جنگل میں خیمہ زن

رہے گا۔ ہمایوں بھی اپنی کنیزوں کے ساتھ تفریح کے لئے نکل پڑی۔

ہمانے اپنی جان جگر کو اس انداز سے خراماں دیکھا تو پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا وہ بڑھ کر محبوب کے قدموں سے لپٹ جائے مگر پاسبان باادب باملاحظہ کی آواز لگا رہے تھے۔ ہما اپنی جگہ بت کی طرح کھڑا رہا۔ اس نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا ہمایوں یہاں سے ایک منزل دور کسی باغ میں پڑاؤ کرتی ہے۔ وہاں ہفتہ دو ہفتہ شراب و رباب سے لطف اندوز ہوتی ہے، اس کے بعد محل واپس آجاتی ہے۔

خاقان چین شکار کے لئے چلا تو ہما بھی ساتھ ہولیا۔ بظاہر وہ شکار میں مشغول تھا مگر ہمایوں کی یاد اسے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتی تھی اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، وہ زمین پر گر کر مرغ بسمل کی طرح لوٹنے لگا، اور بولا میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے خاقان نے کہا: ہما رات کو یہیں رہ جائے، صبح کو شاہی قافلہ سے آن ملے۔

شہزادہ ہما کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ شاہی قافلہ نظروں سے غائب ہو چکا ہے تو وہ بجلی کی طرح اٹھا اور ہمایوں کے باغ کی طرف چلا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ وہاں پہونچ گیا۔ دیکھا باغ کے دروازے پر ایک مست پاسبان اونگھ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا سا ہے۔ ہمانے لپک کر پاسبان کا گلا اتنے زور سے بھینچا کہ وہ وہیں پر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد وہ حرم سرا تک پہونچا۔ اندر سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔ ہمانے اپنے ہاتھ کی لکڑی پر اس انداز سے ضرب لگانی شروع کی کہ حرم کے اندر کے مغنی بھی سراپا گوش ہو گئے۔

ہما دیر تک محل کے چاروں اور چکر کاٹتا رہا۔ آخر اس نے ایک سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا کہ ہمایوں تخت پر بیٹھی ہے، چاروں طرف کنیزوں کا حلقہ ہے، مطرب ساز چھیڑ رہا ہے اور ہمایوں اس دردناک دھن پر روتی جاتی ہے اور یہ کہہ رہی ہے: میرے دل و جان کا سکون کہاں ہے،

کاش وہ اس گھڑی یہاں آجاتا اور اس شبستان کو شمع کی طرح منور کر دیتا۔

ہمانے یہ سنا تو روزن سے آواز دی تیرا دل باختہ عاشق در پر کھڑا ہے۔ اجازت ہو تو اندر آئے۔ ہمایوں خود باہر گئی اور شہزادے کو لے کر اندر آئی۔

ہما اور ہمایوں رات بھر ایک دوسرے کی آغوش میں میگساری کرتے رہے اور جوانی کا مزہ لوٹتے رہے۔ سحور ہوئی تو شہزادہ وہاں سے باہر نکلا۔ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بوڑھے کسان نے بڑھ کر اس کی لگام پکڑ لی اور کہا: تو یہاں کیسے آیا۔ ہما شیر کی طرح اس پر دھاڑا اور تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور جنگل کی طرف چل دیا۔ اس کے سر میں رات کا خمار تھا اور دل میں عشق کا طوفان برپا تھا۔

لیکن دربار کے کسی آدمی نے بوڑھے پاسبان کے قتل کا منظر دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً جا کر خاقان کو ساری بات بتا دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ہما کو قید میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ شہزادہ ہما محل سے کال کوٹھری میں پہونچ گیا جہاں وہ عشق میں آہیں بھرتا اور درد سے نالہ و فریاد کرتا۔

ایک رات اندھیرے میں قید خانہ کا دروازہ کھلا اور ایک حسینہ ہاتھ میں شمع لئے داخل ہوئی۔ اس نے ہما کی بیڑیاں کھولیں اور اسے قید سے رہا کیا۔ لڑکی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: میرا نام سمن رُخ ہے۔ میں سہیل جہاں سوز کی بیٹی ہوں۔ میرا دل بھی تیرے عشق میں گرفتار ہے مگر ہمایوں کے سامنے تو مجھے کب خاطر میں لائے گا ہاں اگر راضی ہو تو آ ہم دونوں تین دن ایک ساتھ گذاریں۔

چنانچہ ہما اور سمن رخ نے تین دن اور تین راتیں ایک دوسرے کے ساتھ بسر کیں۔ چوتھے دن ہما وہاں سے رخصت ہو کر ہمایوں کے محل میں پہونچا۔ ہمایوں خود اس کے لئے بے قرار تھی مگر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ہما سمن رخ کی بدولت رہا ہوا ہے اور اس کے پاس تین دن رہ کر آیا ہے تو وہ غصہ سے بولی: یہاں سے فوراً نکل جا، تجھے عشق کا دعویٰ زیب نہیں دیتا، ایک دل

میں دو دلبر نہیں سماتے۔

شہزادہ ہما نے لاکھ منت سماجت کی مگر ہمایوں نہیں مانی اور اس سے بولی: بس تو یہاں سے چلا جا، میں صبر کرلوں گی۔

ہما نے اپنی پاکدامنی کی قسم کھائی اور کہا مرنے کے بعد بھی میری روح میری پاکدامنی کی گواہ رہے گی، تو نے اگر مجھے اپنے محل میں راہ نہ دی تو تیرے سر کی قسم میں تیری خاطر جان دے دوں گا۔

لیکن ہمایوں اپنی بات پر بضد رہی۔ اس نے کہا سرو کا پھل کسی نے نہیں کھایا ہے، اسی طرح میرے سرو ناز سے تجھے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تو دل اور جان کی باتیں کرتا ہے، مگر ہمارے شہر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

جب ہمایوں کسی طرح نہیں مانی تو ہما مایوس ہوکر لوٹ گیا اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

اس کے چلے جانے کے بعد شہزادی کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی چنانچہ وہ شمشیر و سپر لے کر گھوڑے پر بیٹھی اور ہما کی تلاش میں نکل پڑی۔ تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ ہما مل گیا۔ شہزادی نے چاہا ہما کے قدموں میں گر کر اپنی خطا کی معافی مانگے مگر اس نے ضبط سے کام لیا اور سوچا عجز و التماس سے بات بگڑ جائے گی۔ اس نے ہما کو للکارا کہ تو کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ تکرار بڑھی تو دونوں ایک دوسرے پر پل پڑے۔

ہمایوں کے ہاتھ میں تلوار تھی اور ہما کے پاس کمند۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے رہے۔ آخر ہما نے حریف کو زمین پر دے مارا اور خنجر نکال کر چاہتا تھا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دے کہ اتنے میں ہمایوں نے اپنا خود اتار دیا اور اپنی صورت دکھا دی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ہما کو ایسا لگا کہ رات کے اندھیرے میں سورج نکل آیا ہے۔ پھر کیا تھا دونوں نے ایک دوسرے کے پاؤں پڑ پڑ کر عذر خواہی کی اور ایک دوسرے کی زلفوں سے کھیلتے رہے۔ کتنی ہی دیر وہ دونوں

اسی طرح کھوئے رہے۔

صبح کی پو پھٹنے لگی تو ہما اور ہمایوں نے دیکھا کہ دور سے سواروں کا قافلہ دھول اڑاتا چلا آرہا ہے۔ دونوں نے بھاگ کر ایک ٹوٹے ہوئے معبد میں پناہ لی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہما نے اوپر آکر دیکھا تو معلوم ہوا اس دستہ کا سردار اس کا ساتھی بہزاد ہے اور وہ درحقیقت ہما کی تلاش میں نکلا ہے۔ ہما نیچے آیا۔ بچھڑے ہوئے ساتھی ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

اب شہزادہ ہما نے خاقان چین کے پاس خط لکھا اور ہمایوں سے شادی کی درخواست کی۔ خط دیکھ کر خاقان کی پیشانی پر بل آگئے لیکن اس نے اپنے غصہ کو چھپایا اور ہما کو دربار میں مدعو کیا۔ بہزاد نے سمجھایا کہ دربار میں جانا مصلحت نہیں ہے مگر ہما نہیں مانا اور ہمایوں کو لے کر دربار چل دیا۔ وہاں پہونچا تو خاقان نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور ہمایوں کو اندر حرم میں بھیج دیا۔

رات ہوئی تو ہما چھپ کر ہمایوں کے محل کے پاس پہونچا۔ کئی چکر کاٹے، ادھر ادھر سے آواز دی مگر ہمایوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ درحقیقت خاقان نے وزیر کے مشورہ سے بیٹی کو تہ خانے میں قید کر دیا تھا۔ صبح کو دربار کی طرف سے یہ منادی ہو گئی کہ شہزادی ہمایوں اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

سبھی لوگوں کو جوان شہزادی کی موت کا افسوس ہوا۔ ہما نے سنا تو اس نے ایک دردناک چیخ ماری اور روتا پیٹتا شاہی دربار میں پہونچا۔ اتفاقاً اسی وقت شہزادی کا تابوت باہر لے جا رہے تھے اس پر سنہرا ریشمی کپڑا پڑا ہوا تھا۔ لوگ بڑھ بڑھ کر تابوت کو کاندھا دے رہے تھے۔ لڑکیاں بال کھولے بین کرتی ہوئی تابوت کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر ہما ہوش و حواس کھو بیٹھا، کبھی وہ افسوس میں ہاتھ اور ہونٹ کاٹتا، کبھی

سر پر مٹی ڈالتا، کبھی تابوت پر سر رکھتا اور کبھی احترام سے سر جھکا دیتا۔

تابوت کو لے جا کر مردہ خانہ میں رکھا گیا اور اندر سے اس کا دروازہ قفل کر دیا گیا۔ ہما اس منظر کی تاب نہیں لا سکا، وہ کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا۔

ہمایوں کی بہن پریزاد کو اصل حقیقت کا علم تھا۔ وہ چپکے سے اس تہ خانہ میں پہونچی جہاں ہمایوں قید تھی اور اسے تسلی دیتی رہی۔ یہ تہ خانہ وزیر کے گھر میں تھا۔ وزیر کا لڑکا فرینوش پریزاد کو دیکھتے ہی اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا اس کاروبار عشق میں ہما ہی میری رہنمائی کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ہما کی تلاش میں بہزاد کے پاس گیا اور اسے ساری بات بتائی۔ بہزاد نے کہا چلو ہما کو چل کر ڈھونڈھیں۔ دونوں شہزادے کی تلاش میں نکلے۔ بہت ڈھونڈھا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ آخر ایک قافلہ میں پہونچے، وہاں دریافت کیا تو شتربان نے کہا: میں نے ایک شخص کو پہاڑ کے دامن میں دیکھا ہے جو بڑے دردناک انداز سے نالہ و فریاد کر رہا تھا۔

بہزاد اور فرینوش وہاں پہونچے تو دیکھا ہما دیوانوں کی طرح وحشت زدہ ہے۔ انھوں نے شہزادے کو تسلی دی اور اسے یہ بتایا کہ ہمایوں کی موت کی خبر غلط ہے۔ خاقان نے یہ سب ڈھونگ رچایا ہے، وہ بیچاری تو اب بھی قید خانہ میں ہے۔

اس کے بعد فرینوش نے اپنی بات چھیڑی اور کہا: میں پریزاد کا دلدادہ ہوں، اگر تیری بدولت پریزاد مجھے مل جائے تو میں تجھے ہمایوں تک پہونچا سکتا ہوں۔

شہزادہ ہما نے فرینوش کی مدد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ وہ تینوں چھپتے چھپاتے قید خانہ پہونچے اور ہمایوں کو قید سے آزاد کر کے عماری میں سوار کیا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔

خاقان کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ شہزادی اپنے عاشق ہما کے ساتھ قید سے بھاگ گئی ہے

تو اس نے لشکر کو حملہ کا حکم دیا۔ جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ادھر شام کے سوار بھی ہما کی قیادت میں آمادہ ہوئے۔ کئی دن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر خاقان چین مارا گیا، اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیا۔ اور ہما کو چین کی بادشاہت پیش کی۔

ہمایوں کو باپ کی موت کا دکھ تھا، اس نے باقاعدہ ماتم کیا۔ جب سوگواری کا زمانہ ختم ہوا تو سارے موبد اور امراے سلطنت جمع ہوئے اور وہاں کے دین آئین کے مطابق ہمایوں اور ہما کی شادی ہوئی۔ دولھا اور دلھن کئی دن تک حجلۂ عروسی سے باہر نہیں آئے اور وہیں عیش و عشرت میں مشغول رہے۔

ہما نے اپنی شادی رچانے کے بعد پریزاد کی شادی فرینوش سے کی۔ اور اسے چین کا تخت سونپ کے خود ملک شام واپس ہوگیا اور وہاں باپ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ خدا نے ہما اور ہمایوں کو ایک چاند سا بچّہ دیا۔ اس کا نام جہانگیر رکھا گیا۔ ہما کی موت کے بعد جہانگیر شام کے تخت پر بیٹھا اور باپ کی طرح وہ بھی رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کرتا رہا۔

یوسف و زلیخا

نویں صدی ہجری میں جن شعرا نے فارسی ادب کے دامن کو مالا مال کیا، ان میں نورالدین عبدالرحمٰن جامی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی ولادت قصبۂ جام میں ہوئی۔ انھیں شیخ احمد جام سے بہت عقیدت تھی، اسی بنا پر انھوں نے جامی تخلص اختیار کیا۔

ایران کے صوفی شعرا کا سلسلہ جامی پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے نظامی گنجوی کے تتبع میں سات مثنویاں کہیں جو ہفت اورنگ کہلاتی ہیں۔ انھیں میں ایک مثنوی یوسف و زلیخا ہے جس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ داستان تفصیل سے سورۂ یوسف میں آئی ہے۔



يوسف وزليخا

من از آن حسن روز افزون کہ یوسف داشت دانستم — کہ عشق از پردۂ عصمت برون آرد زلیخا را

یوسف کے بے پناہ حسن کو دیکھتے ہوئے یہ یقینی تھا کہ ایک دن زلیخا ننگ و نام کو بالائے طاق رکھ کر ان کے عشق میں دیوانہ ہو جائیگی۔

جب خدا نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کی آنکھوں کو روشنی بخشی تو ان کے سامنے ایک ایک کر کے تمام نبی پیش کئے گئے۔ ہر نبی اپنے مقام اور منصب کے اعتبار سے تاج پہنے صف میں کھڑا تھا۔ آدم نے ایک ایک کو دیکھنا شروع کیا لیکن ان کی نظر یوسف پر جا کر رک گئی۔ انھیں ایسا لگا جیسے تاروں میں چاند نکل آیا ہے۔ دوسرے نبیوں کی طرح یوسف کے سر پر بھی تاج تھا مگر ان کے حسن اور جاہ و جلال کی کوئی حد نہیں تھی۔

آدم اس خوبصورت نبی کو دیکھ کر دنگ ہو گئے اور زیر لب کہنے لگے:

کہ یارب این درخت از گلشن کیست — تماشاگاہ چشم روشن کیست

خدایا یہ کس چمن کا نونہال ہے اور کس خوش قسمت باپ کا نور نظر ہے۔

خدا کی طرف سے ندا آئی کہ یہ یعقوب پیغمبر کا بیٹا یوسف ہے۔ ہم اسے مصر کی بادشاہی عطا کریں گے۔

ملک مغرب میں طیموس نامی ایک بادشاہ تھا، بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال والا۔ اس کے زلیخا نامی ایک خوبصورت بیٹی تھی، لڑکی کیا تھی انمول موتی تھی، خدا نے اسے وہ حسن اور دلکشی عطا کی تھی کہ خوبصورت سے خوبصورت لڑکیاں اس کی خدمت اور رفاقت میں فخر محسوس کرتیں۔ زلیخا کے دل میں نہ کبھی غم کی خلش ہوئی تھی اور نہ اس کے سینہ میں درد کی کسک اٹھی تھی وہ رات کو خوشیوں کی آغوش میں سوتی تھی اور صبح کو کلیوں کی مسکراہٹ میں جاگتی تھی۔

ایک رات زلیخا حسب معمول خوش خوش بستر پر لیٹی۔ آنکھ لگی تو خواب میں ایک نوجوان کو دیکھا جس کا چہرہ نورانی تھا اور اس کے نکلتے ہوئے قد کے سامنے سرو و شمشاد ہیچ تھے۔

ایک ہی نظر میں زلیخا اس نوجوان کو اپنا دل دے بیٹھی۔

صبح کو کنیزوں نے آکر زلیخا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اور اس کے تلوؤں کو اپنے گالوں سے

سہلا کر اسے خواب شیریں سے بیدار کیا۔ آنکھ کھلی تو سارا طلسم ٹوٹ چکا تھا، نہ وہ نورانی چہرہ تھا اور نہ وہ سرو جیسا قد۔ زلیخا کا جی چاہا اس غم میں وہ اپنے کپڑے پھاڑ لے، مگر کنیزوں کی موجودگی میں اس نے ضبط سے کام لیا اور اپنے آپ کو سہارا دیا۔

زلیخا نے اس خواب کو راز رکھا۔ اپنی قریبی سہیلیوں کو بھی نہیں بتایا۔ مگر اس کا حال غیر تھا، وہ بظاہر ہنستی بولتی تھی مگر رہ رہ کر دل میں ہوک سی اٹھتی تھی، رات کو بستر پر جاتی تو محبوب کی یاد میں کروٹیں بدلتی رہتی، کبھی کبھی آہ و فریاد کرتی کہ یہ کیا ستم ہے تو نے اپنا اتا پتا تک نہیں بتایا، اب میں کس سے تیرا نام و نشان معلوم کروں۔

اگر شاہی ترا آخر چہ نامست وگر ماہی ترا منزل کدامست

معلوم نہیں تو کس ملک کا بادشاہ یا کس آسمان کا چاند ہے۔

صبح کو زلیخا بستر سے اٹھتی تو کھلائی کھلائی رہتی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا راز فاش ہو مگر عشق اور مشک کہیں چھپائے چھپے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے گالوں کی کیسر میں سرسوں پھول گئی، کنیزوں نے زلیخا کا اڑا اڑا سا رنگ دیکھ کر سمجھ لیا کہ ان کی ملکہ کو کوئی غم لاحق ہو گیا ہے۔ ہر ایک نے قیاسی گھوڑے دوڑائے مگر زلیخا کے من کی کسک کو کوئی بھی نہ سمجھ سکی۔ البتہ زلیخا کی ایک بوڑھی دایہ تھی، کھیلی کھائی، عشق و ہوس کے مدارج سے آگاہ، خرانٹ اور تجربہ کار۔ اس نے بہلا پھسلا کر زلیخا سے اس کا حال دل پوچھا۔

زلیخا نے دیکھا اب سچ بولے بنا چارہ نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ کیسے بتائے کہ اس کا دل کس نے چرایا ہے۔ دایہ بھی یہ معما نہیں حل کر سکی۔ آخر وہ تسلی دیتے ہوئے بولی: یہ سب شیطان کا فریب ہے۔ تو اس خواب پریشاں کو اہمیت نہ دے۔

مگر زلیخا کا دل ان بہلاووں سے کب ماننے والا تھا اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے دل

پر انجانے دلبر کی تصویر پتھر کی طرح نقش ہو گئی ہے اور مٹائے نہیں مٹے گی۔

ایک رات زلیخا نے پھر اسی جوان کو خواب میں دیکھا، چہرہ نور سے دمک رہا تھا، اس نے خود کو اس کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنے عشق کا واسطہ دے کر اس کا نام و نشان پوچھنے لگی تو اسی دنیا کا رہنے والا ہے یا کسی اور عالم سے تعلق رکھتا ہے ؟

نوجوان نے کہا میں آدم کی اولاد ہوں اور اسی آب و گل سے بنا ہوں۔ میں تیرے عشق کو تسلیم کرتا ہوں، میرا دل بھی تیری محبت میں گرفتار ہے لیکن اگر تیرا عشق صادق ہے تو زندگی بھر کسی اور سے شادی نہ کرنا۔

زلیخا کی آنکھ کھلی تو اور پریشان تھی، کبھی روتی تھی، کبھی یونہی ہنس دیتی تھی، وہ بظاہر زندہ تھی مگر اس پر نزع کا سا عالم طاری تھا۔

ایک رات زلیخا اپنے خیالی محبوب سے راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے سو گئی، اس نے خواب میں پھر اسی جوان کو دیکھا۔ اب کی بار وہ اور بھی دلکش نظر آرہا تھا۔ زلیخا اس کے دامن سے لپٹ گئی اور اس کا نام پتہ پوچھنے لگی۔

نوجوان نے کہا: میں عزیز مصر ہوں، اور مصر میں رہتا ہوں۔

زلیخا خواب سے بیدار ہوئی تو وہ نسبتاً مطمئن تھی، اسے ایک گونہ سکون تھا، اب وہ کبھی کبھی عزیز مصر کی بات کرتی مگر اپنا راز چھپانے کے لیے روم و شام کا ذکر بھی چھیڑ دیتی۔

ادھر دور دور تک زلیخا کے حسن کے چرچے تھے، روزانہ دسیوں بادشاہوں کے قاصد اس کے باپ کے پاس آتے، گرانقدر تحائف لاتے اور اپنے آقا کی خواہش کا اظہار کرتے۔ زلیخا ان قاصدوں کے بارے میں پوچھا کرتی، اب تک کوئی قاصد مصر سے نہیں آیا تھا، ایک روز اس کے باپ نے پوچھا: ان سب قاصدوں میں تجھے کس کا پیغام منظور ہے۔ زلیخا نے بڑی

مایوسی سے باپ کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کر چل دی، غم سے اس کا نازک جسم کانپ رہا تھا۔

ادھر طیموس کو زلیخا کے عشق کا پتہ چل گیا۔ اس نے اپنے ایک ہوشیار درباری کو بہت سا تحفہ دے کر عزیز مصر کے پاس بھیجا اور اسے یہ پیغام دیا کہ میری ایک چاند سی بیٹی ہے۔ روم اور شام کے بادشاہ اس کے لئے آہیں بھرتے ہیں مگر وہ خود تیری دلدادہ ہے۔ اور رات دن تیری یاد میں بے قرار رہتی ہے۔

عزیز مصر نے یہ سنا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے قاصد کا شکریہ ادا کیا اور کہا: میں ہزاروں غلام و کنیز اور بہت سا زر و جواہر تیرے آقا کی خدمت میں بھیج کر اس پیشکش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قاصد نے زمین ادب کو بوسہ دیا اور عرض کیا میرے آقا کو خیل و حشم کی ضرورت نہیں، خدا نے انھیں سب کچھ دیا ہے، البتہ آپ نے ان کی شہزادی کو قبول کر لیا یہ آپ کا کرم ہے۔

ایلچی عزیز مصر کی طرف سے یہ خوشخبری لے کر لوٹا۔ زلیخا کے دل کی کلی کھل اٹھی، باپ نے جہیز کا انتظام شروع کیا۔ موتیوں کی مالا پہنے ہوئے ہزار کنیزیں، مرصع کلاہ اور جڑاؤ پٹکا پہنے ہوئے ہزار غلام، ایک ہزار عمدہ گھوڑے، سو اونٹوں پر دنیا جہان کی نفیس چیزیں، مشک ختن اور یاقوت بدخشانی کے دو دو سو ڈبے۔ یہ سارا جہیز لے کر زلیخا مصر کی طرف روانہ ہوئی۔

جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہونچا تو قاصد بھیج کر عزیز مصر کو اطلاع کی گئی۔ عزیز کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا، ایسا لگتا تھا اسے ساری دنیا مل گئی ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں، غلاموں، کنیزوں مطربوں اور مغنیوں کے ہمراہ زلیخا کے استقبال کو چلا۔ دور سے اس نے میدان میں خیمے لگے ہوئے دیکھے، عزیز مصر گھوڑے سے پیادہ ہو گیا۔ زلیخا کے خیمہ کے پاس پہونچ کر اس نے

بہت سازز و جواہر نچھاور کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ معذرت کی کہ یہ سب کچھ زلیخا کے شایان شان نہیں ۔

زلیخا اپنے خیمہ میں دایہ کے ساتھ تنہا تھی، عزیز مصر کی آواز سن کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے دایہ سے کہا کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں عزیز کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ دایہ نے خیمہ میں سوراخ کر دیا۔ زلیخا نے بے تابی سے باہر دیکھا، جیسے ہی اس کی نظر عزیز مصر کے چہرے پر پڑی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی، اس نے کہا ہائے میں مرگئی، لٹ گئی، یہ تو وہ شخص نہیں ہے جس کے لئے میں نے یہ سب مصیبت برداشت کی ۔

زلیخا اپنی بدقسمتی کا ماتم کرنے لگی۔ اس نے کہا میری مثال اس پیاسے کی طرح ہے جو تپتے ریگستان میں پانی کے لئے دوڑ رہا تھا، دوڑتے دوڑتے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے اور زبان باہر نکل آئی، اتنے میں دور سے اسے پانی نظر آیا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس پہونچا تو معلوم ہوا پانی کھاری ہے اور پینے کے قابل نہیں ہے ۔

زلیخا دیر تک آنسو بہاتی رہی ۔ آخر اسے آسمان سے یہ ندا سنائی دی کہ تیرا مقصود عزیز مصر نہیں ہے مگر تو جس دلبر تک پہونچنا چاہتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ البتہ عزیز مصر تیرے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اس ندائے آسمانی کو سن کر زلیخا کو ذرا تسلی ہوئی۔ اسے یہ امید بندھی کہ شاید اصل دلبر سے سرزمین مصر میں ملاقات ہوگی ۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ۔

صبح سویرے عزیز مصر نے زلیخا کو عماری میں بٹھایا اور مصر کی طرف چلا۔ عماری کو چاروں طرف سپاہی گھیرے ہوئے تھے۔ قافلہ نے حرکت کی تو مطربوں نے ساز چھیڑا اور ساربانوں نے حدی گانا شروع کیا۔ زلیخا کی کنیزوں کو یہ اطمینان ہوا کہ ان کی ملکہ کو غم ہجر سے نجات ملی اور عزیز مصر

کو یہ خوشی تھی کہ زلیخا جیسی ماہرو اس کے محل کی زینت ہوگی۔ لیکن زلیخا کے دل میں رہ رہ ہوک اٹھتی تھی اور کبھی کبھی بے اختیار اس کے منھ سے آہ نکل جاتی تھی۔

اتنے میں ساربانوں نے آواز لگائی کہ ہم دریائے نیل کے ساحل پر آپہونچے۔ وہ سامنے شہر مصر ہے۔ مصری غلام اور کنیز دونوں طرف صف باندھے اور لعل و گہر کے طبق لئے کھڑے تھے۔ زلیخا کی سواری ان کے بیچ سے گذری تو انھوں نے مہمان کے اوپر سے سب زر و جواہر نثار کر دئے۔

زلیخا عزیز مصر کے محل میں داخل ہوئی تو اسے ایک سنہرے تخت پر بٹھایا گیا اور اس کے سر پر مرصع تاج رکھا گیا۔ خوبصورت کنیزیں اس کی خدمت کے لئے حاضر ہوئیں اور محل کی حفاظت کے لئے ریشمی لباس میں ملبوس غلام تعینات ہوئے۔ مصر کی حسین سے حسین عورتیں زلیخا کی مصاحبت کے لئے بلائی گئیں لیکن زلیخا کو کچھ اچھا نہیں لگتا تھا، وہ سب سے باتیں کرتی مگر اس کا من کہیں اور تھا، وہ اپنے خیالی دلبر کی یاد میں کھوئی رہتی تھی۔

یوسف جوان ہوئے تو یعقوب کو ان سے ایسی دل بستگی ہوئی کہ انھوں نے اپنے دوسرے بیٹوں کو تقریباً نظر انداز کر دیا اور اپنی ساری توجہ یوسف پر مرکوز کر دی۔ یعقوب کے گھر میں ایک درخت تھا، جب ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا تو اس درخت میں ایک نئی شاخ نکلتی تھی، جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا شاخ بھی بڑھتی رہتی، یہاں تک کہ وہ بیٹا اسے کاٹ کر اپنا عصا بنا لیتا۔ لیکن جب یوسف پیدا ہوئے تو اس درخت میں کوئی نئی شاخ نہیں نکلی اور اس طرح یوسف بے عصا کے رہ گئے۔

ایک رات یوسف نے یعقوب سے درخواست کی کہ آپ خدا سے دعا کیجئے وہ میرے لئے جنت سے عصا بھیجے۔ یعقوب نے دعا کی۔ خدا نے ان کی دعا قبول کی اور ان کے لئے جنت سے ایک سبز عصا اتارا جس میں زبرجد کا دستہ تھا۔ بھائیوں نے عصا دیکھا تو حسد سے جل اٹھے

اوران کے دل کینہ سے بھر گئے۔

ایک رات یوسف باپ کے پاس سو رہے تھے، خواب میں وہ ہنس پڑے۔ ان کی آنکھ کھلی تو یعقوب نے ہنسی کی وجہ پوچھی۔ یوسف نے کہا: میں نے خواب میں یہ دیکھا ہے کہ چاند، سورج اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

یعقوب نے یہ خواب سنا تو یوسف کو تاکید کی کہ ہرگز کسی بھائی سے اس خواب کا ذکر نہ کریں وہ پہلے ہی حسد میں جل رہے ہیں۔ یہ خواب سنیں گے تو اس کی جان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ لیکن یوسف باپ کی نصیحت بھول گئے اور انھوں نے اپنے ایک بھائی کو اپنا خواب بتا دیا، اس نے جا کر دوسرے بھائیوں کو بتا دیا، بس پھر کیا تھا انھوں نے غم وغصہ میں کپڑے پھاڑ لئے اور کہنے لگے باپ نے یوسف کو اتنا سر چڑھایا ہے کہ وہ ہمیں یعقوب کا بیٹا نہیں سمجھتا اور اب اسے یہ ہوس ہوئی ہے کہ ہم اسے سجدہ کریں۔

آخر بھائیوں نے طے کیا کہ کسی طرح یوسف کا مزاج ٹھیک کیا جائے، ایک نے کہا: اسے ختم کر دو، فرصت ہو جائے گی۔ دوسرا بولا ناحق خون کیوں کریں، بہتر ہے اسے کسی دور جنگل میں لے جا کر چھوڑ دیں۔ درندے خود ہی چند دن میں اس کا صفایا کر دیں گے۔

تیسرا بھائی بولا: جنگل میں تڑپا تڑپا کر مارنے سے کہیں بہتر ہے کہ ایکدم اسے خنجر مار دیں۔ لیکن اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ یوسف کو کسی کنویں میں ڈال دیں۔ ہو سکتا ہے کوئی قافلہ ادھر سے گذرے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈالے تو اسے پانی کے بجائے ایک غلام مل جائے گا۔ اور وہ اسے اپنے ساتھ لیتے جائیں گے۔

سب بھائیوں نے اس تجویز کو پسند کیا۔ انھوں نے طے کیا کہ کل یہ کام کر ڈالیں۔ اگلے روز سب بھائی یعقوب کے پاس گئے اور بولے: اجازت ہو تو یوسف کو ساتھ لے کر ٹہلنے جائیں۔

یعقوب پہلے تو ڈرے کہ پتہ نہیں کیا اتفاق پیش آئے مگر جب بیٹوں نے اطمینان دلایا تو چپکے ہو گئے اور اجازت دیدی۔

بھائیوں نے خوشی میں یوسف کو کندھے پر اٹھایا اور جنگل کی طرف چل دئے۔ جنگل میں پہونچتے ہی انھوں نے یوسف کو نیچے اتارا اور ان سے کہا کانٹوں پر چل۔ یوسف کے نازک پاؤں کانٹوں پر چلتے چلتے لہولہان ہو گئے، اگر وہ گھبرا کر کسی بھائی کا دامن تھامتے تو وہ دامن جھٹک دیتا اور ٹھٹھا مارتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔

یوسف روتے ہوئے اسی عالم میں تین فرسنگ چلے۔ وہاں ایک کنواں تھا، گھپ اندھیرا، بھائیوں نے یوسف کا لباس اتارا، ان کی کمر میں رسی باندھی اور انھیں کنویں میں ڈال دیا۔ یوسف جیسے ہی کنویں میں گرے خدا کی مہربانی سے پانی کے اندر سے ایک پتھر نکل آیا اور کھاری پانی میٹھا ہو گیا۔ یوسف کے چہرے کا نور سارے کنویں میں پھیل گیا۔

یوسف تین دن اس کنویں میں رہے چوتھے روز ایک قافلہ جو مدائن سے مصر جا رہا تھا، راستہ بھول کر اس کنویں پر آن کر اترا۔ قافلہ کا ایک شخص پانی لینے گیا۔ اس نے کنویں میں ڈول ڈالا تو یوسف پتھر سے اٹھ کر ڈول میں بیٹھ گئے۔ وہ طاقتور آدمی تھا، اس نے کہا آج ڈول کتنا بھاری ہے، یقیناً اس میں پانی کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

ڈول اوپر آیا تو اس نے دیکھا وہاں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہے۔ وہ اسے قافلہ میں لے آیا۔ ادھر یوسف کے بھائی اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں یوسف کا کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کنویں پر قافلہ کو دیکھا تو کنویں میں آواز لگائی، وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا تو قافلہ میں پہونچے۔ یوسف وہاں تھے، چنانچہ انھیں بہت ہی معمولی دام میں قافلہ والوں کو بیچ کر چلتے بنے۔

جس شخص نے یوسف کو خریدا اس کا نام مالک تھا۔ اتنا خوبصورت غلام مل جانے پر

وہ پھولا نہیں سماتا تھا، جب وہ قافلہ مصر پہونچا تو ہر طرف اس بات کا چرچا تھا کہ اس قافلہ میں ایک بیحد خوبصورت عبرانی غلام ہے۔ چنانچہ بہت سے مصری مالک کے گھر کے پاس جمع ہو گئے اور اس سے بولے جب تک ہم تیرے غلام کو نہیں دیکھ لیں گے یہاں سے نہیں جائیں گے۔

کچھ ہی دن میں سارا مصر یوسف کا شیفتہ ہو گیا۔ ہر شخص یوسف میں اتنا محو تھا کہ باپ اور بیٹے یا بیوی اور شوہر ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے تھے۔ روزانہ جوق در جوق لوگ مالک کے گھر آتے اور یوسف کو دیکھنے کی خواہش کرتے۔ مالک نے لوگوں کا یہ ذوق وشوق دیکھا تو یہ شرط لگا دی کہ جو یوسف کا دیدار کرنا چاہے اسے ایک دینار نذر کرنا ہوگا۔ اس پر بھی لوگ دل و جان سے تیار تھے، مالک کو روزانہ ہزاروں دینار ملتے، مصر میں وہ گہما گہمی تھی کہ پہلے کسی نے یہ سماں نہیں دیکھا تھا۔

عزیز مصر کو یوسف کے حسن کی اطلاع ہوئی تو حسد سے وہ پیچ وتاب کھانے لگا۔ اس نے حکم دیا یوسف اور اس کے مالک دونوں کو حاضر کیا جائے۔ مالک نے تین روز کی مہلت چاہی اس نے یوسف کو دریائے نیل میں لے جا کر نہلایا دھلایا، دیبائے زربفت کا لباس پہنایا اور ان کی کمر میں مرصع پٹکا باندھا۔ چہرہ پر دونوں طرف زلفیں آویزاں کیں اور اس طرح بنا سجا کر یوسف کو عزیز مصر کے پاس لے گیا۔

اس دن اتفاق سے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے، عزیز مصر اپنی خوبصورت کنیزوں کے حلقہ میں چھت پر بیٹھا لطف اندوز ہو رہا تھا، جب یوسف کی سواری پہونچی اور انھوں نے ہودج کا پردہ ہٹایا تو سب کو ایسا لگا کہ کالے بادلوں میں سے اچانک سورج نکل آیا ہے۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں ہنوز گھرے بادل چھائے تھے۔ حیرت میں کنیزوں کے منھ سے چیخ نکل پڑی اور وہ ادب سے سجدہ میں گر پڑیں۔

ادھر زلیخا چند دن سے پریشان تھی اور سکون کی خاطر بیابان میں خیمہ زن تھی، وہاں بساط عیش وطرب بچھی مگر زلیخا کے دل کا بوجھ کم نہ ہوا۔ آخر اکتا کر وہ گھر لوٹ آئی۔ لوٹتے ہوئے اس نے دیکھا محل کے سامنے شور شرابہ ہے۔ زلیخا نے ہودج کا پردہ ہٹا کر دیکھنا چاہا کہ کیا ماجرا ہے۔ اچانک اس کی نظر یوسف پر پڑی۔ خدایا، میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں، وہ غش کھا گئی۔ دایہ اسے فوراً محل کے اندر لائی۔ جب اسے ہوش ہوا تو دایہ نے پوچھا کیا بات تھی؟

زلیخا نے کہا اس مجمع میں جو غلام تھا جس کی دھوم سارے مصر میں مچی ہوئی ہے، وہی تو میرا دلبر ہے، میں اس پر قربان جاؤں، میں نے اسی کو خواب میں دیکھا تھا، آج اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے دل پر پہاڑ سا آگرا ہے، خدایا، اس عشق کا انجام کیا ہوگا۔

مہ من شاہ ایوان کہ گردد بہ رخ شمع شبستان کہ گردد

معلوم نہیں میرا دلبر کس کے ایوان کی زینت بنے گا اور اس کا جلوہ کس کے شبستان کو نور بخشے گا۔

دایہ زلیخا کی بات سن کر رو پڑی۔ بولی اس راز کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھ، صبر سے کام لے، خدا نے چاہا تو ایک دن ضرور تیری مراد پوری ہوگی۔

ادھر یوسف کا بازار گرم تھا۔ مصر کے سبھی لوگ انھیں خریدنا چاہتے تھے بعض تو اپنی ساری پونجی دینے کو تیار تھے۔ اس اثنار میں مالک نے یہ منادی کرادی کہ وہ اپنے غلام یوسف کو فروخت کرنا چاہتا ہے، لوگ زر وسیم کے توڑے لے کر ٹوٹ پڑے۔ ایک شخص نے اشرفیوں کی تھیلی لا کر یوسف کے قدموں میں ڈال دی۔ دوسرے نے اور بڑھ کر دام لگایا۔ بات سو تھیلی تک پہونچ گئی۔

ایک مصری امیر نے کہا میں یوسف کے وزن کے برابر خالص مشک دینے کو تیار ہوں دوسرے نے کہا میں یوسف کو لعل میں تول کر قیمت چکاؤں گا۔ بولی بڑھتی گئی۔ زلیخا کو خبر ہوئی

تو اس نے کہا اب تک جتنا دام لگا ہے میں اس سے دگنا دوں گی۔ آخر دوسرے خریدار مایوس ہو کر لوٹ گئے۔

زلیخا نے عزیز مصر سے کہا ہمارے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ یوسف کو لے لیں۔ عزیز راضی ہو گیا۔ زلیخا کے پاس موتیوں کی ایک ڈبیا تھی جس کا ہر موتی مصر کے خراج سے زیادہ قیمتی تھا، اس نے وہ ساری ڈبیا دے کر یوسف کو خرید لیا اور انھیں غلامی کی مشقت سے نجات بخشی۔ زلیخا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنی مصیبت کے بعد آخر اسے اپنا دلبر مل گیا۔

یوسف کے آنے کے بعد زلیخا خود ان کی خدمت کرتی تھی۔ اس نے یوسف کے لئے تین سو ساٹھ لباس، مرصع پٹکا اور جڑاؤ تاج بنوائے۔ یوسف ہر روز نیا لباس پہنتے، نیا پٹکا باندھتے اور نیا تاج سر پر رکھتے۔ زلیخا اپنے ہاتھوں سے یوسف کے لئے کھانا تیار کرتی۔ مربا اور حلوا بناتی تاکہ یوسف اپنا من پسند کھانا کھا سکیں۔ رات کو انھیں دیبا و حریر کے بستر پر سلاتی اور جب تک انھیں نیند نہ آتی قصہ کہانی کہتی رہتی۔ اس طرح زلیخا دل و جان سے ان کی دیکھ ریکھ کرتی۔

ایک دن یوسف نے کہا: میری خواہش ہے کہ پیغمبروں کی طرح میں بھی گلہ بانی کروں زلیخا نے فوراً گڈریوں کو حکم دیا کہ یوسف کے لئے بھیڑوں کا ایک گلہ اکٹھا کریں اور خود دور سے اس کی رکھوالی کرتے رہیں تاکہ یوسف کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ یوسف اس طرح جنگل میں بھیڑوں کو چراتے اور محل میں زلیخا کے دل پر حکمرانی کرتے۔

زلیخا وصل را می جست چارہ ولی می کرد یوسف زان کنارہ

زلیخا کسی نہ کسی تدبیر سے وصال چاہتی تھی مگر یوسف اس سے دامن بچاتے تھے۔

زلیخا بود اشک از دیدہ ریزان ولی می بود یوسف زان گریزان

زلیخا رو رو کر التجا کرتی مگر یوسف ہمیشہ ٹال جاتے۔

زلیخا دل بدان فرخ لقا داشت   ولی یوسف نظر بر پشت پا داشت

زلیخا یوسف کے خوبصورت چہرے کو تکتی رہتی مگر یوسف کی نظر ہمیشہ نیچی رہتی ۔

زلیخا بہر یک دیدن ہمی سوخت   ولی یوسف ز دیدن چشم می دوخت

زلیخا یوسف کے دیدار کے لئے تڑپتی رہتی لیکن یوسف ہمیشہ آنکھ بچا جاتے ۔

یوسف کی سرد مہری اور بے اعتنائی نے زلیخا کا دل توڑ دیا۔ اس کا سرو سا قد جھک گیا۔ اس کے گالوں کی لالی جاتی رہی ۔ اس کی آنکھوں میں ترمرے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو ملامت کرتی کہ خواہ مخواہ ایک زر خرید غلام کے عشق میں رسوا ہو رہی ہوں۔ آخر میں تخت و تاج کی مالک ہوں اور یہ غلام اتنا گھمنڈی ہے کہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھتا تک نہیں۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر مصر کی عورتوں کو معلوم ہو گیا تو اس پر لعن طعن کریں گی۔ یہ سب باتیں تھیں مگر زلیخا عشق سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

ایک روز زلیخا کی دایہ نے کہا: جب تو اپنے دلبر سے دور تھی تو اس کی جدائی میں تڑپتی تھی، اب عین وصل میں کیوں غم کھا رہی ہے؟

زلیخا نے اسے اپنی مشکل بتائی۔ دایہ نے کہا اگر یوسف سے ملنا اتنا ہی مشکل ہے تو فراق ہی بہتر ہے۔

زلیخا نے دایہ سے کہا: کچھ تو میرے درد کا مداوا کر۔ جا یوسف سے میرے درد و غم کی بات کر، اس سے منت سماجت کر، ممکن ہے وہ راضی ہو جائے۔

دایہ نے یوسف کو جا کر بتایا کہ زلیخا آج سے نہیں بچپن سے تیری عاشق ہے اور اس درد کو سینہ میں چھپائے سلگ رہی ہے۔

یوسف نے کہا: میں زلیخا کا زر خرید غلام ہوں، شب و روز اس کی خدمت میں

حاضر ہوں، اس کے اشارۂ ابرو پر فدا ہونے کو تیار ہوں مگر خدا کے حکم سے کیسے منہ موڑوں، عزیز مصر نے مجھے اس گھر کا امین بنایا ہے۔ اس کے حق میں کیسے خیانت کروں۔ جا زلیخا سے کہہ ایسی بری باتیں دل سے نکال دے اور مجھے خدارا معاف کر دے۔ میرے اندر بھی نفس ہے مگر میں خدا کے فضل سے پاکدامنی کا پابند ہوں۔

دایہ نے آکر زلیخا کو یوسف کا ٹکا سا جواب بتایا تو وہ خود ان کے پاس گئی اور رو رو کر اپنی حالت زار بیان کی اور اپنے دل کی مراد چاہی۔ زلیخا کی بات سن کر یوسف رو پڑے، زلیخا نے رونے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا آج تک مجھے کسی کا عشق راس نہیں آیا ہے۔ پتہ نہیں تیرا عشق میرے سر پر کیا مصیبت ڈھائے گا۔ میں تیرا غلام ہوں اور بس۔ مجھ پر اتنی عنایت کر کے مجھے شرمندہ نہ کر۔ اب اجازت دے جا کر کوئی اور کام کروں۔

آخر زلیخا نے ایک باغ میں یوسف کے رہنے کا انتظام کیا اور ان کی خدمت کے لئے خوبصورت کنیزوں کو مقرر کیا تاکہ یوسف کو جسم کی لذت سے آشنا کریں، مگر یوسف نے کبھی نظر اٹھا کر انھیں نہیں دیکھا۔

ادھر زلیخا کی دایہ کے ذہن میں ایک ترکیب آئی، اس نے کہا ایک محل بنوایا جائے اور اس کی تمام دیواروں پر باہم زلیخا اور یوسف کا نقش بنوایا جائے تاکہ یوسف جب بھی اس محل میں داخل ہوں ہر طرف اپنے آپ کو زلیخا کی آغوش میں دیکھیں۔ رفتہ رفتہ ان کے دل میں گدگدی ہوگی اور وہ تیرے وصال کے طالب ہوں گے۔

زلیخا کے پاس جتنی دولت تھی، اس نے ساری کی ساری اس محل کی تعمیر میں لگادی۔ محل کی تعمیر کے لئے ایک ماہر معمار منتخب ہوا۔ اس نے بہت خوبصورت محل تعمیر کیا۔ محل میں سات کمرے تھے، ہر کمرہ میں مخصوص رنگ کا پتھر لگایا گیا تھا، محل کے ستون سونے کے تھے، اس کی

دیواروں پر چڑیوں اور جنگلی جانوروں کی تصویریں تھیں۔ جا بجا ہرے بھرے درخت تھے۔ بعض چڑیاں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ ان کے پر زمرد کے اور ان کی چونچ لعل کی تھی۔ ان تصویروں کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

دیواروں پر جگہ جگہ یوسف اور زلیخا کی تصویر تھی جس میں وہ ایک دوسرے کی آغوش میں یا ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

محل کی تعمیر کے بعد زلیخا کی آتش شوق اور تیز ہوگئی۔ اس نے حکم دیا زمین پر دیبا وحریر کے فرش بچھائے جائیں، چھتوں سے لعل وگہر کی قندیلیں آویزاں کی جائیں اور سارے محل میں عطر چھڑکا جائے۔ زلیخا نے سوچا اب اس محل میں یوسف کو مدعو کریں۔

لیکن یوسف کی آمد سے قبل زلیخا نے اپنا بناؤ سنگار شروع کیا۔ اس نے بڑے فتنہ انگیز طریقہ سے اپنی آرائش کی۔ ریشم کا لباس زیب تن کیا جس پر جگہ جگہ ہیرے موتی ٹکے تھے سر پر سونے کا تاج پہنا۔ جب زلیخا کا سولہ سنگار ختم ہوا تو اس نے یوسف کو بلوایا۔ یوسف محل میں داخل ہوئے تو ایسا لگا کہ ساری فضا جگمگا اٹھی۔ انھیں دیکھتے ہی زلیخا کے ہاتھ سے صبر وضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اس نے بڑھ کر یوسف کا ہاتھ پکڑا اور ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے پہلے کمرے کے اندر لے آئی۔ کمرے میں پہونچ کر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اب اس نے مہر سکوت توڑا اور اپنے دل کی بات یوسف کو بتائی۔

یوسف نے کہا: اس کمرے میں میرا تیرا تنہا رہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ تو آگ ہے میں روئی کا ڈھیر، تو آندھی ہے اور میں مشک کا نافہ۔

لیکن زلیخا باتوں باتوں میں یوسف کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور اسے بھی اندر سے قفل کر دیا۔ یوسف کو یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ زلیخا ہوس میں اندھی ہو رہی ہے۔ زلیخا نے وہاں بھی

منت سماجت کی مگر یوسف برابر انکار کرتے رہے ۔

زلیخا نے دیکھا یوسف کسی طرح نہیں مانتے تو وہ انھیں اندر والے کمروں میں لے گئی اور ہر کمرے میں اندر سے تالا لگاتی گئی ۔ چھٹے کمرے میں بھی پہونچ کر اس کی مراد بر نہیں آئی ۔ جب وہ ساتویں کمرے میں داخل ہوئی تو خراماں خراماں نازو ادا دکھاتی ہوئی تخت تک گئی اور وہاں جاکر لیٹ گئی ۔ پھر یوسف سے التماس کرتے ہوئے بولی : کچھ تو مجھ پر ترس کھا، آ ذرا میرے قریب آ۔ میں کب تک اس مصیبت میں مبتلا رہوں ۔ سوچ تو سہی میں کب سے تیری چشم کرم کی منتظر ہوں ۔

یوسف اسی طرح نظریں نیچی کئے کھڑے رہے ۔ اچانک انھوں نے دیکھا فرش پر ان کی اور زلیخا کی تصویر بنی ہوئی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی آغوش میں بھینچے ہوئے ہیں انھوں نے گھبرا کر دیوار کی طرف دیکھا، وہاں بھی ایسا ہی نقش بنا تھا، ادھر زلیخا بضد مصر تھی کہ آج جیسے بھی ہو میرے من کی مراد پوری کر، تجھے میری قسم ۔

یوسف کو پورے ماحول میں ایک گھٹن محسوس ہوئی ۔ انھوں نے بڑی عاجزی کے ساتھ زلیخا سے درخواست کی کہ خدا کے لئے مجھے یہاں سے جانے دے ۔ مجھے مجبور نہ کر، میرے شیشۂ عصمت کو چکنا چور نہ کر ۔ اگر تو مجھے یہاں سے جانے دے تو میں اپنے باپ دادا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زندگی بھر جی جان سے تیری خدمت کرتا رہوں گا

لیکن زلیخا کسی طرح نہیں مانی، اسے ضد تھی کہ آج اور ابھی ۔ پھر اس نے یوسف سے پوچھا تیرے لئے کیا چیز مانع ہے ؟

یوسف بولے : میں خدا کے عذاب اور عزیز مصر کی محبت سے ڈرتا ہوں ۔ یہ گناہ کر کے میں قیامت کے روز عذاب بھگتوں گا اور دنیا میں عزیز مصر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا

ہوں گا۔

زلیخا نے یوسف کا عذر قبول نہیں کیا۔ اس نے کہا جہاں تک عزیز مصر کی بات ہے میں کسی دن اسے ایسی شراب پلادوں گی کہ وہ ہمیشہ کے لئے سو جائے گا۔ اور پھر یہ سارا خزانہ تیرا ہوگا۔ اس خزانے سے تو غریبوں اور بیکسوں کی خدمت کرنا، خدا تیرا گناہ معاف کر دیگا۔

یوسف نے کہا: تو سمجھتی ہے خدا کو رشوت دے کر راضی کیا جا سکتا ہے۔

زلیخا یوسف کی باتوں سے زچ ہوگئی تو اس نے ڈرانا دھمکانا شروع کیا۔ بولی اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے سینہ میں خنجر بھونک لوں گی اور یہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گی۔

یہ کہہ کر زلیخا نے بستر کے نیچے سے خنجر نکالا۔ یوسف اپنی جگہ سے اچھل پڑے، انھوں نے بڑھ کر زلیخا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زلیخا نے خنجر رکھ دیا اور پھر ناز و ادا دکھانے لگی۔ یوسف اب بھی عصمت کا سودا کرنے پر تیار نہیں ہوئے اور موقع پاکر وہاں سے بھاگنے لگے، ایک دروازے کے بعد دوسرا دروازہ، دوسرے کے بعد تیسرا، زلیخا ان کے پیچھے لپکی جب وہ آخری دروازے پر پہونچے تو زلیخا نے پیچھے سے ان کا دامن پکڑ لیا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں دامن پھٹ کر زلیخا کے ہاتھ میں آگیا اور یوسف باہر نکل گئے۔ زلیخا غصہ میں چیخنے لگی۔

دریغ آن صید کز دامم برون رفت دریغ آن شہد کز کامم برون رفت

افسوس شکار جال میں آن کر نکل بھاگا، ہائے شہد زبان تک آتے آتے رہ گیا

یوسف باہر نکلے تو عزیز مصر اور اس کے ملازمین وہاں کھڑے تھے، عزیز نے یوسف کو پریشان دیکھا تو پوچھا کیا بات ہے؟ یوسف نے یونہی کوئی بہانہ کر دیا۔ عزیز مصر نے شفقت

سے ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اندر حرم میں لے گیا۔ زلیخا نے دونوں کو ساتھ آتے دیکھا تو سمجھی یوسف نے سارا ماجرا کہہ دیا ہے، چنانچہ گھبراہٹ میں اس نے سارا راز اُگل دیا لیکن دوسرے انداز میں۔

زلیخا نے کہا میں اطمینان سے اپنے محل میں سو رہی تھی کہ یہ عبرانی غلام چوروں کی طرح میرے سرہانے آیا تاکہ میرے جسم سے لطف اندوز ہو سکے۔ میں چونک کر جاگ پڑی تو یہ ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑی اور آخر اس کا دامن پکڑ لیا۔ مگر اس نے جھٹکا مارا، دامن پھٹ کر میرے ہاتھ میں آگیا اور یہ باہر نکل بھاگا۔ اب بہتر یہی ہے کہ اس کو قید میں سخت سزا دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

عزیز مصر کو زلیخا کی گفتگو سن کر افسوس ہوا۔ اس نے یوسف کو ملامت کرنا شروع کیا ان پر کیے ہوئے احسانات گنائے۔ یوسف نے کہا میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اپنے آقا کے حرم میں غلط ارادہ سے قدم رکھوں۔ پھر یوسف نے ساری تفصیل بتائی کہ کس طرح زلیخا نے اس سے منت سماجت کی اور وہ برابر صبر و ضبط کرتا رہا۔

یوسف کی باتیں سن کر زلیخا قسم کھانے لگی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: میں بے قصور ہوں، ساری خطا یوسف کی ہے۔

عزیز مصر نے زلیخا کی قسم اور اس کے آنسوؤں کا اعتبار کر لیا اور یوسف کو قید میں ڈالنے کا حکم دیا۔ یوسف کو بہت دُکھ ہوا، انھوں نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا کی کہ خدایا حقیقت حال کو عزیز مصر پر آشکارا کر۔

عزیز کے محل میں زلیخا کی ایک رشتہ دار تھی اس کی گود میں تین مہینے کا بچہ تھا۔ جب یہ واقعہ ہوا تو خدا کی قدرت سے بچہ بول اٹھا کہ اے عزیز مصر، یوسف کو سزا دینے میں عجلت سے

کام نہ لے بلکہ ان کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آئے۔

بچہ کی بات سن کر عزیز مصر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے بچہ سے پوچھا: کس طرح؟ بچہ نے کہا: اگر یوسف کا دامن آگے سے چاک ہوا ہے تو زلیخا واقعی بے قصور ہے لیکن اگر ان کا دامن پیچھے سے پھٹا ہے تو یوسف بے خطا ہے۔

عزیز مصر نے تحقیق کی تو معلوم ہوا یوسف کا دامن پیچھے سے چاک ہوا ہے۔ اب اس نے زلیخا کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس کو توبہ و استغفار کی تلقین کی اور یوسف سے درخواست کی کہ خدارا یہ بات کسی سے نہ کہے اور اپنی زبان کو تالا لگا لے۔

رفتہ رفتہ مصر کی عورتوں کو زلیخا کے عشق کی خبر ملی تو وہ طنز سے بولیں کہ زلیخا اپنے عبرانی غلام پر مرتی ہے مگر یوسف اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں اور پہلوتہی کرتا ہے۔

زلیخا نے یہ باتیں سنیں تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا اور مصر کی معزز خواتین کو مدعو کیا۔ پھر ان سے بولی: تم سب مجھے کیوں مطعون کرتی ہو، یوسف کو دیکھو گی تو میری مجبوری سمجھو گی۔

یہ کہہ کر زلیخا نے خواتین کے ہاتھ میں ایک ترنج اور چھری دی اور اس کے بعد خود چل کر یوسف کے پاس گئی کہ خدارا ایک لحظہ کے لئے مصری خواتین کے سامنے آجا۔

یوسف زلیخا کی بات نہ ٹال سکے، چنانچہ زلیخا نے انھیں مرصع خلعت پہنائی اور سجا بنا کر مہمانوں کے سامنے لائی۔ مصری عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو ایک ہی دیدار میں ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور ترنج کاٹنے کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ بعض عورتیں یوسف کو دیکھ کر دیوانہ سی ہو گئیں، بعض ننگے پاؤں ننگے سر باہر نکل گئیں۔ بعض غش پہ غش کھانے لگیں۔ بعض بے اختیار رو پڑیں۔ آخر سبھی عورتیں زلیخا کی مجبوری سمجھ گئیں اور

اس سے معافی مانگنے لگیں، اس کے بعد وہ بھی یوسف سے منت سماجت کرنے لگیں کہ خدارا ہماری اور زلیخا کی مراد پوری کر۔

یوسف نے مصری عورتوں کی بات سن کر کانوں پر ہاتھ رکھا اور خدا کے حضور میں توبہ کرنے کو کہا۔ عورتوں نے جب دیکھا کہ یوسف کسی طرح نہیں پسیجتے تو زلیخا کو بھڑکانے لگیں کہ اسے ضرور قید میں ڈال دے۔

رات کو زلیخا نے اپنے شوہر سے بات کی۔ اس نے کہا لوگ سمجھتے ہیں میں اس عبرانی غلام پر مرتی ہوں، حالانکہ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے اب مناسب یہی ہے یوسف کو قید میں ڈال دے، لوگوں کو میرے قہر کا علم ہوگا تو ان کی بدگمانی دور ہو جائے گی۔

عزیز مصر نے زلیخا کی رائے سے اتفاق کیا۔ زلیخا فوراً یوسف کے پاس گئی اور بولی: اب بھی میری بات مان لے ورنہ قید کی کالی کوٹھری میں سڑے گا۔

اگر کامم دہی کامت برآرم براوج کبریا نامت رسانم

اگر تو میری خواہش پوری کرے تو میں تیری مراد پوری کروں گی اور تجھے آسمان کی بلندیوں تک پہونچا دوں گی۔

وگرنہ صد در محنت کشادہ پی زجر تو زندان ایستادہ

ورنہ یاد رکھ تیرے لئے محنت و مشقت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور قید خانہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔

یوسف اپنی بات پر اڑے رہے۔ زلیخا نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ یوسف کے سر سے سنہرا تاج اتار لیں، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گردن میں طوق پہنا دیں اور

انھیں گدھے پر بٹھا کر سارے شہر میں گھمائیں اور یہ آواز لگائیں کہ جو شخص اپنے آقا کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے اس کا یہ حشر ہوتا ہے۔

لوگوں نے یوسف کو اس حال میں دیکھا تو انھیں سپاہیوں کی بات کا یقین آگیا۔

آخر یوسف قید خانہ پہونچے۔ زلیخا نے قید خانہ کے داروغہ کو حکم دیا کہ یوسف کی گردن سے طوق اور ان کے ہاتھ سے ہتھکڑی اتارلی جائے اور انھیں دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ رکھا جائے۔

قید خانہ میں یوسف سارا وقت عبادت میں گذارتے اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ اس نے عورتوں کے مکروفریب سے انھیں نجات بخشی۔ لیکن زلیخا اپنے کیے پر شرمندہ تھی۔ یوسف کے نہ ہونے سے سارا محل سنسان تھا، اسے ایسا محسوس ہوتا کہ یوسف نہیں بلکہ وہ خود قید خانہ میں ہے۔ وہ رات دن آنسو بہاتی اور آہیں بھرتی لیکن عشق کی آگ اندر ہی اندر اسے جلائے جارہی تھی۔ آخر ایک رات وہ اپنی دایہ کے ساتھ قید خانہ گئی اور دور سے یوسف کا نظارہ کرتی رہی، وہ صبح کو وہاں سے محل لوٹی۔ اس کے بعد اس کا معمول ہوگیا تھا کہ وہ محل کی چھت پر آکر یوسف کا نظارہ کیا کرتی اور ان کی جدائی میں آہ وفغاں کرتی۔

یوسف قید خانہ میں پہونچے تو قیدیوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔ ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور ان کی خدمت کے لئے حاضر ہوگئے۔ خود یوسف ان کے دکھ درد میں شریک تھے، اگر کوئی قیدی بیمار پڑتا تو وہ اس کی تیمارداری کرتے، کوئی کسی مشکل میں آن پڑتا تو اس کی مشکل کا حل نکالتے، کوئی اپنی غریبی اور ناداری کا رونا روتا تو اسے تسلی دیتے، کوئی شخص خواب دیکھتا تو یوسف اس کی تعبیر بتاتے۔ اس طرح یوسف کے آجانے سے پورے قید خانہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

اتفاق سے عزیز مصر کے دو ندیم اسی قید خانہ میں مقید تھے۔ ایک رات ان دونوں نے خواب دیکھا۔ جب انھوں نے اپنا اپنا خواب یوسف سے بیان کیا تو انھوں نے ایک ندیم سے کہا تو سزا پائے گا اور دوسرے سے بولے تو عزت و آبرو کے ساتھ رہا ہو جائے گا۔ انھوں نے رہا ہونے والے ندیم سے کہا کہ اگر کبھی تو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو تو کہنا یوسف بے گناہ ہے لیکن قید کی کال کوٹھری میں مصیبت کے دن گذار رہا ہے، اس کے ساتھ انصاف کیجئے۔

لیکن جب وہ شخص آزاد ہوا اور دربار میں اسے پھر عزت و منصب حاصل ہو گیا تو وہ یوسف کی بات بالکل بھول گیا۔ اس طرح کئی سال گذر گئے۔ ایک رات عزیز مصر نے خواب میں دیکھا کہ سات دُبلی گائیں ہیں اور سات موٹی تازی۔ دبلی گایوں نے موٹی گایوں پر حملہ کیا اور انھیں گھاس کی طرح چٹ کر گئیں۔ اسی طرح سات سوکھے خوشے ہیں اور سات تروتازہ۔ اتنے میں سوکھے خوشے تروتازہ خوشوں پر چپک گئے اور انھیں بالکل خشک کر دیا۔

صبح کو عزیز مصر نے درباریوں کو اپنا خواب بتایا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق خواب کی تعبیر بتائی مگر ان میں سے کوئی تعبیر عزیز مصر کو مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ آخر اس ندیم کو یوسف کا خیال آیا، اس نے عزیز مصر سے کہا کہ جب میں قید تھا تو یوسف نے میرے خواب کی سچی تعبیر بتائی تھی، اجازت ہو تو اسے قید خانہ سے یہاں لاؤں۔

عزیز مصر نے اس سے کہا تو خود جا کر یوسف کو یہاں لے آ۔ وہ شخص قید خانہ پہنچا اور یوسف کو عزیز مصر کا خواب بتایا۔ یوسف نے کہا فربہ گائیں اور تروتازہ خوشے خوشحالی کی علامت ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دبلی گائیں اور سوکھے خوشے قحط اور تنگی کی نشانی ہیں۔ اس شخص نے فوراً آ کر عزیز مصر کو یوسف کی تعبیر بتائی۔ عزیز نے کہا ابھی جا اور یوسف کو قید خانہ

سے لے آ۔

اس شخص نے جا کر یوسف کو رہائی کا مژدہ سنایا۔ یوسف نے کہا جب تک میری بے گناہی ثابت نہ ہو جائے میں عزیز مصر کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر عزیز مجھے رہا کرنا چاہتا ہے تو مصر کی خواتین کو جمع کر کے پوچھے کہ میں واقعی گناہگار ہوں یا میرا دامن پاک ہے؟

عزیز مصر نے یوسف کا پیغام سنا تو مصر کی خواتین کو جمع کیا اور ان سے یوسف کے بارے میں دریافت کیا۔ عورتوں نے کہا: خدا بادشاہ کو سلامت رکھے، ہم نے یوسف میں عزت اور شرافت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔

ادھر زلیخا نے بھی حقیقت حال بیان کی اور اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے بولی کہ دراصل میں نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی اور جب اس نے انکار کیا تو اس پر تہمت لگا دی، یوسف کی کوئی خطا نہیں، میں اس کے عشق میں راستے سے بھٹک گئی تھی۔

یوسف کی پاکدامنی سے عزیز مصر کو خوشی ہوئی، اس نے حکم دیا انھیں قید سے نکال کر دربار میں لائیں۔ چنانچہ یوسف کو گراں بہا خلعت پہنا کر اعزاز و اکرام کے ساتھ دربار میں لائے، عزیز نے کھڑے ہو کر انھیں سینہ سے لگایا اور تخت پر اپنے پہلو میں بٹھایا پہلے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی اور پھر قحط سے بچنے کی تدبیر معلوم کی۔

یوسف نے کہا تمام شہر اور قصبوں میں منادی کرادی جائے کہ لوگ کھیتی باڑی پر سارا زور لگا دیں، مٹی ہو یا پتھر، ہر جگہ کاشت کریں، زیادہ سے زیادہ فصل کاٹیں اور غلہ جمع کر کے گھروں میں جمع کرلیں تاکہ قحط اور تنگی کے زمانے میں ان کے پاس غلہ کا ذخیرہ موجود ہو۔

یوسف نے کہا: اس کام کو انجام دینے کے لئے تجربہ کار ماہروں کی ضرورت ہے۔

اور میں اس کام کے لئے سب سے موزوں ہوں۔ عزیز مصر نے یہ سنا تو اور بھی خوش ہوا۔ اس نے یوسف کو اپنی جگہ تخت پر بٹھایا اور ان کے ہاتھ میں مصر کا سارا انتظام سونپ دیا۔ چنانچہ یوسف باقاعدہ تخت نشین ہوئے اور سب لوگوں نے انھیں اپنی فرمانبرداری کا یقین دلایا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد عزیز مصر کا انتقال ہو گیا۔ اب زلیخا کا حال بہت برا ہوا۔ عزیز کی وفات کے بعد اس کے پاس جو بھی دولت و ثروت تھی، جاتی رہی، لیکن اب بھی وہ یوسف کا دم بھرتی تھی اور ان کے عشق میں گھلتی رہتی تھی، وہ ایک گوشہ میں پڑی رہتی، اس نے کھانا پینا بھی ترک کر دیا، پچھلی باتوں کو یاد کرتی تو زندگی اور سنسان معلوم ہوتی۔ زلیخا سالوں تک اسی طرح خون دل کھاتی رہی اور اپنے دل کا ماتم کرتی رہی یہاں تک کہ وہ بوڑھی ہو گئی، کالے سیاہ بال دودھ کی طرح بھک سفید ہو گئے۔ آنسو بہاتے بہاتے اس کی بینائی بھی جاتی رہی۔

زلیخا نے کئی سال اسی گوشۂ تنہائی میں گذار دئے۔ اب نہ اس کے جسم پر اطلس و حریر کا لباس تھا اور نہ اس کے کانوں میں بندے جھلکتے تھے۔ بس زبان پر یوسف کا نام تھا اور اسی نام سے دل بیتاب کو سکون ملتا تھا۔

آخر زلیخا نے فیصلہ کیا وہ وہاں جا کر مکان لے جہاں سے یوسف کی سواری گذرتی ہے۔ وہاں کم از کم وہ یوسف کے پاس سے آنے جانے والوں سے مل سکتی ہے اور اگر کبھی یوسف کی سواری گذری تو دور سے محبوب کا نظارہ کر سکتی ہے۔

زلیخا نے یہی کیا۔ اس نے یوسف کی راہ میں گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی بنائی اور وہاں رہنا شروع کیا۔ ذرا کسی سواری کی آہٹ ہوتی تو زلیخا فوراً باہر آتی مگر مایوس ہو کر پھر اندر لوٹ جاتی۔ گلی کے بچے اس کا مذاق اڑاتے اور خواہ مخواہ یوسف کے آنے کی خبر دیکر اسے ستاتے۔ اور اگر کبھی واقعی یوسف کی سواری ادھر سے گذرتی تو بچے کہتے آج تو دور

دور تک یوسف کا پتہ نہیں ہے۔ زلیخا ان بچوں کی منت سماجت کرتی اور کہتی خدا کے لئے مجھے دھوکا مت دو اور یوسف کی آمد کو مجھ سے نہ چھپاؤ۔

ایک دن ابھی سورج نکل رہا تھا کہ خبر پھیلی یوسف وہاں سے گذرنے والے ہیں زلیخا فوراً باہر آگئی اور جب یوسف کی سواری وہاں سے گذری تو اس نے دادخواہوں کی طرح فریاد کی۔ اس کی فریاد واقعی دل کی گہرائی سے نکلی تھی۔ مگر گھوڑوں کی ٹاپ اور سپاہیوں کی آواز میں زلیخا کی فریاد دب کر رہ گئی۔ کسی نے اس کی فریاد پر کان نہیں دھرا۔ مایوسی سے زلیخا کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کراہتے ہوئے وہ جھونپڑی میں واپس چلی گئی۔ اس کے بعد اس نے اس بت کو نکالا جس کی وہ پوجا کرتی تھی، اور ابراہیم کی طرح اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر اس نے خدا کے حضور میں سر جھکایا اور یہ التجا کی، خدایا، میں نے خطا کی ہے، تو اپنے کرم سے میری خطا معاف کر۔

یوسف کی سواری لوٹی تو زلیخا پھر راستے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اس بار اس کی فریاد یوسف کے کانوں تک پہونچ گئی۔ یوسف اس فریاد سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے حکم دیا فریادی کو ان کے حضور میں پیش کیا جائے تاکہ اس کی مصیبت کا حال معلوم ہو۔

یوسف محل میں پہونچے تو دربان نے اطلاع دی کہ وہ بڑھیا شاہی حکم کی منتظر ہے۔ یوسف نے کہا اس کی جو بھی حاجت ہو پوری کر دی جائے۔ دربان نے کہا: وہ اپنی حاجت کسی اور سے کہنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آخر یوسف نے اجازت دی کہ بڑھیا کو ان کی خلوت میں پیش کیا جائے۔ زلیخا بیحد خوش خوش اندر آئی۔ یوسف نے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟

زلیخا بولی:

بگفت آنم کہ چون روی تو دیدم — ترا از جملہ عالم برگزیدم

میں وہی ہوں کہ جب میں نے تیرا جلوہ دیکھا ، تو میں نے تیرے سوا ساری دنیا سے آنکھ بند کر لی۔

جوانی در غمت برباد دادم　　بدین پیری کہ می بینی ، فتادم

میں نے تیرے عشق میں ساری جوانی گنوادی اور اب بڑھاپے نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔

گرفتی شاہد ملک اندر آغوش　　مرا یکبارگی کردی فراموش

جب سے عروس سلطنت تیرے آغوش میں آئی ہے تو نے مجھ بدنصیب کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔

یوسف نے زلیخا کو پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ، بولے یہ تو نے کیا حال بنا رکھا ہے؟

بگفتا کو جوانی و جمالت　　بگفت از دست شد دور از وصالت

یوسف نے پوچھا وہ تیری جوانی اور خوبصورتی کیا ہوئی ؟ زلیخا نے کہا تیرے وصال کی حسرت میں گنوا بیٹھی۔

بگفتا چشم تو بی نور چون است　　بگفت از بس کہ بی تو غرق خون است

یوسف نے کہا ، تیری آنکھیں سونی سونی سی کیوں ہیں؟ زلیخا بولی تیرے فراق میں مسلسل اشکباری سے آنکھوں کا نور جاتا رہا۔

بگفتا خم چرا شد سرو نازت　　بگفت از بار ہجر جانگدازت

یوسف نے پوچھا تیرا سرو ناز جیسا قد کمان کی طرح کیوں جھک گیا؟ زلیخا نے کہا تیری روح فرسا جدائی کے بوجھ سے جھک گیا۔

یوسف نے کہا ، تیرے پاس اتنا زر و سیم تھا کیا ہوا؟ زلیخا نے کہا جو کچھ تیرے

بارے میں کوئی ذکر چھیڑتا میں اس کے اوپر سے زر و جواہر نثار کر دیا کرتی تھی، رفتہ رفتہ ساری دولت جاتی رہی۔

یوسف نے آخر میں پوچھا: اب تو کیا چاہتی ہے؟

زلیخا نے یوسف کو قسم دی اور پھر کہا: میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی اور آنکھوں کا نور واپس چاہتی ہوں تاکہ تیرا دیدار کر سکوں۔

یوسف نے خدا کے حضور میں دعا کی۔ خدا نے ان کی دعا قبول کی۔ زلیخا دوبارہ جوان ہو گئی، اس کے کافور جیسے بال مشک کی طرح سیاہ ہو گئے۔ اس کی آنکھیں بینا ہو گئیں اور اس کا خمیدہ قد سرو کی طرح سیدھا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا زلیخا چودہ سال کی لڑکی ہے اس کے حسن کا حد و حساب نہیں تھا۔

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو یوسف نے کہا: اب تیری اور کیا خواہش ہے؟ زلیخا نے کہا: بس تیرے وصال کی تمنا ہے۔

یہ خواہش سن کر یوسف چپ ہو گئے۔ وہ نہ انکار کر سکے نہ اقرار۔ اتنے میں خدا نے جبرئیل کو یہ وحی دے کر بھیجا کہ ہم نے زلیخا کی التجا سنی، اب اس کو مزید ناامید کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ ہم نے عرش پر تم دونوں کا عقد کر دیا ہے۔

یوسف کو یہ آسمانی بشارت ملی کہ زلیخا سے ان کا عقد عرش پر ہو چکا ہے تو انھوں نے شاہانہ جشن کا اہتمام کیا۔ دور دراز کے بادشاہوں کو دعوت دی اور ان کے حضور میں زلیخا سے عقد کیا۔

رات کو یوسف حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے تو زلیخا ان کی منتظر تھی، اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے، یوسف اندر آئے تو ایسا لگا جیسے کمرے میں چاند اتر آیا

ہے۔ زلیخا ان کے جمال کی تاب نہ لا سکی اور غش کھا کر بیہوش ہوگئی۔ یوسف نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سنبھالا اپنے جسم کی خوشبو سے اسے ہوش میں لائے، اور پھر اس کے شیریں لبوں کا بوسہ لیتے رہے۔

اس کے بعد یوسف اور زلیخا ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگے۔ اب یوسف کے دل میں بھی زلیخا کی اتنی محبت تھی کہ وہ اپنی پچھلی سرد مہری کی بات سوچ کر شرما جاتے تھے۔

نل دمن

شیخ ابوالفیض فیضی ہندوستان کا مشہور شاعر ہے۔ فیضی آگرہ شہر میں پیدا ہوا، اس نے جوانی ہی میں فقہ، تاریخ، فنون شعر اور دوسرے علوم متداولہ میں مہارت حاصل کر لی۔ اور پھر اکبر کے دربار میں ملک الشعرائی کے عہدے پر فائز ہوا۔ ہندوستان میں جن لوگوں نے فارسی زبان کی ترویج میں اہم رول ادا کیا ہے فیضی ان میں سرِفہرست ہے۔

فیضی نے غزلیات کا دیوان مرتب کیا اور نظامی گنجوی کے تتبع میں خمسہ کہا۔ خمسہ کی ایک مثنوی نل دمن ہے جو اکبر بادشاہ کے ایما پر نظم کی گئی۔ اس مثنوی میں تقریباً ۴۲۰۰ شعر ہیں۔ مثنوی نل دمن سارے ہندوستان میں مشہور ہے اور متاخرین شعرا نے اس کے نمونہ پر مثنویاں کہی ہیں۔


داستان نل و دمن

ہنداست و ہزار عالم عشق   ہنداست و جہان جہان غم عشق

ہندوستان میں عشق کی ہزار جلوہ آفرینی ہے۔ عشق کی بدولت کہیں صحرا صحرا غم ہے اور کہیں گلشن گلشن مسرت۔

ہندوستان میں نل نام کا ایک راجا راج کرتا تھا، وہ شان وشوکت اور عقل و دانش میں لاجواب تھا، قسمت نے اس کے لئے عیش وطرب کے سارے خزانے لٹا دئیے تھے۔ نل گھوڑوں کی شناخت میں بھی یکتا تھا اور اس فن میں اسے اتنی مہارت تھی کہ وہ گھوڑے کا پاؤں دیکھ کر اس کی عمر بتا دیتا تھا اور اگر کسی حاملہ گھوڑی کو دیکھتا تو یہ بھی بتا دیتا تھا کہ اس کے پیٹ میں کس رنگ کا بچہ ہے۔

نل جوان اور خوبصورت تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے سر پر اقبال وسعادت کا سایہ تھا، اس کے دربار میں جو داستان گو یا جہانگرد مسافر آتے تھے وہ دنیا جہان کے حسینوں کی داستانیں سناتے تھے۔ بادشاہوں کی کہانیاں سن کر نل ان کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھا کرتا تھا، لیکن جب اسے کسی سر پھرے عاشق کا قصہ سنایا جاتا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آجاتی تھی، یہ چمک عشق کی تھی۔

رفتہ رفتہ نل کے دل میں عشق کا ڈر بیٹھ گیا۔ وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھتا کہ ایسا نہ ہو کبھی عشق کے ہاتھوں وہ بھی مجبور اور بے بس ہو جائے اور اس کی ساری قدرت وحشمت خاک میں مل جائے۔ وہ اپنے آپ کو ہر دم سنبھالے رہتا تھا، جیسے اس کی جان کو کھٹکا لگا ہو۔

لیکن ایک دن ساری استقامت اور استقلال کے باوجود نل کا دل عشق میں اسیر

ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس کی آنکھوں میں نیند کھٹکنے لگی۔ رات کو آسمان پر ستاروں کی آنکھ بھی جھلملا جاتی مگر نل کی آنکھ سے آنکھ نہیں لگتی تھی۔ اس کے دل پر انجانا سا غم چھایا رہتا، اسے خود یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خلش کیوں اور کہاں سے پیدا ہوئی ہے وہ کونسا نادیدہ دلربا ہے جو اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا ہے۔ آخر یہ دل میں کیوں غم کا طوفان امنڈ رہا ہے ؟

نل ہر وقت نالہ و فریاد کرتا اور خود ہی خود کہتا یہ کون فتنہ ہے جو میری جان لینا چاہتا ہے، دل کی یہ آگ کس پانی سے بجھے گی اور آنکھوں کی ویرانی کس تجلّی سے شاداب ہوگی۔

این باد ز دامن کہ برخاست — وین دود ز خرمن کہ برپاست

خدایا، یہ ہوا کس کے دامن سے چلی ہے اور یہ دھواں کس خرمن سے اٹھا ہے

این عشق ندانم از کجا خاست — کز ہر رگ و ریشہ ام بلا خاست

خدا جانے اس عشق کا سرچشمہ کہاں ہے، اس نے تو میری رگ رگ میں طوفان بھر دیا ہے۔

اس انجانے عشق میں نل کا حال اتنا خراب ہوا کہ اس کے ندیم اور درباری پریشان ہوگئے۔ گویا سارا زمانہ طوفان بلا کی زد میں آگیا ہے۔ جب درباریوں کی تشویش حد سے زیادہ بڑھی تو نل کے وزیر نے شاہی طبیب کو راجا کی خدمت میں بھیجا۔ نل نبض تو کیا دکھاتا الٹا طبیب پر برس پڑا، طبیب منہ لٹکائے وزیر کے پاس لوٹ گیا اور بولا، راجا کے دل میں عشق کا طوفان موجزن ہے، اس کا مرض جسمانی نہیں روحانی ہے، وہ شورِ جنون کا مارا ہے، راجا کا علاج چاہتے ہو تو کسی معشوقۂ نازنین کا انتظام کرو، بس اس کے ہونٹوں کا عناب راجا کے بخار کو دور کر سکتا ہے۔

یہ بات سن کر وزیر بڑا دکھی ہوا۔ وہ ڈرتا ڈرتا راجا کے پاس پہونچا اور بولا: جب سے مہاراج کی طبیعت ناساز ہوئی ہے، میری نظر میں دنیا تاریک ہوگئی ہے۔ اب یہ التجا ہے کہ کم از کم اپنے دل کی بات ہمیں بتائیے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کا دل کس نے لبھایا ہے۔ اگر وہ آدم زاد ہے تو دنیا کا ہر فرد ہمارا تابع ہے اور اگر پریزاد ہے تو پھر میں دنیا کی ساری پریوں کو شیشہ میں بند کر کے آپ کے سامنے پیش کردوں گا۔

نل نے کہا: میں اتنا جانتا ہوں کہ کسی کے ہاتھوں نے مجھ پر تیر چلایا ہے، تیر کی خلش دل میں محسوس ہوتی ہے مگر تیر چلانے والے کا کچھ اتا پتا نہیں۔ بھلا کوئی عاشق اپنے معشوق کا اتا پتا بھی پوچھتا ہے؟

وزیر نے عرض کیا آپ خواہ مخواہ کام کو مشکل نہ بنائیے، یہ غم کا چکر چھوڑیے اور ہنسی خوشی جشن منائیے۔ اجازت ہو تو شاہی ہرکارے بھیج کر دنیا بھر کی حسینوں کا پتہ لگائیں کہ کون کس اعتبار سے بے نظیر ہے۔

نل نے اجازت دیدی۔ شاہی ہرکارے ہر روز عشق و حسن کی ایک نئی داستان لیکر حاضر ہوتے اور نل کی افسردگی دور کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ تو کسی اور دھن میں تھا۔

ایک روز کسی درباری نے آکر نل کو خبر دی کہ دکن میں دمن نام کی ایک حسینہ ہے جس نے اپنے حسن و جمال کی بدولت دنیا والوں کا صبر و سکون چھین لیا ہے۔

چشمش بہ نگاہ جادوانہ صد بتکدہ را نگارخانہ

اس کی جادو بھری آنکھیں دیکھنے والوں کو مسحور کرتی ہیں، اس کا جمال بتکدۂ چین کی زینت ہے۔

شیرین نمکین تکلمِ او شیرین تر از آن تبسمِ او

اس کی گفتگو شیریں بھی ہے اور ملیح بھی، لیکن اس کا تبسم تکلم سے زیادہ دلفریب ہے

جز آئنہ کس نسودہ دستش   جز سرمہ ندیدہ چشمِ مستش

آئینہ کے سوا اب تک کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے، سرمہ کے علاوہ
کسی نے اس کی مخمور آنکھوں کو نہیں دیکھا ہے۔

اس درباری نے کہا کہ بڑے بڑے بادشاہ اس حسینہ کے امیدوار ہیں لیکن اس کے خاندان والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پھول کو کس کے حوالے کریں۔

نل نے دمن کی تعریف و توصیف سنی تو گویا اس کے عشق کی آگ اور بھڑک اٹھی، اب وہ سمجھ گیا کہ اس کے دل پر کس کا تیر آن کر لگا ہے اور کس کے جادو نے اسے مسحور کر رکھا ہے وہ بے صبری سے بار بار دمن کی بات پوچھتا تھا، آخر اس درباری نے بتایا کہ دمن شاہ دکن کی لڑکی ہے۔

دمن کا ذکر سن کر نل کی آتش شوق تیز تر ہو گئی، کبھی وہ بے اختیار نعرہ مارتا اور کبھی دل پکڑ کر فریاد کرتا۔ عشق کا ایک شعلہ ہی جلانے کے لئے کافی تھا، یہ کیا ہوا کہ دمن نے میرے سارے وجود پر بجلی گرادی۔

نل کبھی کبھی دیوانوں کی طرح عشق کے حضور میں اپنا ہدیۂ تشکر پیش کرتا اور کہتا: اچھا ہوا جو عشق نے میرے دل میں اپنا نشیمن بنایا۔ یہ تخت و تاج، اور یہ جسم و جان سب عشق کی قربانگاہ پر فدا ہیں۔ عشق کی بدولت میرا مقدر جاگا ہے، اور میرا دامن پھولوں سے بھرا ہے۔

کبھی کبھی نل غائبانہ دمن سے باتیں کرتا۔

کای شمع بگانہ ام کجائی   آتش زن خانہ ام کجائی

اے میری بے نظیر محبوب تو کہاں ہے؟ میرے گھر کو آگ لگا کر تو کہاں جا چھپی؟

نادیدہ زدی بہ سینہ تیغم بیدرد، نیامدت دریغم

اس بیدردی کی کوئی حد بھی ہے کہ دیکھے بغیر تو نے میرا دل چاک کر دیا اور تجھے ذرا ترس نہ آیا۔

اس طرح نل کی آشفتگی دن بدن بڑھتی رہی۔

ادھر دمن کا یہ حال ہوا کہ اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی، وہ پریشان پریشان سی رہنے لگی۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس کے دل پر عشق کا وار ہو چکا ہے مگر اس کی ہر فریاد یا بے قراری نل کو اور بھی مضطرب کر دیتی تھی۔

آخر دمن کی دایہ کو اس کے دل کا درد معلوم ہو گیا، اس کے پیلے پیلے رخسار اور سونی سونی آنکھیں دیکھ کر ہر کوئی کہہ سکتا تھا کہ دمن کسی روحانی کرب میں مبتلا ہے۔ دایہ نے ایک روز بڑی شفقت سے پوچھا: یہ آجکل کیوں تیری بہار مائل بہ خزاں ہے، کیوں تیرے رخسار کے گلاب پیلے پڑتے جا رہے ہیں، اس بے قراری اور بیماری کا راز کیا ہے؟

دمن کا یہ حال دیکھ کر کنیزوں نے اس کی آرتی اتاری، جھاڑ پھونک کی مگر دمن کا حال نہ بدلنا تھا، نہ بدلا۔

آخر دمن کی ایک سہیلی نے اس کی ماں سے جا کر دمن کا حال بتایا کہ وہ کس طرح خلوت میں اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ رانی یہ خبر سن کر رو پڑی، اس نے راجا کو دمن کی بات بتائی۔ راجا نے اپنے وزیر کو بلا کر بیٹی کے عشق کا راز بتایا اور کہا میں عشق سے نہیں ڈرتا لیکن رسوائی اور بدنامی کو کون جھیلے گا۔ کیا خبر تھی کہ ہمارا شاہی خاندان ہی عشق کی لپیٹ میں آجائیگا

درباریوں نے راجا کو تسلی دی اور کہا: خدا نے ہر درد کی دوا بنائی ہے ۔ دمن کی بیماری کا علاج یہ ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

راجا اور رانی نے خلوت میں دمن کو سمجھایا اور اس سے پوچھا تو کس وجہ سے اندر ہی اندر گھل رہی ہے، لیکن ماں باپ کی نصیحت سے دمن کی آتش عشق خاموش نہ ہوئی، وہ دن بدن خفا زندگانی سے ہونے لگی۔

ادھر نل کی بیقراری کا بھی وہی حال تھا۔ ایک روز وہ گھبرا کر محل سے باغ میں آیا کہ شاید پھولوں کی سیر سے کچھ طبیعت بہلے۔ وہ پھولوں کی کیاریوں میں ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا کہ اچانک چڑیوں کا ایک جھنڈ سراندیپ کی طرف سے آکر وہاں اترا۔ نل نے ایک غلام سے کہا جال ڈال کر چڑیوں کو پکڑ لو۔ غلام نے جال پھینکا لیکن ایک چڑیا کے سوا سب کی سب اڑ گئیں غلام اس پرندے کو قفس میں رکھ کر نل کے سامنے لایا۔ اچانک وہ پرندہ بول اٹھا کہ اے نل مجھے چھوڑ دے، جانے دے، میرا جوڑا اڑ گیا، میں یہاں اس کی جدائی میں تڑپ رہا ہوں۔ مجھے رہا کر دے، شاید میں کسی دن تیرے کام آؤں۔

نل نے کہا: تو کب میرے کام آئے گا، میرے دل بیتاب کا علاج بھی تیرے پاس ہے؟

پرندہ بولا: میں نے ہر محل میں تیرے عشق کی باتیں سنی ہیں، مجھے معلوم ہے تیرا دل کہیں اٹکا ہوا ہے، تو اگر خط لکھ کر دے تو میں اسے تیرے دلبر تک پہونچا سکتا ہوں۔

چنانچہ نل نے وہیں نہر کے کنارے بیٹھ کر دمن کے نام ایک خط لکھا اور اسے لپیٹ کر پرندے کے بازو میں باندھ دیا۔

پرندہ نل کا خط لے کر اڑا اور جنگل بیابان طے کرتا ہوا دمن کے محل پر پہونچا۔ وہاں

چھت پر بیٹھ کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیکھا دمن چمن میں ٹہل رہی ہے۔ پرندہ اڑ کر نیچے آیا اور دمن کے سامنے سبزہ پر بیٹھ گیا۔ دوسرے پرندے بھی زمین پر آکر وہیں بیٹھ گئے۔ دمن اتنی ساری چڑیوں کو دیکھ کر مبہوت ہوگئی، لیکن اور ساری چڑیاں تو اڑ گئیں، البتہ وہ پرندہ اکیلا رہ گیا۔ دمن اور اس کی سہیلیوں نے اسے پکڑنا چاہا۔ پرندہ بچتا بچاتا دور نکل گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب دمن کے علاوہ کوئی نہیں ہے تو وہ بول پڑا کہ میں پرندہ نہیں بلکہ عشق کا پیغام رساں ہوں، دیکھ میرے بازو میں کیا بندھا ہے۔

یہ کہہ کر وہ پرندہ دمن کے ہاتھ پر آبیٹھا، دمن نے نل کا خط کھولا، اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھا، ہر لفظ شدت عشق سے سرشار تھا۔

خط پڑھ کر دمن اس کا جواب لکھنے بیٹھی، اس نے اپنے عشق کا اعتراف اور زمانہ کی بے رحمیوں کا شکوہ کیا، دمن نے لکھا کہ اگر یہی حال رہا تو بہت جلد میں اس دنیا سے چل بسوں گی۔

خط لکھ کر دمن نے اپنے سر سے ایک بال توڑا اور اس کے ساتھ خط کو پرندے کے بازو میں باندھ دیا۔ پرندہ خط لے کر نل کے پاس پہونچا اور کہا مبارک ہو، محبوب سے جلد ہی ملاقات ہونے والی ہے۔

ادھر دمن کے باپ کو جب معلوم ہوا کہ بیٹی نے نل کو عاشقانہ خط لکھا ہے تو اس نے اپنے درباریوں سے کہا کہ اب دنیا کے دستور کے مطابق فوراً اس لڑکی کی شادی کر دینا چاہیئے۔

قدیم ہندوستان میں یہ رسم تھی کہ شاہی خاندان کی کسی شہزادی کی جب شادی ہونے والی ہوتی تو راجا تمام شہروں میں منادی کراتا تھا کہ فلاں روز سویمبر کا جشن ہوگا،

جو شخص بھی لڑکی کا خواہشمند ہے جشن میں شریک ہو، بادشاہ اور شہزادے جشن میں شریک ہوتے اور صف میں کھڑے منتظر رہتے، لڑکی ریشمی لباس پہنے اور ہاتھ میں پھول مالا لئے ہوئے حرم سے باہر آتی اور ان کے سامنے سے گذرتی اور جو شخص اسے پسند آتا اس کے گلے میں مالا ڈال دیتی اور اسے اپنا شوہر بنا لیتی۔

دکن کے راجا نے بھی اپنی لڑکی کے لئے ایک اچھے دن سویمبر کا اہتمام کیا اور چاروں اور برہمنوں کو بھیج کر راجاؤں اور راجکماروں کو اطلاع دی کہ کماری دمن کا فلاں روز سویمبر ہونے والا ہے۔

سویمبر کا اعلان سن کر نل بھی دکن کے لئے روانہ ہوا۔ بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا اور نل کی دیوانگی اور چمک اٹھی تھی۔ وہاں پہونچا تو محفل میں تین جن بھی نل کا روپ بنائے براجمان تھے ان میں سے ہر ایک دمن پر عاشق تھا اور اس بہروپ کے ذریعہ اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔
سویمبر کی رسم شروع ہوئی۔ دمن پھول مالا لئے ہوئے اندر سے باہر آئی، راجاؤں اور راجکماروں کے سامنے سے گذرتی ہوئی نل کے پاس پہونچی تو دیکھا وہاں ایک کے بجائے چار نل بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اصلی نل کون ہے۔
اتنے میں دمن کو برہمنوں کی بتائی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ جن بھوت کبھی پلک نہیں جھپکاتے زمین پر پاؤں نہیں رکھتے اور ان کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا۔ اب دمن نے ایک ایک کر کے چاروں کا جائزہ لیا تو اصلی نل کا پتہ چل گیا۔ وہ گلاب کی طرح مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور اس کی گردن میں پھول مالا ڈال دی۔ اور اس طرح نل اور دمن میاں بیوی ہو گئے۔ انھوں نے وہاں چند روز عیش و طرب میں گذارے اور پھر نل اپنی دلھن کو لے کر اپنی راجدھانی لوٹا۔ وہاں ان کی زندگی میں خوشی ہی خوشی تھی۔ خدا نے انھیں دو اولاد بھی دی، ایک لڑکا اور ایک لڑکی

اس دنیا کی یہی رسم ہے کہ انسان ہمیشہ خوشی اور مسرت کی زندگی نہیں گذارتا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد تقدیر اپنا کرشمہ دکھاتی ہے اور غم کے بادل سر پر منڈلانے لگتے ہیں۔ نل کا بھی یہی حال ہوا اور اچانک اس کی خوشیوں کا دور ختم ہوگیا۔

دمن کے سوئمبر میں جو تین جن آئے تھے، ان میں سے ایک اپنی ناکامی کو برداشت نہیں کر سکا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو نل سے اس ناکامی کا انتقام لے کر رہے گا۔ چنانچہ وہ نل کے پیچھے پڑ گیا۔

جن لگنے کے بعد نل کا یہ حال ہوا کہ اس نے سلطنت کا سارا کام اپنے چھوٹے بھائی کو سونپ دیا اور خود شب و روز قمار بازی میں غرق ہوگیا۔ اس نے اپنا سارا خزانہ جوئے میں لٹا دیا۔ نل دیوانہ ہو رہا تھا، اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن خطرناک راہوں پر جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھی چالاک اور ہوشیار تھے۔

درباریوں نے نل کو سمجھایا مگر عقل کہاں تھی جو اسے سمجھ میں آتا، آخر کار وہ اپنا سارا خزانہ چھوٹے بھائی کو ہار گیا اور ایک روز سب کچھ لٹا کر محل سے نکل آیا اور جنگل کی طرف چل پڑا۔ دمن اس کے ساتھ ساتھ تھی، دونوں جنگل بیابان میں مارے مارے پھرتے رہے۔ اپنے کئے پر افسوس کرتے تھے، اور زمانے کی بے رحمی کا شکوہ کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ خالی تھے اور دل غم و غصہ سے بھرے ہوئے۔ تیسرے دن بھوک سے نل اور دمن کا حال خراب ہوگیا۔ دونوں بھوک سے غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

اتنے میں نل کو ایک پرندہ دکھائی دیا۔ نل نے اپنا کرتا اتار کر اس پر پھینکا تاکہ اسے پکڑ کر اپنی بھوک مٹا سکیں۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے پرندہ کرتا سمیت اڑ گیا اور نل ننگا رہ گیا۔ اسی عالم بیچارگی میں نل اور دمن ادھر ادھر گھومتے رہے۔ آخر تھک ہار کر ایک درخت

کے سایہ میں بیٹھے. نل نے دمن سے التجا کی کہ خدارا اپنے میکے چلی جائے اور اس سے زیادہ مصیبت نہ جھیلے. اگر دوبارہ قسمت نے ساتھ دیا تو ممکن ہے ہم پھر ملیں.

لیکن دمن نے نل کی بات نہیں مانی اور بولی: دکھ ہو یا خوشی، میں ہر حال میں تیری رفیق ہوں، جب میں نے عشق اختیار کر لیا تو ماں باپ سے کیا واسطہ، مانا تیرے بغیر آرام سے جی لوں گی مگر ایسی زندگی سے کیا ملے گا؟

ایک رات چاندنی چھٹکی ہوئی تھی. نل کو نیند نہیں آرہی تھی، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روپہلی چاندنی میں اسے دمن کا چہرہ بہت خوبصورت لگا۔ اس کو اپنی جان تمنا کی اس بیچارگی پر بڑا ترس آیا۔ اس نے سوچا دمن کی بدبختی کا سبب میں ہوں، اس کا علاج یہی ہے کہ اس کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں. دمن اکیلی ہو جائے گی تو خود ہی اپنے ماں باپ کے پاس لوٹ جائے گی، یہ سوچ کر نل نے دمن کی آدھی ساڑی پھاڑی، اپنے جسم پر لپیٹی اور بیوی کو سوتا ہوا چھوڑ کر وہاں سے چل دیا۔

دمن کی آنکھ کھلی تو دیکھا تنہا ہے، نل کا کہیں پتہ نہیں تھا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آیا۔ اس نے پوری طاقت سے نل کو آواز دی، ادھر ادھر دوڑی پھری مگر کہیں نل کا پتہ نہیں چلا۔

دمن پر کیا بیتی، یہ صرف اسی کو معلوم تھا، اس کی فریاد ساری فضا میں گونج رہی تھی، نل، نل پکارتے ہوئے وہ چلی جارہی تھی، اسے نہ دن کو چین تھا اور نہ رات کو آرام۔ چلتے چلتے اچانک اس پر ایک زہریلے سانپ نے حملہ کیا مگر دمن بال بال بچ گئی، ایک صیاد نے بڑھ کر اس کو بچا لیا، اس نے کلہاڑے سے سانپ کو مار دیا مگر مرتے مرتے سانپ نے اس صیاد کو کاٹ لیا اور وہ بیچارہ دمن کی جان بچا کر خود جاں بحق ہو گیا۔

دمن کو اس مصیبت سے نجات تو مل گئی مگر آنسو اور آہیں اس کا ساتھ کب چھوڑتی تھیں، وہ بدقسمتی کا ماتم کرتے ہوئے چلی جارہی تھی یہاں تک کہ شیروں کی کچھار میں پہونچ گئی،

وہاں پہونچ کر دمن نے سوچا کاش کوئی شیر مجھے کھا جاتا اور اس دردبھری زندگی سے نجات دیدیتا، مگر دُبلی پتلی بھوک کی ماری دمن کو کسی شیر نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

دمن یونہی گرتے پڑتے چلی جارہی تھی، وہ ہر آنے جانے والے سے نل کا پتہ پوچھتی تھی، اچانک وہ ایک مندر میں پہونچی، وہاں چند سفید پوش سادھو بیٹھے تھے، دمن نے ان سے بھی نل کے بارے میں پوچھا، انھوں نے دمن کو تسلی دی اور کہا خدا نے چاہا تو نل ضرور تجھے مل جائے گا۔ بس یونہی تلاش کرتی رہ، بھگوان نے چاہا تو ایک دن تیری مراد برآئے گی۔

دمن وہاں سے چلی تو ایک بڑے شہر میں پہونچی، وہاں بہت ساری فوج پڑی ہوئی تھی، دمن وہاں سے گھبرا کر آگے بڑھی، راستے میں ندی تھی، جب وہ ندی پار کررہی تھی تو فوج کا سپہ سالار اس کے پاس آیا اور اس کی پریشانی کا سبب پوچھا۔

دمن نے اپنی دردناک داستان سنائی، سپہ سالار نے کہا ہمارا راجا بڑا دیالو ہے، اس کے پاس چل، وہ ضرور تیری مدد کرے گا اور تجھے تیرے شہر تک پہونچادے گا۔

دمن سپاہیوں کے ساتھ چل پڑی۔ چلتے چلتے وہ لوگ ہاتھیوں کے جنگل میں پہونچے، رات ہوگئی تھی، فوج نے وہیں پڑاؤ کیا، رات کو مست ہاتھیوں نے فوج پر حملہ کردیا ساری فوج تتر بتر ہوگئی دمن چند برہمنوں اور سپاہیوں کے ساتھ ایک طرف بھاگ نکلی۔

چلتے چلتے یہ لوگ راجا کی راجدھانی میں پہونچے۔ راجا کی نظر دمن پر پڑی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ پژمردہ لڑکی کسی زمانے میں جوانی اور خوبصورتی سے سرشار تھی، اس نے بڑی مہربانی سے دمن کا حال پوچھا، دمن نے اپنا حال بتایا تو راجا نے کہا: میرے ایک ہی بیٹی ہے، تو اس کی سہیلی بن جا، یہیں میرے محل میں رہ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے کھوئے ہوئے شوہر کو ضرور تلاش کرکے لاؤں گا۔ راجا نے دمن کی خدمت کے لئے ایک کنیز کو مقرر کردیا۔

ادھر نل کا حال سنو، وہ دمن کو سوتا ہوا چھوڑ کر جلدی جلدی چل دیا۔ اسے دمن کی جدائی اور اپنی بے وفائی کا ملال تھا۔ وہ جنگل بیابان طے کرتا ہوا چلا جا رہا تھا، اچانک اس کی نظر ایک سانپ پر پڑی جو آگ کے شعلوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے رہا تھا، نل اس کے نزدیک گیا تو سانپ نے کہا: میں نے ایک بار ایک برہمن کو کاٹ لیا تھا، اس نے مجھے شراپ دیدیا، اب میں اس آگ میں جھلستا رہتا ہوں، نہ مرتا ہوں اور نہ جیتا ہوں، اگر تو مجھے اس آگ سے نکال دے تو مجھے از سرِ نو زندگی مل جائے گی۔

نل نے آگے بڑھ کر سانپ کو باہر نکالا۔ اس نے نل سے کہا: ایک سے دس تک گن۔ جیسے نل نے دس کہا سانپ نے اسے ڈس لیا۔ سانپ کے ڈستے ہی نل کا رنگ کالا پڑ گیا۔ نل بہت پریشان ہوا لیکن سانپ نے کہا: گھبرا نہیں، رنگ کالا ہو جانے سے تجھے فائدہ رہے گا۔ جب تک تجھ پر بد قسمتی کا دورہ ہے، تیرا رنگ کالا رہے گا تاکہ کوئی تجھے پہچان نہ سکے لیکن جب مصیبت کے دن ختم ہو جائیں گے تو میں خود آ کر تیرا کالا پن ختم کر دوں گا۔ اس کے بعد سانپ نے نل سے کہا کہ آج سے تیرا نام نل کے بجائے باہک ہوگا۔ یہاں سے تھوڑی دور رت برن نام کا ایک راجا راج کرتا ہے بڑا سخی ان داتا ہے، تو اسی طرح اس کے دربار میں جا، ہو سکتا ہے وہ تیری مشکل کا حل نکالے۔ میرے چمڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے پاس رکھ لے، جب ضرورت پڑے اسے آگ میں ڈال دینا، میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔

نل اسی عالم میں رت برن کے دربار کو چلا۔ راجدھانی میں پہونچا تو دیکھا بڑا ابھرا ہوا اور شاندار شہر ہے، وہاں کا قاعدہ یہ تھا۔ جو شخص بھی شہر میں آتا تھا، شاہی نقاش اس کی تصویر بنا کر فوراً راجا کے سامنے پیش کرتا تھا۔ نل کی تصویر راجا کے سامنے پیش کی گئی تو راجا نے اسے اپنے پاس بلایا، اس کا نام اور کام پوچھا، نل نے کہا: غریب ہوں، مصیبت کا مارا، مفلس اور

پردیسی ہوں البتہ گھوڑوں کی شناخت اور نقاشی میں بے نظیر ہوں۔ اس کے علاوہ اور ہنر بھی جانتا ہوں مگر افسوس کہ بدقسمتی نے سب پر پانی پھیر دیا ہے۔

راجا کو نل کی بیچارگی اور دربدری پر ترس آیا، اس نے اسے اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا نل دن کو راجا کے زیرِ سایہ آرام کرتا اور رات کو دمن کی جدائی میں برہ کے گیت گاتا۔ اس کے ساتھی اسے تسلی دیتے اور صبر کی تلقین کرتے۔

دمن کے باپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ نل اس کی بیٹی کو جنگل بیابان میں تنہا چھوڑ کر خود لاپتہ ہو گیا ہے تو اس کا چین آرام جاتا رہا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور انھیں دمن کی تصویر اور بہت سا روپیہ دے کر چاروں طرف دمن کی تلاش میں بھیجا۔ یہ لوگ شہر شہر اور دیہات دیہات گھومتے تھے اور دمن کا پتہ پوچھتے تھے۔ ان برہمنوں میں سیرلو نام کا ایک شخص تھا۔ تلاش کرتے کرتے وہ ملک سبارو پہونچا اور وہاں کے شاہی محل کے پاس سستانے کے لئے رکا۔ اتنے میں اس نے دیکھا چند برہمن بید پڑھتے ہوئے چلے آرہے ہیں اور دمن ان کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس نے فوراً دمن کو پہچان لیا اور بڑھ کر اس کا حال پوچھا، دمن بھی اپنے باپ کے بھیجے ہوئے آدمی کو پہچان گئی، اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے گھر والوں کی خیریت پوچھی، برہمن نے کہا کہ تیری جدائی میں سب کا حال خراب ہے۔

دمن کے ساتھ جو کنیز تھی اس نے محل میں جا کر رانی کو سارا حال بتایا۔ رانی نے دمن کو بلوایا اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دمن شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ رانی نے دمن سے پوچھا: اصل ماجرا کیا ہے مگر دمن نے یونہی ٹال دیا۔ آخر رانی نے برہمن سے پوچھا تو برہمن نے نل کی جوئے بازی اور دشت و بیابان میں اس کی آوارگی کی کہانی سنائی۔

یہ سن کر رانی اٹھی اور اس نے بے اختیار ماں کی طرح دمن کو لپٹا لیا اور رو رو کر اپنا

سارا لباس تر کر لیا۔ پھر رانی نے بتایا کہ دراصل میں دمن کی خالہ ہوں اور یہ میری بھانجی ہے۔

دمن بھی رو پڑی۔ رانی نے اسے چند دن اور اپنے پاس مہمان رکھا اور اس کے بعد پوری شان وشوکت کے ساتھ اسے ماں باپ کے پاس روانہ کیا۔ دمن گھر پہونچی تو ماں نے والہانہ بڑھ کر اسے بھینچ لیا۔ کچھ دن نازونعمت میں رہنے سے دمن کی صحت بحال ہوگئی لیکن نل کی جدائی کا داغ رہ رہ کر اسے تڑپاتا تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دمن نے ایک روز اپنی دایہ سے کہا کہ اس کے درد کا کوئی مداوا کرے۔ دایہ نے وعدہ کیا وہ ضرور اپنی راجکماری کی مدد کرے گی اور اس کے کھوئے ہوئے شوہر کو ڈھونڈھ نکالے گی۔

دایہ نے یہ بات دمن کی ماں کو بتائی، ماں نے اس کے باپ کو سارا حال کہہ سنایا۔ باپ نے پھر چاروں طرف برہمنوں کو دوڑایا کہ نل کا پتہ لگاؤ۔

برہمن ہر طرف چل پڑے۔ ان میں سے پرنا دنام کا ایک برہمن اتفاق سے رت برن کے ملک میں جا پہونچا۔ وہ رات کو بتخانہ میں عبادت کرتا اور دن کو شہر میں نل کی جستجو کرتا۔

ایک دن اس برہمن نے دیکھا چند مصیبت زدہ لوگ جمع ہیں اور ان میں ایک کالا آدمی بیٹھا اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ برہمن نے بڑھ کر اس کا نام پوچھا تو وہ بولا میرا نام باہک ہے۔ میں یہاں کے راجا کا نوکر اور حالات کا مارا ہوا ہوں۔

برہمن کو کچھ شبہہ ہوا۔ اس نے واپس جا کر دمن کے باپ کو ساری بات بتائی۔ دمن نے سنا تو اپنا سر پیٹ لیا کہ باہک اور کالے پن سے نل کا کیا تعلق۔

یہ معما کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر دمن نے اس برہمن سے کہا کہ رت برن کے شہر میں جا کر فوراً اعلان کر دے کہ دو روز بعد بیدر شہر میں ایک جشن ہو رہا ہے، وہاں کا راجا اپنی بیٹی دمن

کا دوبارہ سویمبر کر رہا ہے ۔

برہمن نے پوچھا : اس اعلان کا کیا مطلب ہے ؟

دمن بولی : اس سے اصلی نل کا پتہ چل جائے گا۔ کیونکہ اتنی دور سے صرف نل گھوڑے پر پہونچ سکتا ہے ، کوئی اور نہیں ، اس وقت اس راز سے پردہ اٹھ جائے گا ۔

برہمن فوراً رت برن کے دربار میں لوٹا اور راجا سے بولا : آج صبر کا دن نہیں ، اٹھئے اور بیدر پہونچیے اور وہاں کی حسینہ کو لاکر اپنے محل کی زینت بنائیے ۔

رت برن نے نل کو بلوایا اور کہا : بیدر میں سویمبر ہو رہا ہے ، چلو فوراً وہاں چلیں ، دوسری جگہوں سے بھی راجا مہاراجا آرہے ہیں ورنہ دمن ہمارے ہاتھ سے جاتی رہے گی ۔

نل دمن کا نام سن کر چونکا ۔ اسے یقین ہو گیا کہ دمن اس ترکیب سے اس کو اپنے پاس بلانا چاہتی ہے ۔ اس نے راجا سے کہا : سرکار کے اصطبل میں آندھی طوفان کی طرح گھوڑے موجود ہیں ، وہ رات کی تاریکی میں بھی اسی تیزی سے دوڑتے ہیں جیسے دن کی روشنی میں ۔ ہم ضرور وقت پر پہونچ جائیں گے ۔

یہ کہہ کر نل اصطبل میں گیا اور دو لاغر تیز رفتار گھوڑے لے آیا ۔ راجا نے کہا یہ گھوڑے دبلے ہیں ، شاید ہمیں وہاں تک نہ پہونچا سکیں ، ذرا موٹے تازے گھوڑے لے آؤ ۔

نل نے کہا : اس سے عمدہ گھوڑے نہیں مل سکتے ۔ چنانچہ راجا اور نل روانہ ہوئے ۔

نل ایسی تیزی سے جا رہا تھا جیسے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو ۔ ایک جگہ راجا کی چادر اس کے کندھے سے سرک کر گر گئی مگر نل نہیں رکا ۔

چلتے چلتے راجا رت برن نے نل سے کہا : میں بغیر گنے ہوئے یہ بتا سکتا ہوں کہ کس درخت میں کتنی پتیاں ہیں ، نل نے کہا : خدارا مجھے بھی یہ فن سکھا دیجئے ۔

رات بھر نل اور رت برن چلتے رہے، صبح کو نل کو یہ آسمانی بشارت سنائی دی کہ دمن سے اس کا ملن یقینی ہے۔ تب اس نے اور بے تابی سے گھوڑا دوڑایا۔

دمن اس روز صبح سے شام تک بالاخانہ پر بیٹھی راستے پر نظریں لگائے ہوئے تھی۔ آخر نل اور راجا شہر پہونچ گئے مگر وہاں انھیں سویمبر کی کوئی نشانی نہیں دکھائی دی۔ دمن کے باپ کو راجا رت برن کے اچانک آنے پر بہت تعجب ہوا مگر وہ بھی کیا کرتا، اس نے راجا کو مہمان کیا اور شاہانہ انداز میں اس کی خاطر تواضع کی۔

ادھر دمن کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ کالے باہک کا اصلی نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا، آخر اس نے دایہ کو باہک کے پاس بھیجا۔ اور اسے اپنے پاس بلوایا۔ دمن نے نل سے سوال جواب شروع کیا:

گفتا کہ تنت چرا سیاہ است   گفتا شب بخت عذر خواہ است

دمن نے نل سے پوچھا، تیرا بدن سیاہ کیوں ہے؟ نل نے کہا اس کا جواب میری بدبختی سے پوچھ

گفتا کہ شود جدا ز دلدار   گفت آن کہ جنون شود بہ ادبار

دمن نے کہا کون اپنے دلبر کو چھوڑ کر چل دیتا ہے؟ نل نے کہا وہی جو دیوانہ و مجنون ہوتا ہے۔

گفت از رہ عقل چون شدی گم   گفتا ز فسون دیو مردم

دمن بولی، آخر تو نے عقل و ہوش کیوں گنوائے۔ نل نے کہا: مجھے شیطان نے بہکایا تھا۔

گفتش کہ چنین خراب چونی   گفتا ز خرابی درونی

دمن نے کہا تو اتنا تباہ حال کیوں ہے؟ نل نے کہا یہ دل کا مرض ہے

باتوں باتوں میں دونوں ایک دوسرے کو سمجھ گئے، دل کی بات زبان تک آگئی اور بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق مل گئے۔

چنانچہ ایک شاندار جشن کا اہتمام ہوا۔ نل اور دمن خوش قسمتی کی چھاؤں میں پھر عیش و طرب میں کھو گئے۔

صبح کو نل نے سانپ کا تھوڑا سا ٹکڑا آگ میں ڈالا اور منتر پڑھا۔ اچانک ایک کالا ناگ پھنکارتا ہوا پہونچا، اس نے نل کے قریب پہونچ کر اس کے جسم سے سارا زہر چوس لیا اور نل پھر پہلے کی طرح گورا چٹا نکل آیا۔

رت برن کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اسے بیحد تعجب ہوا۔ اس نے نل سے بہت معافی تلافی مانگی۔ نل نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔

ایک روز نل اور رت برن شہر سے باہر گئے۔ نل نے اسے گھوڑوں کی شناخت کے گر بتائے اور اس سے قمار بازی اور جادو منتر کا فن سیکھا۔ اب اسے یہ فکر ہوئی کہ اپنا تخت واپس لینا چاہیئے۔ دمن کے باپ نے بھی فوج و خزانہ کے ساتھ اسے روانہ کیا۔

نل فوج و لشکر کے ساتھ اپنے ملک روانہ ہوا۔ اس کے سر پر دولت و اقبال مندی کا سایہ تھا، جب وہ اپنے بھائی کے پاس پہونچا تو بولا: میں تیرے ساتھ دوبارہ ایک داؤ اور کھیلنا چاہتا ہوں۔

شہر کے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ جوئے کی بساط بچھی، نل نے منتر پڑھ کر پانسہ پھینکا اور پہلے ہی ہاتھ میں سب کچھ جیت گیا، لیکن اس نے بھائی سے صلح کرلی۔ اس کو اپنے بیٹے کی طرح مان لیا، بہت ساری جاگیر دے کر اسے رخصت کیا اور خود دوبارہ تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

داستان نہ منظر

صدیوں سے ایرانی داستان گو چائے خانوں اور چوپالوں میں بیٹھ کر ایسی داستانیں بیان کرتے آئے ہیں جنھیں لوگ ذوق و شوق سے سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ مندرجہ ذیل داستان بھی ایران کی مقبول عام داستانوں میں سے ہے۔ یہ داستان نویں صدی ہجری کے ایک مخطوطہ سے نقل کی گئی ہے۔



داستانِ منظر

دربند شہر میں گرگین نام کا ایک بادشاہ تھا۔ وہ انصاف پسند اور رعیت پرور تھا اس کے عہدِ حکومت میں بستیاں آباد اور لوگ آسودہ حال تھے۔ بادشاہ کو بھی اگر کوئی غم تھا تو صرف اولاد کا۔ آخر بہت نذر نیاز اور دعا تعویذ کے بعد بادشاہ کے گھر میں اولاد کی امید بندھی۔

اسی دوران گرگین ایک روز شکار کھیلنے گیا، وہاں ایک جنگلی سور نے حملہ کرکے اس کو اتنا زخمی کر دیا کہ پھر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ مرنے سے پہلے بادشاہ نے اپنے دو وزیر فارس بہرام اور فرخ بہزاد کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہا: میری ملکہ کے بچہ ہونے والا ہے، اگر لڑکا ہو تو بڑا ہونے پر یہ تخت و تاج اس کے حوالے کرنا اور اگر لڑکی ہو تو پھر میرا جانشین فرخ بہزاد ہوگا جو عقل و دانش میں دوسرے امراء سے برتر ہے۔

وزیروں نے بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ آپ کی وصیت حرف بہ حرف پوری کی جائے گی گرگین کا انتقال ہوا تو انھوں نے تمام رسوم کے ساتھ اس کی موت کا سوگ منایا اور اس کی جگہ فرخ بہزاد کو تخت پر بٹھایا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ فرخ بہزاد نے اسی طرح عدل و انصاف کو اپنا شیوہ بنایا۔ لیکن ایک دن وہ سوچنے لگا کہ اگر خدا نخواستہ بادشاہ کے یہاں لڑکا ہوا تو گرگین کی وصیت کے مطابق اس تاج و تخت کا وہی وارث ہوگا اور مجھے اس کی چاکری کرنا ہوگی۔ کیوں نہ گرگین کی ملکہ ہی کو ختم کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

چنانچہ اس نے دوسرے وزیر فارس بہرام کو بلایا اور اس سے اپنے من کی بات کہی۔ فارس بہرام نے بادلِ ناخواستہ فرخ کی بات مان لی اور اپنے چند معتبر غلاموں کو حکم دیا کہ ملکہ کو کہیں دور لے جا کر ختم کر دیں۔

غلام ملکہ کو جنگل میں لے گئے اور وہاں اسے ٹھکانے لگا کر واپس لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد فارس بہرام وہاں پہونچا تو اس نے دیکھا ملکہ مر چکی ہے مگر اس کے پہلو میں ایک نوزاد پڑا رو رہا ہے۔ بہرام کو بچہ پر ترس آیا، چنانچہ اس نے ملکہ کے لباس میں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر بچہ کو اس میں لپیٹا اور ایک کاغذ پر سارا ماجرا لکھ کر چند دانے جواہرات کے ساتھ بچہ کی گردن میں باندھ کر چلتا بنا۔

بہرام لوٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں میں سے دو شیر نکلے اور ملکہ کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیر تو آگے بڑھ کر ملکہ کی لاش کو کھانے لگا مگر شیرنی کو بچہ پر ترس آیا اور وہ اسے دودھ پلانے لگی اس کے اپنے بھی دو بچے تھے۔ بہرحال خدا کو یہی منظور تھا کہ گرگین بادشاہ کا بیٹا اسی طرح زندہ رہے۔ وہ شیرنی کا دودھ پیتا، شیروں کی پیٹھ پر سوار ہوتا اور اس طرح بڑا ہوتا رہا۔

انھیں دنوں بغداد میں خواجہ اسد نام کا ایک تاجر رہتا تھا جس کے پاس دولت اور نوکر چاکر کی کمی نہیں تھی۔ ایک دن وہ اپنے نوکر چاکر کے ساتھ تجارت کے لئے کہیں جا رہا تھا اتفاق سے اس کا گذر اسی جنگل سے ہوا۔ وہاں کی ہریالی دیکھ کر خواجہ اسد نے کہا تھوڑی دیر یہاں دم لے لیں، پھر آگے بڑھیں۔

خواجہ کے غلاموں نے سوچا اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ذرا شکار کر لیں لیکن جیسے ہی وہ جنگل میں پہونچے شیر نے ان میں سے ایک کو آدبوچا۔ دوسرے غلام بھاگ کر اپنے آقا کے پاس آئے اور اسے ساری روداد سنائی۔ خواجہ اسد نے اپنے آدمیوں کے ساتھ جا کر شیر اور اس کے دونوں بچوں کو مار دیا۔ اتنے میں اس کی نظر گرگین کے بیٹے پر پڑی جو شیروں کی کچھار میں موجود تھا خواجہ نے دیکھا لڑکے کی گردن میں ایک کاغذ بندھا ہے۔ کاغذ کو کھولا تو اس میں سے جواہرات

کے چند دانے نکلے، اور معلوم ہوا کہ یہ لڑکا دراصل گرگین بادشاہ کا بیٹا ہے۔ خواجہ اسد لڑکے کو ساتھ لے کر لوٹا۔ لیکن لڑکا شیرنی سے اتنا ہل گیا تھا کہ بار بار اس کے لئے تڑپتا تھا۔ شیرنی بھی دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔

خواجہ اسد نے اس لڑکے کا نام شیرزاد رکھا اور اسے اپنی بیوی کے حوالے کیا۔ اتفاق سے خواجہ کی بیوی کے کوئی بچہ نہیں تھا، اس خاتون نے پوری لگن سے شیرزاد کی تربیت کی۔ جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اس کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ شیرزاد نے اپنی غیر معمولی ذہانت کی بدولت جلد ہی بہت ساری چیزیں سیکھ لیں۔ جب اس نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو وہ تیراندازی، شہ سواری اور چوگان بازی میں سارے علاقہ میں مشہور ہو چکا تھا۔

ادھر فرخ بہزاد کو اب کوئی خدشہ نہیں تھا، ملکہ کی موت کے بعد اس کے راستہ کا کانٹا صاف ہو چکا تھا، اتفاق سے خدا نے اسے چاند سی ایک بیٹی عنایت کی جس کا نام گلشاد تھا۔ لڑکی کی دیکھ بھال کے لئے کئی ایک کنیزیں مقرر تھیں۔ گلشاد بڑی ہوئی تو اس نے بھی بہت سارے علوم و فنون سیکھے اور خاص طور پر علم نجوم میں مہارت بہم پہونچائی

ایک دن فرخ بہزاد نے حکم دیا کہ اس کی بیٹی کے لئے ایک خوبصورت محل تعمیر کیا جائے چین سے ایک ماہر مہندس کو بلایا گیا۔ اس نے محل کے لئے ایک ایسا علاقہ منتخب کیا جہاں کی آب و ہوا لاجواب تھی، اور وہاں باغ فردوس کے نام سے ایک باغ لگایا جس کی لمبائی چوڑائی ایک ایک فرسنگ تھی۔

باغ میں ایک خوبصورت قصر تعمیر کیا گیا۔ قصر میں نو برج تھے اور ہر برج ایک سیارہ کی طرف کھلتا تھا۔ پہلا قمر کی طرف، دوسرا عطارد کی طرف، تیسرا زہرہ کی طرف، چوتھا آفتاب کی طرف پانچواں مریخ کی طرف، چھٹا مشتری کی طرف، ساتواں زحل (سنیچر) کی طرف، آٹھواں ثوابت کی طرف،

اور نواں فلک الافلاک کی طرف ۔

محل مکمل ہوگیا تو فرخ بہزاد نے اسے اپنی بیٹی کو پیش کیا۔ گلشاد نے وہاں زندگی گذارنی شروع کی۔ وہ علم نجوم کے مطابق ہر روز ایک مخصوص برج میں بسر کرتی تھی، ساتھ ہی تیسرے چوتھے کنیزوں کے ہمراہ شکار کو نکل جاتی تھی ۔

ادھر خواجہ اسد اور شیرزاد کا حال سنئے۔ ایک دن خواجہ کے یہاں چند تاجر آئے اور انھوں نے باغ فردوس کی تعریف شروع کی۔ ان کی دلچسپ باتیں سن کر شیرزاد کو یہ اشتیاق ہوا کہ چل کر اس باغ کا نظارہ کیا جائے۔ اس نے خواجہ اسد سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ خواجہ تجارت کی غرض سے دربند کی اور چل پڑا۔ یہ قافلہ شہر کے نزدیک پہونچا تو ایک پرفضا جگہ پر دم لینے کے لئے اترا۔ شیرزاد ساتھیوں کو لے کر شکار کے لئے چل دیا۔ ادھر سے گلشاد اپنی کنیزوں کے ساتھ آرہی تھی۔ اس نے یہ قافلہ دیکھا تو اپنے خواجہ سرا کو بھیجا کہ جاکر معلوم کرے کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں ۔

خواجہ سرا شیرزاد کے پاس پہونچا تو اس کے حسن وجمال کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے شہزادی کا سلام پہونچایا، باغ فردوس کی تعریف وتوصیف کی اور ضمناً شیرزاد کا نام پتہ پوچھا۔ لیکن جب وہ واپس ہوا تو اس نے گلشاد سے شیرزاد کے حسن وجمال کی اس طرح تعریف کی کہ شہزادی دل دے بیٹھی۔ وہ محل لوٹی تو رات بھر شیرزاد کا خیال اسے ستاتا رہا۔ ادھر شیرزاد بھی بن دیکھے گلشاد پر فریفتہ ہوگیا اور ساری رات اس کی یاد میں کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی تو گلشاد نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ چلو صحرا میں چل کر خیمہ لگائیں اور شراب و شعر سے دل کا بوجھ ہلکا کریں، لیکن وہاں پہونچ کر بھی اس کی نظر کہیں اور لگی تھی، اسے شیرزاد کی تلاش تھی، اتنے میں شیرزاد دور سے آتا ہوا نظر آیا۔ گلشاد نے اپنے دو خواجہ سرا خالص اور مخلص

کو بھیجا کہ جاکر شیرزاد کو بلا لائیں۔

شیرزاد آیا تو اس نے دیکھا گلشاد چودھویں کے چاند کی طرح تخت پر جلوہ افروز ہے، گلشاد کو بھی یوں محسوس ہوا کہ اس کے پاس سورج اچانک جگمگا اٹھا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے، اور دیر تک راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد گلشاد شیرزاد کو لے کر اپنا محل دکھانے گئی، اور ایک حصّہ سے دوسرے حصہ میں گھماتی رہی، محل کی سیر ختم ہوئی تو محفل عیش و نوش کا اہتمام ہوا اور دونوں جام بکف داد عیش دیتے رہے۔

اب قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ باغ فردوس کا مالی گلشاد کا شیدائی تھا، اس نے جب شیرزاد کو محل میں عیش کرتے دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے فوراً جاکر فرخ بہزاد کو بیٹی کی رنگ رلیوں کی خبر دی۔ فرخ بہزاد نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ باغ فردوس جاکر اس نوجوان کو اسیر کر کے لائیں۔ سپاہی دھاوا بولتے ہوئے وہاں پہونچے، گلشاد نے انھیں دیکھا تو اس کی روح فنا ہوگئی، اس نے چاہا شیرزاد کو کہیں چھپا دے مگر شیرزاد نے کہا یہ کیا بزدلی ہے، ہتھیار لاؤ، میں ان کا مقابلہ کروں گا۔

چنانچہ شیرزاد تن تنہا فرخ بہزاد کے سپاہیوں پر پل پڑا اور ان میں سے بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ باقی فوجی بھاگ کر فرخ بہزاد کے پاس پہونچے اور اسے صورت حال سے مطلع کیا۔ فرخ بہزاد کو بہت پریشانی ہوئی۔ اس نے فارس بہرام کو بلا کر حکم دیا کہ ایک ہزار مسلح جوان فوراً باغ فردوس روانہ کئے جائیں۔ شیرزاد نے ان فوجیوں کے ساتھ بھی جنگ جاری رکھی اور ان میں سے کتنوں ہی کو خاک و خون میں ملا دیا۔ آخر کار چند سپاہیوں نے مل کر شیرزاد پر کمند ڈالی اور اسے پھندے میں لے لیا۔

ادھر خواجہ اسد کو یہ فکر ہوئی کہ شیرزاد اتنی دیر کا گیا ہوا ہے اور ابھی تک نہیں لوٹا چنانچہ

وہ تین سو مسلح سواروں کو لے کر اس کی تلاش میں نکلا۔ یہ لوگ باغ فردوس کے پاس پہونچے تو دیکھا شیرزاد کمند کے پھندے میں پھنسا ہوا دشمن کے ساتھ کھینچا تانی کر رہا ہے۔ خواجہ کے سپاہیوں نے ایک دم ہلا بول کر فرخ بہزاد کے آدمیوں کو مار بھگایا اور شیرزاد کو آزاد کیا۔ فرخ کے سپاہی بھاگے تو انھوں نے سیدھے شہر میں پہونچ کر دم لیا اور اندر سے فصیل کے دروازے بند کر لئے۔

خواجہ اسد گلشاد کے محل میں فروکش ہوا اور اس نے شہزادی کو بہت سارا لباس اور زر و جواہر بطور سوغات پیش کیا۔

فرخ بہزاد دوسری شکست سے اور بھی حواس باختہ ہوا۔ اس نے فارس بہرام کو صلح کا پیغام دے کر شیرزاد کے پاس بھیجا۔ خواجہ اسد نے فارس بہرام کو دیکھا تو اس سے پوچھا: تو اس لڑکے کو پہچانتا ہے؟

فارس بولا: یہ تیرا بیٹا ہوگا۔ خواجہ نے کہا یہ میرا نہیں گرگین بادشاہ کا بیٹا ہے۔ اس نے فارس کو سارا ماجرا سنایا اور وہ کاغذ اور جواہرات دکھائے جو شیرزاد کی گردن میں بندھے ہوئے تھے۔ فارس بہرام نے پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جا کر شیرزاد کے قدموں میں گر گیا۔ خواجہ اسد نے شیرزاد کو بھی صورت حال سے مطلع کر دیا۔

فارس بہرام نے واپس آکر فرخ بہزاد کو سارا واقعہ بتایا اور بولا شیرزاد نہ صرف تخت و تاج کا طالب ہے بلکہ وہ اپنی مقتول ماں کے خون کا بدلہ بھی چاہتا ہے۔ درباریوں کو پتہ چلا تو سب نے شیرزاد کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا۔ اب فرخ بہزاد نے سوچا صلاح یہی ہے کہ سلطنت شیرزاد کے حوالے کر دے۔ اس نے فارس بہرام، خواجہ اسد اور دوسرے لوگوں کو اپنا شفیع بنا کر بھیجا شیرزاد نے پہلے تو بیحد غصہ اور خفگی کا اظہار کیا مگر پھر راضی ہو گیا۔ چنانچہ شیرزاد کو اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر لایا گیا اور اس کی خدمت میں خزانے کی چابیاں پیش کی گئیں، اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

گلشاد نے اپنے علم نجوم کی رو سے ایک سعد وقت کا تعین کیا اور شیرزاد نے اسی گھڑی تخت شاہی پر جلوس کیا۔

تخت نشینی کے بعد شیرزاد نے عدل و انصاف کو فروغ دیا اور اس طرح رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا کہ لوگ اس کے لئے دل و جان سے دعائیں کرتے تھے، مگر کبھی کبھی اسے اپنی مقتول ماں کا خیال آتا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ اپنے غصّہ کو ضبط نہ کر سکا اور اس نے فرخ بہزاد کو قید میں ڈلوا ہی دیا۔ اس کے بعد شہر کا نظم و نسق خواجہ اسد کے حوالے کر کے خود کاخ نہ منظر میں چلا گیا اور وہاں برج قمر میں گلشاد کے ساتھ داد عیش دیتا رہا۔

شیرزاد نے ایک دن گلشاد سے کہا تجھے معلوم ہے کہ تیرے باپ نے میری ماں کا ناحق خون کیا ہے، اور شرع کی رو سے اس پر قصاص واجب ہے۔ گلشاد نے طالع دیکھا تو معلوم ہوا کہ نو دن تک اس کے باپ کا ستارہ گردش میں ہے، اگر یہ نو دن کسی طرح گذر جائیں تو پھر شاید اس پر آنچ نہ آئے۔ چنانچہ وہ شیرزاد سے بولی کہ ہم جس برج میں بیٹھے ہیں یہ برج قمر ہے، اس کا اثر جاسوسوں اور عیاروں پر ہوتا ہے، تجھے اختر عیار کی کہانی معلوم ہے جس نے بادشاہ کی لڑکی کو اغوا کیا تھا۔ پھر اس نے یہ کہانی شروع کی:

شاہ روم کے ایک لڑکی تھی ماہ منظر نام، اس کے حسن و جمال کا چرچا ہر طرف پھیلا ہوا تھا، اسی شہر میں اختر نام کا ایک عیار رہتا تھا، ایک روز شہزادی اپنی کنیزوں کے ساتھ محل کی چھت پر کھیل کود میں مصروف تھی کہ اختر نے بازار کی چھت سے اسے دیکھ لیا اور اس کے حسن و جمال سے اتنا مسحور ہوا کہ رات کو اس نے شاہی قصر پر کمند ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ چھت پر چڑھ گیا مگر محل میں نہیں اتر سکا۔ پاسبان بیدار تھے اور باری باری سے پہرہ دے رہے تھے۔ اختر نے کئی رات یہی عمل کیا مگر کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ آخر ایک روز معلوم ہوا

کہ شاہ تبریز کا لڑکا روم کی شہزادی سے منگنی کرنے آیا ہے۔ اس تقریب میں سارے شہر کو سجایا گیا اور ایک شاندار جشن کا اہتمام ہوا۔ سب لوگوں نے خوشی منائی یہاں تک کہ محل کے پاسبانوں نے بھی جام پہ جام چڑھائے اور مست ہو کر سو گئے۔ اختر عیار کو اسی موقع کی تلاش تھی، اس نے محل کے کنگرہ پر کمند پھینکی، اور اس کے اندر داخل ہو گیا۔ شہزادی نیند کی ماتی مسہری پر سو رہی تھی، اختر نے اسے بیہوشی کی دوا سنگھا دی، اور اسے اٹھا کر چل دیا۔ وہ ساری رات شہزادی کو اٹھائے چلتا رہا۔ صبح کو پہاڑ کے دامن میں پہونچا۔ وہاں ایک تاریک غار تھا، اختر نے شہزادی کو اس میں چھپا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شہزادی کو ہوش آیا تو دیکھا ایک اندھیرے کنوئیں میں پڑی ہے۔ ہر چند کنیزوں کو آواز دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اتنے میں اختر نے آگ روشن کی اور شہزادی کے سامنے آکر سلام کر کے بولا: میرا نام اختر عیار ہے، میں نے جس دن سے تجھے محل کی چھت پر دیکھا ہے تبھی سے تیرا عاشق ہوں، اب تو میرے قبضہ میں ہے۔ بس تجھ سے ایک ہی التجا ہے کہ مجھے بھی اپنے خدمتگزاروں میں شامل کر لے۔

شہزادی سب کچھ سمجھ گئی، اس نے سوچا اس مجبوری میں جھلانے سے کام نہیں بنے گا چنانچہ وہ مسکراتے ہوئے بولی: میں بھی اسی روز سے تیری دلدادہ ہوں۔ لیکن اب تک تجھ سے ملنے کی سعادت نہیں ملی تھی۔ اب جبکہ ہم لوگ آن ملے تو بہتر ہے اس غار سے کسی شہر میں چلیں اور وہاں ہنسی خوشی زندگی کے دن گذاریں۔

اختر کو شہزادی کی تجویز پسند آئی۔ اس نے کہا یونہی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ شہزادی ماہ منظر نے مردانہ لباس پہنا اور اختر عیار کے ساتھ شہر حلب کی اور چل دی۔ شہر کے پاس پہونچ کر وہ ایک کارواں سرائے میں رات بسر کرنے اترے۔ اختر نے کہا میں شہر جا کر کھانا لاتا ہوں، وہ

صبح سویرے شہر میں داخل ہوا۔ لیکن اس سے پہلی رات کو وہاں کے بادشاہ پر کسی انجان شخص نے حملہ کر دیا تھا اور بادشاہ کے جاسوس مجرم کی تلاش میں پھر رہے تھے، انھوں نے اختر عیار کو اجنبی پاکر پکڑ لیا۔ اتفاق سے ایک رومی بھی وہاں آگیا۔ اس نے کہا: میں اس شخص کو پہچانتا ہوں یہ اختر عیار ہے۔ شاہی جاسوس اختر کو پکڑ کر لے گئے اور اسے قید میں ڈال دیا۔

ادھر بادشاہ کی حالت خراب ہونے لگی تو اس نے وصیت کی کہ چونکہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے میری موت کے تین روز بعد لوگ شہر کے باہر جمع ہوں اور اس مجمع میں میرے تازی کتے کو چھوڑ دیں، کتا جس شخص کا دامن پکڑ لے وہی میرے تخت و تاج کا وارث ہوگا۔

ادھر شہزادی کارواں سرائے میں پڑی ہوئی اختر کا انتظار کرتی رہی، جب وہ نہیں پلٹا تو نکلی اور ٹہلتے ہوئے شہر کی طرف چلی۔ اس نے دیکھا میدان میں بہت سے لوگ جمع ہیں، وہ بھی مجمع میں پہونچی، لوگ درحقیقت وہاں اپنے مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اکٹھا ہوئے تھے جیسے ہی شہزادی وہاں جاکر کھڑی ہوئی کتے نے اس کا دامن پکڑ کر کھینچنا شروع کیا، لوگ شہزادی کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور اسے تخت شاہی پر بٹھایا۔ ماہ منظر خود بادشاہ کی بیٹی تھی، اسے سلطنت کے آداب معلوم تھے۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ حکم دیا کہ تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ اختر عیار بھی جیل سے رہا ہوا۔ وہ سیدھا کارواں سرائے پہونچا، لیکن وہاں شہزادی کو نہ پاکر اس کا دل بجھ گیا۔

ماہ منظر جب سے گھر سے غائب ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ بھی برابر اس کی تلاش میں مصروف تھے، اس کے منگیتر مہر آثار کو جب معلوم ہوا کہ ماہ منظر کے ساتھ اختر عیار بھی لاپتہ ہے تو وہ بھی اپنے سو غلاموں کے ساتھ تلاش میں نکلا، ایک دن اس نے جنگل میں ایک ہرن شکار کیا، دیکھا قریب ہی ایک درخت کے نیچے ایک گدڑی پوش فقیر بیٹھا ہے۔ شاہزادہ فقیر کے پاس آیا،

اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد ہرن کے گوشت کا کباب تیار کیا۔ شاہزادہ اور فقیر نے سیر ہو کر کھایا اور وہیں پڑ کر سو رہے۔ یہ فقیر وہی اختر عیار تھا، جب شہزادہ سو گیا تو اختر نے اس کی ناک میں بیہوشی کی دوا ٹپکا دی اور اس کا ہاتھ پیر باندھ کر وہیں ڈال دیا۔ خود شہزادے کا لباس پہن کر اور ہتھیار باندھ کر شاہی گھوڑے پر بیٹھ کر چل دیا۔ ادھر سے شہزادے کے غلام آرہے تھے، انھوں نے اپنے آقا کے گھوڑے کو دیکھا تو اختر کو پکڑ لیا۔ شہزادے کے ہاتھ پیر کھولے اور اختر کو دست بستہ لے کر حلب کی طرف چل دیے۔

اتفاق سے ماہ منظر اس دن سیر کو نکلی تھی، اس نے مہر آثار کو پہچان لیا۔ اپنے آدمیوں کو بھیج کر معلوم کیا تو پتہ چلا یہ لوگ کسی کھوئے ہوئے شخص کی تلاش کر رہے ہیں، ماہ منظر نے حکم دیا ان سب کو شاہی مہمان رکھا جائے، اور ان کی خوب خاطر تواضع کی جائے۔ اس کے بعد اختر عیار سے بولی کہ اپنی کہانی سچ سچ بیان کر۔ اختر نے ساری کتھا سنائی، تب ماہ منظر نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھائی، اور اپنی اصلیت ظاہر کی۔ اس کے بعد اس نے مہر آثار سے شادی کی اور حکم دیا کہ اختر عیار کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

گلشاد نے یہ داستان ختم کی تو شیرزاد نے اس دن فرخ بہزاد کے قتل کو ملتوی کر دیا اور پھر میاں بیوی عیش و نوش میں مصروف ہو گئے۔

اگلے دن گلشاد اور شیرزاد برج عطارد میں پہونچے شراب کا دور چلا تو شیرزاد کو پھر اپنی ماں کا قتل یاد آیا۔ اس نے حکم دیا کہ فرخ بہزاد کو لاکر محل کی چھت سے نیچے ڈال دیا جائے۔ گلشاد بولی یہ عطارد کا محل ہے، اس کا تعلق خطاط، شاعر اور رمال سے ہے، پھر اس نے ایک رمال کی داستان سنانی شروع کی۔

ایک رمال شاہ بلخ کی لڑکی کو علم رمل سکھاتا تھا، اس دوران میں وہ شہزادی پر

عاشق ہو گیا. لیکن جب اسے عشق میں مایوسی ہوئی تو وہ طوطے کا روپ اختیار کر کے شہزادی کے پاس پہونچ گیا۔ رات آتی تو طوطا جادو کر کے شہزادی کو سلا دیتا اور پھر اس کے جسم سے لذت اندوز ہوتا۔ شہزادی اس معما پر حیران تھی، اتنے میں اس کی شادی مرد کے شہزادے سے ہو گئی، لڑکی طوطے کو اپنے ساتھ لیتی گئی۔ لیکن اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے کس طرح ملے۔ اس کی دوشیزگی تو جاتی رہی تھی، آخر کار طوطے نے جادو ٹونا کر کے شہزادے کو نامرد بنا دیا۔ شہزادہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے ایک جادوگرنی کی پناہ لی۔ جادوگرنی نے کہا کہ سارا قصور اسی طوطے کا ہے چنانچہ وہ بلی کا روپ بنا کر آئی اور طوطے پر جھپٹ کر اس کی گردن الگ کر دی گردن کٹتے ہی طوطا وہی رمال بن گیا۔ شہزادی نے پہچان لیا۔ اب اس نے حقیقت سمجھی، رات کو شہزادہ اس کے پاس آیا تو شہزادی نے اسے خوب شراب پلا کر مست کر دیا اور پھر اس کے پاس اپنی شکل کی ایک کنیز بھیج دی تاکہ اس کا راز فاش نہ ہو۔

آخر کار اس دن بھی فرخ بہزاد کا قتل ملتوی ہو گیا۔

اگلے روز گلشاد اور شیرزاد زہرہ کے برج میں پہونچے۔ شیرزاد نے پھر فرخ بہزاد کے قتل کا حکم دیا۔ مگر گلشاد بولی یہ زہرہ کا برج ہے، یہاں عیش کرتے ہیں، خونریزی نہیں کرتے پھر اس نے ناہید کی داستان سنائی جو ابھی دوشیزہ تھی اور گانے بجانے میں لاجواب تھی، ایک رات ناہید کو پریاں اٹھا لے گئیں۔ وہ کچھ عرصہ تک غائب رہی، لوگ جب اس کی طرف سے مایوس ہو گئے تو اس کی موت کا سوگ منایا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ناہید واپس آ گئی، پریوں نے اسے دو قسم کا میوہ دیا تھا، ایک قسم کا میوہ کھانے سے مرد عورت ہو جاتا تھا اور دوسری طرح کا میوہ کھا کر عورت مرد ہو جاتی تھی۔

کچھ دن کے بعد ناہید کی شادی ہوئی، اس کا شوہر ایک شہزادہ تھا، وہ پہلے سے

ناہید پر عاشق تھا، ناہید نے ان میووں میں سے ایک خود کھا لیا اور دوسرا اپنے شوہر کو کھلا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خود تو مرد بن گئی اور شہزادہ عورت ہو گیا۔ عرصہ تک میاں بیوی اسی قلب ماہیت کے ساتھ زندگی گذارتے رہے۔ آخر ایک روز شہزادے نے خدا کے حضور میں دعا کی، رات کو وہ سویا تو خواب میں ایک فقیر کو دیکھا۔ انھوں نے شہزادے کو حقیقت حال سے مطلع کیا، صبح کو شہزادے نے فقیر کی بتائی ہوئی نشانی کے مطابق ایک میوہ خود کھا لیا اور دوسرا ناہید کو کھلا دیا اور اس طرح دوبارہ دونوں کی جنس تبدیل ہو گئی۔

شیرزاد کو کہانی پسند آئی، اس نے اس دن بھی فرخ بہزاد کا قتل ملتوی کر دیا۔

اگلے دن گلشاد اور شیرزاد نے برج آفتاب میں بسر کیا۔ شیرزاد نے پھر فرخ بہزاد کے قتل کی بات چھیڑی تو گلشاد بولی: نیشاپور میں ایک بادشاہ تھا، اس کا طالع سورج تھا ایک روز وہ شکار کے لئے گیا، اتفاق سے نوکروں سے بچھڑ گیا۔ چلتے چلتے اسے ایک کنواں نظر آیا بادشاہ نے پتھر اٹھا کر کنوئیں میں پھینکا، کنوئیں سے آواز آئی اور اچانک وہ کنوئیں کے اندر کھنچ گیا بادشاہ اب سفید دیو کے چنگل میں تھا، دیو نے بادشاہ کے تمام لباس اتار کر خود پہنے اور نیشاپور پہونچ کر تخت پر تصرف کر لیا۔

بادشاہ بیچارہ کنوئیں میں اسیر کیا کرتا، اس نے ادھر ادھر ٹہلنا شروع کیا۔ اتفاق سے اسے ایک گھر ملا جس کا دروازہ بند تھا، بادشاہ نے وہ دروازہ کھولا، اس کے بعد اور بھی کئی دروازے ملے۔ وہ سب کو کھولتا ہوا اندر ایک باغ میں پہونچا، جس کے درخت میووں سے لدے ہوئے تھے، باغ میں ایک محل تھا، بادشاہ محل میں پہونچا تو کیا دیکھتا ہے وہاں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی اسیر ہے، یہ شاہ جنات کی لڑکی تھی، بادشاہ کو اس لڑکی کی مدد سے ایک آئینہ ملا جس کی پشت پر طلسم تھا، اس نے طلسم کو مٹایا تو لڑکی زنجیر سے آزاد ہو گئی۔

آخر بادشاہ اور لڑکی دونوں کنویں سے باہر آئے۔ بادشاہ نیشاپور کی طرف چلا۔ اس نے شہر میں پہونچ کر اپنے وزیر کو سارا حال بتایا، وزیر پہلے تو بادشاہ کو نہیں پہچان سکا لیکن جب پوری بات سنی تو اسے یقین آگیا۔ وہ بادشاہ کو لے کر دیو کے سامنے پہونچا۔ اس کے سامنے وہی طلسمی آئینہ دکھایا تو دیو اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ لوگوں نے اسے جان سے مار دیا اور بادشاہ کو پھر تخت پر بٹھایا۔

آخر وہ رات بھی گذر گئی، اگلے دن گلشاد اور شیرزاد مریخ کے برج میں پہونچے اور عیش و نوش میں مصروف ہوئے۔ شیرزاد نے پھر فرخ بہزاد کے قتل کی بات نکالی مگر گلشاد نے ایک اور داستان سنا کر وہ رات بھی ٹال دی۔

اسی طرح گلشاد نے چار اور راتیں مشتری، زحل، ثوابت اور فلک افلاک کے برجوں میں گذاریں اور دلچسپ قصے سنا سنا کر اپنے باپ کے قتل کو ملتوی کراتی رہی۔ اگلے روز گلشاد نے دیکھا کہ اب اس کے باپ کا ستارہ گردش سے نکل آیا ہے تو اس نے خواجہ اسد اور دیگر ارکان دولت کو بلا کر کہا کہ وہ شیرزاد سے جا کر کہیں کہ اس کے باپ کا خون معاف کر دے۔ سب مل کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس سے بہزاد کی معافی کی درخواست کی۔ خواجہ اسد نے کہا گلشاد کی بھی یہی خواہش ہے۔

شیرزاد نے آخرکار فرخ بہزاد کا خون معاف کر دیا اور فارس بہرام کو حکم دیا کہ جا کر اسے قیدخانہ سے لے آئے، شیرزاد نے فرخ بہزاد کو دوبارہ اپنا وزیر بنا لیا۔

اس طرح کئی سال گذر گئے، شیرزاد عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتا رہا، ایک روز وہ امرا اور دوستوں کے ساتھ شکار کے لئے جا رہا تھا، کہ ایک شیر نے اچانک جھاڑیوں سے نکل کر اس پر حملہ کر دیا۔ شیرزاد تو شیروں میں پلا بڑھا تھا، وہ جھٹ گھوڑے سے

اترا اور شیر کے دونوں کان پکڑ کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ شیر شیرزاد کو لے کر جنگل کی طرف بھاگ گیا، نوکروں نے لاکھ ڈھونڈا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ سچ ہے جو شیرنی کا دودھ پیتا ہے ایک دن شیر کا لقمہ بن جاتا ہے۔

جب شیرزاد کے ملنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو درباریوں نے اس کا سوگ منایا۔ گلشاد پر قیامت ٹوٹ پڑی وہ دن رات اپنے شوہر کا ماتم کرتی تھی یہاں تک کہ ایک روز تنگ آکر محل کی چھت پر گئی کہ وہاں سے گر کر خودکشی کر لے۔ اتنے میں تیز آندھی آئی اور گلشاد کو اڑا کر لے گئی اور پھر پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گئی۔

'فارسی کی دلکش داستانیں'
اہلِ علم کی نظر میں

ڈاکٹر نورالحسن انصاری کی مترجمہ کتاب "فارسی کی دلکش داستانیں" اُردو کے ذخیرے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ کہنے کو تو ترجمہ ہے لیکن اگر اُسے مترجم کی ذاتی، دلکش تحریر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

یہ داستانیں، داستانوں کی حیثیت سے بھی ہمارے لیے دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں، لیکن ان کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ جہاں ہمیں ایران کی پُرانی تہذیب سے روشناس کرتی ہیں وہاں اِن سے فارسی اور اُردو ادب کے طلبہ کو تلمیحات کے سرچشموں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

فارسی اور عربی کے اساتذہ کو شاید ابھی تک یہ خبر نہیں ملی ہے کہ انگلستان جرمن اور فرانس کے مستشرقین نے عربی اور فارسی کے علم و ادب کو اپنی اپنی مادری زبان میں پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے عربی اور فارسی کے اساتذہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی کے علم و ادب کے اُن حصّوں کو، جو عالمی قدر و قیمت رکھتے ہیں، اپنی زبان، یعنی اُردو میں منتقل کریں۔

توقع ہے کہ ڈاکٹر نورالحسن انصاری، اِس مشورے کو قبول کریں گے اور فارسی اور اُردو کی جائز اور ضروری خدمت انجام دیں گے۔

پروفیسر خورشید الاسلام
صدر شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ایران کی ادیب ڈاکٹر زہرا خانلری نے " داستانہای دل انگیز ادبیات فارسی" کے نام سے ایک مجموعہ مرتّب کیا ہے جس میں ایسے سولہ قصّوں کو ضروری تفصیلات کے ساتھ لکھا ہے جن سے متعلق تلمیحات فارسی ادب میں بہ کثرت ملتی ہیں۔

فارسی زبان و ادب کے اثر سے ایسی اکثر تلیمحات اُردو ادب میں بھی بہ کثرت مستعمل ہیں اور اب یہاں کا احوال بھی ایران جیسا ہے کہ ان کی تفصیلات سے کم لوگ واقف ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اب اُردو کو ایسی تالیفات کی زیادہ ضرورت ہے۔

ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے فارسی کی اس دلچسپ کتاب کا "فارسی کی دلکش داستانیں" کے نام سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اصل فارسی کتاب میں نہایت سادہ و صاف زبان میں ایسے قصوں کی ضروری تفصیلات کو قلمبند کیا گیا ہے اور اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ تفصیلات کے باب میں نہ تو غیر ضروری باتیں شامل ہوں اور نہ اختصار کا یہ عالم ہو کہ ذہن کو تشنگی کا احساس ہو۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ " قصّہ پن" پوری طرح محفوظ رہا ہے اور اس سے دلچسپی کے وہ عناصر تابناک رہے ہیں جن کے بغیر داستانیں دلکشی سے محروم ہو سکتی ہیں (فارسی کی کتاب بھی پیشِ نظر ہے) یہ تو خوبی تھی ڈاکٹر زہرا خانلری کے کمال قصہ نگاری کی۔ اُردو کی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ سارے محاسن ترجمے میں بھی اسی طرح برقرار رہے ہیں۔ یہ کتاب داستانی عناصر کی نسبت سے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کی چیز ہے۔ بہ قول

ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری "یہ سبھی داستانیں اتنی دلکش، انوکھی اور لطائف وظرائف پر مشتمل ہیں کہ اگر اس کتاب کا مقصد صرف دل و دماغ کو بہلانا ہو، تو بھی اس سے بہتر مواد ملنا مشکل ہے۔"

توقع ہے کہ اُردو ادب کے طلبہ کے لیے یہ کتاب افادیت کا سروسامان فراہم کرے گی اور عام پڑھنے والے بھی ان قصّوں کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ دلچسپی کے ساتھ ساتھ معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

رشید حسن خاں
(رسالہ تحریک۔ دہلی)

"فارسی کی دلکش داستانیں" ایران کی مشہور ادیبہ ڈاکٹر زہرا خانلری (کیا) کی فارسی کتاب" داستانہای دل انگیز ادبیات فارسی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب سے ڈاکٹر زہرا خانلری کا مقصد یہ تھا کہ ایک ہزار سالہ دَور پر محیط فارسی ادب کی دلکش داستانوں کو اس طرح ملخص کرکے آج کی نثر میں پیش کردیں کہ موجودہ ایرانی نسل بھی ان سے پوری طرح حظ و لطف حاصل کرسکے اور وہ اپنے اجداد کے سرمایۂ جاودانی سے ناواقف نہ رہے۔

زیرِ نظر کتاب میں فردوسی، نظامی، عطار، فیضی اور بعض نسبتہً غیر معروف شعراء و ادبا، کی منظوم و منثور داستانوں کی تلخیص کرتے ہوئے منظوم داستانوں میں جگہ جگہ پر اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے اس کتاب کی دلچسپی اور افادیت دوبالا

ہوگئی ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر انصاری کے ترجمے کا سوال ہے، بلا شک وشبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا ترجمہ بڑا رواں، سادہ اور سلیس ہے۔ اشعار کے ترجموں میں انھوں نے کمال ہوشمندی سے بعض بعض جگہوں پر لفظی ترجمے سے گریز کرتے ہوئے مرادی ترجمہ کیا ہے جس کی وجہ سے شاعر کا مفہوم ومقصد اُردو کے قارئین کے لیے آئینہ ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

وہ حضرات جو فارسی ادب سے ناواقف ہیں ان کو اس کتاب بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اس ادب کی رنگینیوں، رعنائیوں کی بلند پروازیوں سے آشنا ہوسکیں جس نے غیر محسوس اور محسوس دونوں ان کے ادب کو ہر دَور اور ہر زمانے میں متاثر کیا ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

(رسالہ جامعہ۔ نئی دہلی)

ہوگئی ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر انصاری کے ترجمے کا سوال ہے، بلا شک وشبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کا ترجمہ بڑا رواں، سادہ اور سلیس ہے۔ اشعار کے ترجموں میں انھوں نے کمال ہوشمندی سے بعض بعض جگہوں پر لفظی ترجمے سے گریز کرتے ہوئے مرادی ترجمہ کیا ہے جس کی وجہ سے شاعر کا مفہوم ومقصد اُردو کے قارئین کے لیے آئینہ ہوکر سامنے آجاتا ہے۔

وہ حضرات جو فارسی ادب سے ناواقف ہیں ان کو اس کتاب [illegible] بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اس ادب کی رنگینیوں، رعنائیوں [illegible] کی بلند پروازیوں سے آشنا ہوسکیں جس نے غیر محسوس اور محسوس دونوں [illegible] ان کے ادب کو ہر دَور اور ہر زمانے میں متاثر کیا ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

(رسالہ جامعہ. نئی دہلی)



ڈاکٹر زہرا خانلری (کیا) فارسی زبان وادب میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد کئی سال تک ہائر سیکنڈری اسکول کی پرنسپل رہیں۔ اس کے بعد وہ تہران یونیورسٹی میں پہلے ریڈر اور بعد میں پروفیسر کے [illegible] پر فائز ہوئیں۔

ڈاکٹر زہرا خانلری عرصہ سے ایران کے ادبی رسائل، خصوصًا ماہنامہ سخن میں لکھ رہی ہیں۔ ایران کے نقادوں نے ان کے ادبی مقالوں اور ترجموں کو ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر زہرا خانلری کی کہانیاں جدید فارسی افسانے میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔

۱- پروین وپرویز (افسانہ)
۲- ژالہ یا رہبر دوشیزگان (افسانہ)
۳- رہنمای ادبیات فارسی
۴- داستانہای دل انگیز ادبیات فارسی
۵- نمونۂ غزل فارسی
۶- داستان حسنک وزیر (تاریخ بیہقی سے)
۷- برگزیدۂ قابوس نامہ (قدیم ترین نسخہ پر مبنی)
۸- کتابہای [illegible] سی و دستور
۹- افسانۂ سیمرغ (منطق [illegible])

ترجمے:

۱۰- شبہای روشن (داستایوفسکی)
۱۱- رنجہای جوانی ولتر (آندرہ موروا)
۱۲- بیست داستان (پیراندللو ۱۹۳۴ء کا نوبل انعام یافتہ)
۱۳- آقای رئیس جمہور (میگل انجل استوریاس ۱۹۶۷ء کا نوبل انعام یافتہ)
۱۴- دنیای خیال (آندرہ موروا)
۱۵- توروتومبو (میگل انجل استوریاس)

ALLIED PUBLISHERS PRIVATE LIMITED
BOMBAY NEW DELHI CALCUTTA MADRAS BANGALORE